جولائی - اکتوبر ۱۹۳۹ء

اُردُو

جلد ۱۹	جولائی سنہ ۱۹۳۹ء	نمبر ۷۵

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)

کا

سہ ماہی رسالہ

مقام اشاعت:۔ دہلی

رشید احمد ایم۔اے نے لطیفی پریس دہلی میں چھپوا کر
انجمن ترقیٔ اردو (ہند) دہلی سے شایع کیا۔

اُردُو

جولائی سنہ ۱۹۳۹ ؁ء

فہرستِ مضامین

مقدمۂ

بنیادی ہندستانی

از

(پروفیسر محمد اجمل خاں۔ ایم۔اے)

کچھ دنوں سے انگلستان میں یہ خیال زور پکڑ رہا ہے کہ انگریزی زبان کو انٹرنیشنل (بین‌المللی) زبان بنا دیا جائے۔ انگریزی کے حامیوں کا یہ قول ہے کہ یہ زبان پچاس کرور انسانوں کے ملکوں کی حکومت کی زبان ہے اس لیے اس زبان کا عالمگیر ہونا بہت آسان ہے۔ اس خیال کو سامنے رکھ کر انہوں نے اپنی گرامر کے قواعد کو صرف پانچ قاعدوں میں جکڑ دیا ہے اور بنیادی (Basic) الفاظ کی تعداد ساڑھے آٹھ سو مقرر کردی ہے۔ بہت سی کتابیں اس زبان میں ترجمہ اور تالیف ہو رہی ہیں لیکن ان کی یہ کوشش سرسبز ہوتی نظر نہیں آتی اس لیے کہ الفاظ کی مقررہ تعداد سے روزمرہ کا کام تو چل جاتا ہے لیکن ادبی اور علمی (Literary and Scientific) مضامین کے لیے نارمل (Normal) انگریزی کے بغیر چارہ نہیں اور وہ مجبور ہیں کہ زیادہ الفاظ استعمال کریں۔

اس چیز کو دیکھ کر ہندستان کے بعض حضرات کو یہ خیال ہوا کہ ہم کو ایک نیشن (ملّت) بننے کے لیے ایک زبان کی ضرورت ہے اور چونکہ سب کو ملانے والی زبان ہندستانی ہی ہوسکتی ہے لہذا کوئی خدا کا بندہ انگریزی کی طرح بنیادی ہندستانی پر کتابیں لکھ دیتا تو ہماری زبان تو ایک ہوسکتی۔ اس قسم کا خیال دو سال ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے مجھ سے بھی ظاہر فرمایا۔ میں نے آل انڈیا کانگرس

کمیٹی نے کتب خانہ میں بیسک انگلش (Basic English) کی کتابوں کو دیکھا اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کچھ مواد بھی جمع کرلیا لیکن جب میں نے اپنی کوششوں پر نظر ثانی کی تو معلوم ہوا کہ بنیادی ہندستانی کا کام مجھ سے بہت پہلے ہوچکا ہے اور یہ اس وقت ہوا ہے جب کہ انگریزوں نے مدنیت کے ابتدائی زینہ پر قدم رکھا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان ایک براعظم ہے۔ آریوں کے ہندستان میں آنے سے پہلے یہاں ایک عظیم‌الشان تمدن تھا۔ شمالی ہند میں جو نئے آثار برآمد ہوئے ہیں خصوصاً سندھ میں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہاں کا تمدن مصر و بابل و خالدیہ کے تمدن سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ جنوبی ہند کا ایک طرف عرب کے مذہب و تمدن سے بنیادی طور پر اتحاد تھا۔ دوسری طرف ان کی نسلی کیفیتیں سماٹرا، جاوا اور آسٹریلیا تک ایک قسم کی یکسانیت ظاہر کرتی ہیں۔

آریہ آئے اور اپنے نئے جوش و خروش کے ساتھ سنٹرل ایشیا اور ایران کا مذہب، زبان اور تمدن بھی لائے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم آریوں میں آپس میں مذہب کے نام پر اتنی خانہ جنگی ہوئی تھی کہ ایک ہی مذہب کو دو گروہوں نے مختلف طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی حتی کہ (شاید ایک دوسرے کی ضد میں) ایک جماعت کے مقبول دیوتا دوسری جماعت کے مردود شیطان قرار پاگئے۔ لڑائی اس حد تک بڑھی کہ آریوں کی ایک جماعت "دیو" کے معنی "قابل احترام و پرستش ہستی" ماننے لگی اور ان کے خلاف ایرانی "دیو" کو "اہرمن یا شیطان" قرار دینے لگے۔ اصلی مذہب کیا تھا اور کس جماعت نے یہ انقلاب بپا کیا؟ اس سوال کا جواب صرف اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ "دیو" اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ قدیم لاطینی و یونانی زبانوں میں بھی ذی‌اس (Zeus) دئی (Dei) یا ڈیٹی (Deity) کے الفاظ پائے جاتے ہیں جو بس اتنا ظاہر کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ جو آریہ اپنے وطن سے نکالے گئے وہ "دیو" ہی کے لفظ کو کسی "اچھی ہستی" کے لیے استعمال کرتے تھے اور مقامی طور پر جو انقلاب ہوا اس نے قدیم مذہب کو پاش پاش کردیا۔

بہر حال ہندستان میں آریہ آئے اور یہاں کے سیاہ فام باشندوں کو چنڈال اور دشمن قرار دینے پر مجبور ہوئے ۔ اس دشمنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفتوح اقوام کو جملہ مدنی حقوق اور سوشل تعلقات سے دور کردیا گیا ۔ لیکن جب انھیں خادموں کے درجہ پر رکھا تو مجبوراً آریہ بھی ان ھی کی زبانوں میں بات چیت کرنے لگے اور اس طرح نہ صرف وہ خود اپنے مذہب اور فلسفہ سے محروم ہوگئے بلکہ سنسکرت زبان بھی عام زبان نہ بن سکی ، صرف آریوں کی آپس کی بول چال اور دربار تک محدود رہی ۔ سنسکرت لٹریچر میں جو کچھ بھی سرمایہ تھا وہ جمود کی حالت میں برہمنوں تک محدود رہا اور رفتہ رفتہ ملکی بولیوں نے راج دربار پر بھی قبضہ کرلیا حتٰی کہ گوتم بدھ کی انقلابی تحریک نے یونیورسٹیوں تک سے سنسکرت کو نکال دیا اور لطف یہ ہے کہ برھمنوں کی مقدس مگر قدامت پسند اور غیر متحرک جماعت سنسکرت زبان کی واحد ٹھیکہ دار ہونے پر خوش تھی اس لیے کہ صرف اسی طریقہ سے وہ راجا سے پرجا تک اپنا راج قایم رکھ سکتی تھی ۔

آریوں کے بعد سکندر کے حملہ سے پہلے عرب و مصر سے ہندستانیوں کے اچھے خاصے تعلقات تھے اور سمندر کے کنارے والوں کی زبان اور تمدن پر آپس کے میل جول سے خاصا اثر پڑچکا تھا ۔ سکندر آیا تو نئے قسم کی طرز جنگ اور فلسفیانہ اور معاشری خیالات کا تبادلہ ہوا تجارت کی نئی نئی راہیں کھلیں اور جو یونانی ہندستان میں آباد ہوئے وہ برھمن قرار پائے اور یہیں کے ہورہے ۔

اگرچہ اسلام سے پہلے ہندستان کے مغربی ساحل پر عربوں کی اور عرب میں ہندوؤں کی جماعتیں آنے جانے رہنے سہنے لگی تھیں لکن اس آمدورفت کا اثر مذہب پر بہت کم پڑا تھا ۔ جنوبی ہندستان والے شیو کی پوجا کرتے تھے اور عرب کے بعض مشہور بت خانوں میں شیو کے قسم کے بتوں کی پوجا کرنے جایا کرتے تھے ۔ پوجا کے بعد جانوروں کو بھینٹ چڑھانا ، سر منڈانا اور نہانا جس طرح ہندستان میں رائج تھا اسی طرح عرب میں بھی تھا ۔ لہذا مذھب کے نام پر ان تجارتی اقوام میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی ۔ اصل تو یہ ہے کہ اس زمانے کے تاجر جاتری ،

زائر اور سیاح جیسا دیس ہوتا تھا ویسا ہی بھیس بنا لیتے تھے، جہاں جاتے تھے وہاں کے دیوتاؤں اور خداؤں کی پوجا کرلیتے تھے اور ہندستان والے تو اس قدر سادہ مزاج اور فطرت‌پرست واقع ہوتے تھے کہ قدرت کی ہر ایک صنعت ان کے دلوں میں خوف و احترام کے جذبات کے ذریعہ سے سر تسلیم خم کرا دیتی تھی۔

ہندستان میں مسلمان آئے تو یہیں کے ہو رہے اور ہندستان والوں نے بھی نہایت فراخدلی سے مسلمانوں کے مذہب اور تمدن سے فائدہ حاصل کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ صوبہ سرحد، کشمیر، پنجاب، ملتان اور سندھ میں اسلامی تمدن و مذہب رائج ہوگیا ۔ مسلمانوں نے بھی ہندستان کی مقامی بولیوں کو فروغ دینا شروع کیا اور پشتو، سندھی، پنجابی، اودھی، گجراتی، برج بھاکھا اور بنگالی میں جو لٹریچر تیار کیا وہ اب تک ان زبانوں کے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے لیکن مسلمان سنسکرت کو دوبارہ زندہ نہ کرسکے ۔ جن لوگوں نے اسے سیکھنا بھی چاہا انہیں ہندو بن کر دشی کے پنڈتوں کی خدمت کرنی پڑی اور بڑی بڑی مشکلوں سے ویدوں اپنشدوں اور شاستروں کے رازوں پر آگہی حاصل ہوسکی۔ اپنشد، رامائن، مہابھارت، گیتا، جوتش کی بعض کتابیں اور آیورویدک کے کچھ اصول فارسی اور مقامی بولیوں میں مسلمانوں نے ہی ترجمہ کیے اور اکثر و بیشتر ترجمہ کے وہی اصول قائم رکھے جو بنوعباس کے زمانے میں منضبط ہوچکے تھے یعنی بجائے ترجمہ کے اصل الفاظ کو معرب کرلیا جاتا تھا ۔ مثلاً (Canon) کو قانون، (Clime) کو اقلیم (Geography) کو جغرافیہ (یا علم‌المسالک و الممالک)، (Organon) کو ارغنون بنا لیتے تھے اور کہیں کہیں لفظی ترجمہ بھی کردیتے تھے۔

غرض کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں ہندستان کی بہت سی ملکی بولیاں ترقی کرکے زبانوں کے درجہ تک پہنچ گئیں اور مختلف صوبوں کی دفتری زبان فارسی قرار پائی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملک کے عام باشندوں میں وہ اصطلاحیں رائج ہوگئیں جو ایران اور آریہ قوم سے زیادہ تعلق رکھتی تھیں اور جن کے لیے مقامی بولیوں میں لفظ موجود نہ تھے۔ ایسے الفاظ کا تعلق زیادہ‌تر ان تمدنی اور

معاشری ضروریات سے تھا جن کا وجود یا تو ہندستان میں تھا ہی نہیں یا تھا بھی تو ان کا معیار بہت پست تھا اور نئی ضروریات اور خیالات کے اظہار کے لیے ناکافی تھا۔

مثال کے طور پر ہم ان چیزوں کو جانچیں جو ہندستان میں پست حالت میں تھیں تو بہت سے غیر ملکی الفاظ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ انسان کے لیے ضروریات زندگی میں سے تین چیزیں سب سے پیش پیش ہیں۔ لباس، خوراک اور مکان۔ لباس کے لیے سنسکرت میں سوائے کپڑے کے اور کوئی لفظ نہیں ملتا اور ہو بھی کیوں؟ ہندستان کی آب و ہوا میں زیادہ‌تر ایسا موسم رہتا ہے کہ جبہ و دستار کی ضرورت ہوتی ہی نہیں، ایک دھوتی بھی اکثر بار ہوتی ہے بلکہ لنگوٹی ہی کافی ہوتی ہے۔ اسی لیے قدیم ہندستانی تمدن کی یادگار اب تک اوڑیسہ، آسام، وسط و جنوبی ہند میں باقی ہے اور مردوزن بعض اوقات گھاس، پتوں اور کھال سے ستر پوشی کرلیتے ہیں اور اکثر بالکل نیچرل حالت میں نظر آتے ہیں۔ اسی کو ایک شاعر نے اس پیرایہ میں ادا کیا ہے:—

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا

اگلے وقتوں کا متمدن لباس ایک یا دو چادریں ہوتی تھیں۔ روما میں اسے ٹوگا، ایران میں جامہ، عرب میں مِئزر، بُرد، ثوب وغیرہ اور ہندستان میں دھوتی کہتے تھے۔ اُمرا لمبی لمبی چادریں اوڑھنا دولت‌مندی کی علامت سمجھتے تھے اور عرب میں تو یہ بات باعث افتخار سمجھی جاتی تھی کہ چادر اتنی لمبی ہے کہ وہ زمین پر خط بناتی چلتی ہے۔ اسی طرز عمل سے نفرت کے اظہار کے طور پر ایک شاعر کہتا ہے:—

لَیسَ الجمالُ بمِئزرٍ و اِن رُدِّیتَ بردًا
اِنّ الجَمالَ محاسن و معادنٌ اورثن مجدا

(یعنی مئزر پر ایک اور ردا اوڑھ لینا حسن کو نہیں بڑھاتا، حقیقی حسن تو محاسن اخلاق کو کہتے ہیں) اسی طرح ہندستان و ایران اور مصر و روما کے جتنے پرانے مجسّمے نظر آتے ہیں سب میں بغیر سلے ہوئے کپڑوں کا استعمال ہے اور ہندستان میں یہ چیز

زائر اور سیاح جیسا دیس ہوتا تھا ویسا ہی بھیس بنا لیتے تھے، جہاں جاتے تھے وہاں کے دیوتاؤں اور خداؤں کی پوجا کرلیتے تھے اور ہندستان والے تو اس قدر سادہ مزاج اور فطرت‌پرست واقع ہوتے تھے کہ قدرت کی ہر ایک صنعت ان کے دلوں میں خوف و احترام کے جذبات کے ذریعہ سے سر تسلیم خم کرا دیتی تھی۔

ہندستان میں مسلمان آئے تو یہیں کے ہو رہے اور ہندستان والوں نے بھی نہایت فراخدلی سے مسلمانوں کے مذہب اور تمدن سے فائدہ حاصل کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ صوبہ سرحد، کشمیر، پنجاب، ملتان اور سندھ میں اسلامی تمدن و مذہب رائج ہوگیا۔ مسلمانوں نے بھی ہندستان کی مقامی بولیوں کو فروغ دینا شروع کیا اور پشتو، سندھی، پنجابی، اودھی، گجراتی، برج بھاکھا اور بنگالی میں جو لٹریچر تیار کیا وہ اب تک ان زبانوں کے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے لیکن مسلمان سنسکرت کو دوبارہ زندہ نہ کرسکے۔ جن لوگوں نے اسے سیکھنا بھی چاہا انہیں ہندو بن کر کاشی کے پنڈتوں کی خدمت کرنی پڑی اور بڑی بڑی مشکلوں سے ویدوں اپنشدوں اور شاستروں کے رازوں پر آگہی حاصل ہوسکی۔ اپنشد، رامائن، مہابھارت، گیتا، نجوم کی بعض کتابیں اور ایورویدک کے کچھ اصول فارسی اور مقامی بولیوں میں مسلمانوں نے ہی ترجمہ کیے اور اکثر و بیشتر ترجمہ کے وہی اصول قائم رکھے جو بنوعباس کے زمانے میں منضبط ہوچکے تھے یعنی بجائے ترجمہ کے اصل الفاظ کو معرب کرلیا جاتا تھا۔ مثلاً (Canon) کو قانون، (Clime) کو اقلیم (Geography) کو جغرافیہ (یا علم‌المسالک و الممالک)، (Organon) کو ارغنون بنا لیتے تھے اور کہیں کہیں لفظی ترجمہ بھی کردیتے تھے۔

غرض کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں ہندستان کی بہت سی ملکی بولیاں ترقی کرکے زبانوں کے درجہ تک پہنچ گئیں اور مختلف صوبوں کی دفتری زبان فارسی قرار پائی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملک کے عام باشندوں میں وہ اصطلاحیں رائج ہوگئیں جو ایران اور آریہ قوم سے زیادہ تعلق رکھتی تھیں اور جن کے لیے مقامی بولیوں میں لفظ موجود نہ تھے۔ ایسے الفاظ کا تعلق زیادہ‌تر ان تمدنی اور

معاشری ضروریات سے تھا جن کا وجود یا تو ہندستان میں تھا ہی نہیں یا تھا بھی تو ان کا معیار بہت پست تھا اور نئی ضروریات اور خیالات کے اظہار کے لیے ناکافی تھا۔

مثال کے طور پر ہم ان چیزوں کو جانچیں جو ہندستان میں پست حالت میں تھیں تو بہت سے غیر ملکی الفاظ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ انسان کے لیے ضروریات زندگی میں سے تین چیزیں سب سے پیش پیش ہیں۔ لباس، خوراک اور مکان۔ لباس کے لیے سنسکرت میں سوائے کپڑے کے اور کوئی لفظ نہیں ملتا اور وہ بھی کیوں؟ ہندستان کی آب و ہوا میں زیادہ‌تر ایسا موسم رہتا ہے کہ جبہ و دستار کی ضرورت ہوتی ہی نہیں، ایک دھوتی بھی اکثر بار ہوتی ہے بلکہ لنگوٹی ہی کافی ہوتی ہے۔ اسی لیے قدیم ہندستانی تمدن کی یادگار اب تک اوڑیسہ، آسام، وسط و جنوبی ہند میں باقی ہے اور مردوزن بعض اوقات گھاس، پتوں اور کھال سے ستر‌پوشی کرلیتے ہیں اور اکثر بالکل نیچرل حالت میں نظر آتے ہیں۔ اسی کو ایک شاعر نے اس پیرایہ میں ادا کیا ہے:-

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا

اگلے وقتوں کا متمدن لباس ایک یا دو چادریں ہوتی تھیں۔ روما میں اسے ٹوگا، ایران میں جامہ، عرب میں مِئزر، بُرد، ثوب وغیرہ اور ہندستان میں دھوتی کہتے تھے۔ اُمرا لمبی لمبی چادریں اوڑھنا دولت‌مندی کی علامت سمجھتے تھے اور عرب میں تو یہ بات باعث افتخار سمجھی جاتی تھی کہ چادر اتنی لمبی ہے کہ وہ زمین پر خط بناتی چلتی ہے۔ اسی طرز عمل سے نفرت کے اظہار کے طور پر ایک شاعر کہتا ہے:-

لَیسَ الجمالُ بمِئزرٍ و اِن رُدِّیت بردا
اِنّ الجَمال محاسن و معادنٌ اورثن مجدا

(یعنی مئزر پر ایک اور ردا اوڑھ لینا حسن کو نہیں بڑھاتا، حقیقی حسن تو محاسن اخلاق کو کہتے ہیں) اسی طرح ہندستان و ایران اور مصر و روما کے جتنے پرانے مجسّمے نظر آتے ہیں سب میں بغیر سلے ہوئے کپڑوں کا استعمال ہے اور ہندستان میں یہ چیز

مردوں کے لیے، خصوصاً راجاؤں اور امرا کے لیے باعث افتخار سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جہاں کہیں عورتوں کے مجسمے یا تصویریں ہیں مثلاً بودھ گیا یا اجنتا و ایلورا وغیرہ میں، وہاں یہ چیز نمایاں ہے کہ ستر پوشی سے بعض اعضا مستثنے ہیں۔

کپڑوں کی تراش خراش مسلمانوں کے عہد میں شروع ہوئی۔ جہاں جہاں اسلام گیا، حتٰی کہ افریقہ کے وحشیوں تک کو اس نے ستر پوشی کا ایک نیا نظریہ بتایا۔ جاوا اور سماترا میں ننگی قومیں اب تک ہیں لیکن وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اسی طرح جو لوگ دربار سے زیادہ قریب ہوئے وہ کپڑوں کو کاٹ چھانٹ کر نئی نئی ترکیبوں سے استعمال کرنا سیکھ گئے۔ خطاب کے ساتھ ہفت پارچہ خلعت کے دستور نے کپڑوں کی اہمیت کو اور بڑھا دیا اور راجا کی دیکھا دیکھی پرجا نے بھی کپڑوں کی صنعت کی ہمت افزائی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک ہندستان کے کسی خطے میں جائیے جو الفاظ کپڑوں کے لیے ہیں وہ سب ایران و توران کے ہیں حتٰی کہ یورپ سے جو نئے قسم کے لباس یہاں آئے ان میں بھی اکثر مشرقی الاصل ہیں مثلاً پاجامہ (Pyjamas)، قمیص (Chemise)، فرغل (Frock)، سربند (Turban) وغیرہ۔

خوراک اور غذا کے سلسلہ میں سنسکرت میں روٹی تک کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے، اسے گیہوں سے بنی ہوئی غذا کہتے تھے۔ مختلف صوبوں میں اس کے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ اب تک ہندستان کے دیہاتوں میں کھانے کی عام استعمال کی چیز بھنا ہوا غلہ ہے۔ چونکہ کچی اور پکی غذا کا تعلق ہندو دھرم سے ہے اس لیے کسی ایسی غذا کا نام پرانی زبانوں میں نہیں پایا جاتا جو چھوت چھات کے اثرات سے خالی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی صنعت کا بھی اس میں دخل ہو۔ ہندستان کے علاوہ روٹی ہر جگہ تنور میں پکتی ہے اور نانبائی، حلوائی، کبابچی، قہوہ فروش وغیرہ کا تخیل ہی ایسی اقوام سے وابستہ ہے جن میں چھوت چھات نہ ہو۔ ہندو سوسائٹی نے انفرادیت کو اپنے کلچر کا تمغۂ افتخار سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوبیاں جو جماعتی زندگی کا جزولاینفک ہیں ان کی جماعت میں نہ داخل ہوسکیں اور اب بھی کلکتہ، بمبئی یا بعض دوسرے شہروں میں شدہ بھوجن کی دکانیں نظر

آتی ہیں وہاں «اونچی» ذات والے ہندو نظر نہیں آتے۔ جب اس بیسویں صدی میں ہندستانی اقوام کے تمدن کا افراد پر اتنا گہرا اثر ہے تو کس طرح باور کیا جاسکتا ہے کہ کوئی تحریک جو مشترک تمدن یا اجتماعی ترقی کی بنیادوں پر قایم کی جائے اس کی مخالفت نہ ہوگی۔ اگر علانیہ نہیں، قولاً نہیں تو خفیہ اور فعلاً ایسی چیزیں ہمیشہ ہمارے سامنے آتی رہیں گی جو «برہمن ذاتی» نے اپنے مفاد کے لیے ہزاروں سال پہلے بنائی تھیں اور مذہب کے نام پر، لیکن حقیقت میں ایک چھوٹی سی مذہبی جماعت کے مفاد کے لیے ابد تک قائم رکھنے کی کوشش جاری رہے گی۔

بہر حال تیسری بنیادی چیز جس کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے وہ مکان ہے۔ ہندستان میں جن تعمیروں پر سب سے زیادہ روپیہ خرچ ہوا وہ ہندوؤں اور بودھوں کے «مندر» اور «وہار» (بہار) ہیں۔ جنوبی ہند میں جو عمارتیں غاروں اور پہاڑوں کو کھود کر بنائی گئیں ان کا مذہب ہی سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ان سب میں جہاں جہاں برہمنزم کا اثر ہے وہاں ہر جگہ انفرادی عبادت ہے اور متشائم فلسفہ کی بنا پر دنیا اور دنیا کی چیزوں کو مایا اور ہیچ سمجھ کر ان سے نفرت ہی کا اظہار حاصل عبادت ہے۔ گوتم بدھ نے بھی اسی جنجال سے نکلنے کی کوشش میں ایک بلند پایہ فلسفہ کی بنیاد رکھ دی۔ اس کے بعد سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ ہندستان کے مہربان اور فرحت بخش موسم سے پورا فایدہ نہ اٹھایا جائے۔ راجا نے قلعے بنائے لیکن اس کا مقصد بھی چوتھے آشرم یعنی بڑھاپے میں سنیاس لینا تھا۔ پرجا نے مندر کھڑے کیے لیکن وہ بھی دنیا کو چھوڑنے پر تیار۔ بس اس زندگی کو قیدخانہ سمجھ کر صرف اتنی کوشش پر قناعت کی گئی کہ بارش سے ایک چھپر بچالے اور دھوپ سے آم یا املی کا درخت۔ فن تعمیر کو بحیثیت فن کے جب ہی ترقی ممکن تھی کہ یہاں کے باشندوں کا نظریہ حیات ہی ایسا ہوتا جو جماعتی زندگی، جماعتی نشوونما، جماعتی بقا و دوام کے تخیل کو سامنے رکھتا اور افراد کی زندگی کے مختلف حصے مقرر نہ ہوتے، بلکہ عملی دنیا کے اٹل قوانین کے مطابق ہر شخص جماعت کے فائدے کے لیے چاہتا تو برہمچاری رہتا، گرہست ہوجاتا یا تمام عمر سنیاسی ہی بنارہتا۔

مسلمانوں کی آمد نے اس نظریہ کو بھی بدلا اور جماعت کو سامنے رکھ کر فن تعمیر نے ہندستان کے آرکی ٹکچر (Architecture) میں ایک انقلاب بپا کردیا۔ محل سرا اور دیوان خانہ عام ضروریات زندگی میں داخل ہوگیا، مسجدوں نے عبادت کا جماعتی خیال پیش کیا۔ ہندوؤں کی ایک جماعت کبیرپنتھی اور سکھ کے نام اختیار کرکے اسلام سے قریب آگئی۔ ان کے گردواروں میں جماعتی عبادت ہونے لگی اور خانقاہوں اور مدرسوں کے لنگر نے اس نئی جماعت کو مشترک طور پر کھانا پکانا اور انکر جری کرنا سکھایا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ مغل فن تعمیر ہندستان کے طول عرض میں پھیل گیا اور کوئی گاؤں بھی اس سے محروم نہ رہا۔ مسجد ہو یا مندر، پل ہو یا سرائے ہرجگہ مغل محراب اور مغل گنبد نظر آنے لگے۔ عام زندگی میں حمام و باغ و چمن جزو عمارت بن گئے۔ نہریں اور فوارے مسجدوں اور مدرسوں کی شان بڑھانے لگے اور تعمیرات میں حسن و جمال کو شوکت و شکوہ کے ساتھ اس طرح ملایا گیا کہ اس کی افادیت میں ذرا بھی فرق نہ آیا اور افراد کی بجائے جماعت کو اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔

یہاں لباس، خوراک اور مکانوں کی قسمیں لکھنے کی گنجایش نہیں لیکن ان میں سے جتنی قسمیں ہیں وہ سب اور اگر سب نہیں تو ۹۹ فی‌صدی غیر ہندستانی ہیں۔ ان میں سے اکثر ایرانی، تاتاری اور ترکی تمدن کی یاد دلاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی آمد کا ذریعہ مسلمان ہوئے لیکن اس تمدن کو ہندستان کے باشندوں نے ہندستان ہی کے روپیہ سے ہندستان ہی کے صنّاعوں اور مزدوروں کی محنت سے ترقی دی۔ مسلمانوں کا اگر یہ خیال ہو کہ اسلامی تمدن کسی خاص طرز لباس و خوراک و مکان سے وابستہ ہے تو قطعی غلط ہے۔ ان چیزوں کا تعلق زیادہ‌تر مقامی آب و ہوا اور جغرافیائی حالات سے نشوونما پاتا ہے۔ جو لوازم تمدن ہندستان میں ہیں وہ اسلام کے منبع یعنی عرب میں موجود نہیں۔ نہ وہاں شیروانی ہے نہ پگڑی، نہ چوڑیدار پاجامہ نہ دوپلّی ٹوپی۔ آج کل تو عربی ممالک میں لمبی قمیص پر چھوٹا کوٹ اور سرپر رومال رایج ہے اور حضرت ابراھیم کے زمانے کی تمدن کی یادگار ہر سال حاجیوں

کے احرام کی چادروں کی صورت میں مثالی جاتی ہے لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ جو جماعتی نظریہ اسلام نے پیش کیا اور جو اصول مساوات بنی نوع انسانی قایم کیے اس کی جھلک ہر اسلامی ملک میں مسلمانوں میں پوری طرح نظر آتی ہے۔

اردو زبان کی پیدائش

اسی وحدت انسانی، اسی اخوت و مساوات کے جذبہ نے ہندستان میں ایک ایسی زبان پیدا کردی جس کے کئی ناموں میں سے ایک نام اردو بھی ہے۔ زمانۂ قدیم میں جو کام سنسکرت کر سکتی تھی لیکن مذہبی فرقہ کی تنگ نظری کی وجہ سے نہ کرسکی، وہ کام فارسی کو کرنا پڑا یعنی دارالسلطنت کے قریب کی بولی کو عام طور پر ہندستان کی مشترک زبان بنا دیا اور جو لوگ فارسی سے نا آشنا تھے انھوں نے بھی ہندستان کے دور دراز گوشوں میں رہنے کے باوجود اردو زبان کے ذریعہ سے فارسی لٹریچر اور ہندستان کے مشترک تمدن سے فائدہ اٹھایا اور عام لوگوں کی بولی یعنی برج بھاشا نے فارسی طرز انشا، فارسی بحروں اور فارسی اصطلاحات کو اتنا جذب کیا کہ وہ ہندستانی ہوگئیں۔

"ہندستان کی بولیوں کی جتنی قسمیں ہیں ان میں سے کسی میں وہ بحریں نہیں ہیں جو فارسی شعرا استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی شاعری کی یہ خصوصیت ہے کہ سنسکرت کی تقلید میں وہ اصول عروض کی پابند نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دوہے یا چوپائی میں چند قوافی جمع کردیے گئے ہیں اور بس۔ ہر حرف کے ساتھ ایک ہلکی سی زبر کی آواز لگی ہوئی ہے جو بسا اوقات ایک مصرعے کو دوسرے سے بہت زیادہ لمبا کر دیتی ہے۔ پھر اس میں ترنم پیدا کرنے کے لیے اتنی کھینچ تان کرنی پڑتی ہے کہ الفاظ کی صورت ہی بدل جاتی ہے۔ لیکن اس قسم کی شاعری میں ایک بات ضرور ہے جو ہمیں یورپین شاعری میں بھی نظر آتی ہے، یعنی بلینک ورس (Blank Verse) کی طرح قافیہ دار شعر (Rhymed Couplets) بھی ہوجاتے ہیں اور شاعر کے دل اور زبان میں زیادہ تفاوت نہیں پیدا ہوتا۔ جو دل میں

آیا' بغیر کسی تصنع کے کہہ دیا۔ آمد ھی آمد ھوتی ھے اور آورد کی گنجائش ھی نہیں لیکن اردو شعرا کا یہ خیال ھے کہ یہ شاعری نہیں تکبندی ھے جس میں نہ موسیقی کی شیرینی ھے' نہ زبان کا چٹخارا۔ یہ چیز کو نیچرل ھے لیکن ھر چیز جو نیچرل ھو آرٹسٹ کے نقطۂ نظر سے جنگل ھے چمن نہیں ھے۔ فارسی نے جو کام کیا وہ یہی تھا۔ اس نے فطری پیداوار کو اپنے عروض کی قینچی سے تراش کر ایک چمن بنا دیا۔ "

یہ فارسی زبان کی فتح تھی فارسی تمدن کی فتح تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و تمدن کی رفعت و شوکت کا بھی ثبوت تھی۔ اسے عرب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اسے عربی زبان کے قواعد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ ایران کے ان باشندوں کی زبان تھی جو اسلام کی جمہوریت و مساوات کے سیلاب میں بہ تو گئے تھے لیکن باوجود اس کے ان کا تمدن اتنی ٹھوس بنیادوں پر قائم تھا کہ آخرکار خود عربوں کو ایرانی رنگ ڈھنگ اختیار کرنے پڑے اور رفتہ رفتہ عربی سادگی اور حمایت و مروت پر ایرانی تکلفات نے غازہ مل کر کیا سے کیا بنادیا۔ بہت سی عربی بحریں متروک ھوگئیں۔ معانی کو چھوڑ کر بیان پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ حریری اور بدیعی نے نثر میں اور متنبی وغیرہ نے نظم میں فارسی رنگ عربی پر چڑھانا شروع کیا اور اگر تھوڑا بہت کلام جاھلیہ اور قرآن کریم موجود نہ ھوتا تو بہت ممکن تھا کہ آج ھمیں حقیقی اور فصیح عربی سے اتنا ھی بُعد ھوتا جتنا برج بھاکھا کو سنسکرت سے یا موجودہ یورپین زبانوں کو لاطینی و یونانی سے۔

لیکن فارسی کی یہ فتح حقیقت بیں نگاھوں کے لیے کسی اور قدیم‌تر زبان و تمدن کی فتح ھے۔ وہ زبان و تمدن کون سا تھا؟ اس کا جواب تاریخ ادبیات سنسکرت سے مل سکتا ھے۔ سنسکرت زبان کے محققین معترف ھیں کہ جس منبع سے فارسی' پہلوی اور ژند نکلی ھیں وھی سنسکرت کا بھی سرچشمہ ھے۔ حقیقت سے بُعد ھونے کی وجہ سے ھم تنگ‌نظر بن جائیں تو یہ دوسری بات ھے ورنہ یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ سنسکرت کی بہترین اور ترقی‌یافتہ صورت فارسی ھے اس لیے کہ جتنے ماھرین لسانیات ھیں

سب قائل ہیں کہ زندہ زبانیں ہمیشہ ترقی کرتی رہتی ہیں اور ترقی کے سفر کے دوران میں اپنے تیز اور بھدے کناروں کو گھس گھسا کر اتنا درست کرلیتی ہیں کہ وہ انسان کی فطری لطافت گفتگو کا نمونہ بن جاتے ہیں۔

ہندی اردو کا اختلاف

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہندستان میں سیاسی، مذہبی اور سماجی اختلافات پر کچھ عرصے سے ایک نیا اضافہ ہورہا ہے۔ یہ ادبی اور لسانی اختلاف ہے۔ ہمیں صاف صاف اس حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچ جانا چاہیے، انہیں منظر عام پر لانا چاہیے اور اگر ممکن ہو تو ان کا مداوا کرنا چاہیے۔

ہندستان کے مختلف حصوں میں جتنی بولیاں بولی جاتی ہیں وہ ہندستانی ہیں اور چونکہ یہیں کی پیداوار ہیں لہذا بقول کاکا کلیلکر صاحب کے "ہندی ہندستانی" ہیں، گجراتی، بنگالی، پشتو، اڑیہ، تلنگی، بھوجپوری حتّٰی کہ اردو بھی "ہندی" ہے۔ لیکن کسی "ہندی" کے متعلق اب تک یہ دعوے نہیں کیا گیا کہ وہ ہندستان کی عام زبان یا کم از کم بین صوبجاتی زبان ہوسکتی ہے۔ صرف اس ہندستانی زبان کا یہ دعویٰ ہے جو لاہور، دہلی، لکھنؤ، پٹنہ میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور جو بندرگاہوں اور فوج کے مختلف اللسان اور مختلف النسل لوگوں کے اظہار خیال کا ذریعہ ہے یعنی یہ شمالی ہندستان کے "شہروں" کی زبان ہے جو اگرچہ قصبات میں بھی رائج ہے لیکن قریات اور دیہات میں لوگوں کی مادری زبان نہیں ہے۔ دیہاتی بولیاں سو سو میل پر بدل جاتی ہیں۔ لاہور سے انبالہ اور سہارنپور کے قریب تک پنجابی ہندی کہی جاسکتی ہے۔ دہلی سے لکھنؤ تک ترقی‌یافتہ برج بولی ہے۔ لکھنؤ سے الہ‌آباد تک اودھی اور الہ‌آباد سے پٹنہ تک پوربی کہی جاسکتی ہے۔ پٹنہ سے سنتھال پرگنوں حتّٰی کہ بردوان تک بہاری پوربی ہے۔ ان سب غیر تربیت‌یافتہ ہندیوں کو اب تک زبان کا درجہ حاصل نہیں ہوا۔ جو کوئی بھی کسی متمدن زبان میں بولنا چاہتا ہے وہ آسانی سے فارسی اصطلاحات اور اردو طرز بیان کو لے کر انک

شہری زبان بنا لیتا ہے۔ یہ وہی زبان بن جاتی ہے جو شمالی ہندستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے اور جسے کانگرس نے ہندستانی زبان مانا ہے اور اسے یہ حق دیا ہے کہ بین صوبجاتی زبان تسلیم کی جائے۔ اس زبان نے فطری طریقے پر عرصۂ دراز سے یہ حق خودبخود حاصل کرلیا ہے اور ہر صوبہ میں رائج ہے۔

لیکن پھر یہ اختلاف کیا ہے اور کیوں ہے؟ بقول غالب:

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ ہنگامہ کی بنیاد ہمیشہ جہل پر ہوتی ہے، اور موجودہ ہندی اردو جھگڑا تو سراسر جہالت پر مبنی ہے۔ دو گروہ ہیں جو صاف صاف اپنا مافی الضمیر کہتے ہیں اور اس کہنے میں انہیں کوئی جھجک بھی نہیں ہے۔ ایک کہتا ہے کہ ہندی ہندستان کی زبان ہے، یہ چالیس کرور باشندگان ہند کی زبان ہے اور دوسری بولیاں نہ اتنی بلند ہیں نہ اس کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔ اسے انگریزی کو ہٹاکر عام ملکی زبان اور تعلیمی زبان ہوجانا چاہیے۔ (دیکھیے اڈریس ہندی سبھا سنہ ۱۹۳۷ء شانتی نکیتن، بنگال۔ بزبان پنڈت بنارسی داس چتروبدی، اڈیٹر وشال بھارت، کلکتہ)۔ سی۔ ایف۔ انڈریوز صاحب نے اس کا یہ جواب دیا کہ «ہندی میں جب تک کافی تعداد فارسی الفاظ کی نہ ہو وہ ہندستانی زبان نہیں ہوسکتی اور نہ ایسی زبان رائج کرنا مفید ہے»۔ اس کے بعد ہی انھوں نے مسئلہ زبان پر ایک رسالہ لکھا جو مختلف اخبارات میں گزشتہ سال شائع ہوچکا ہے۔

دوسرا گروہ اردو کا حامی ہے اور صاف صاف اردو لٹریچر کی خوبیاں اور اس کا ہندستان پر عالمگیر اثر و نفوذ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ بھی چتروبدی جی کی طرح «اردو» کو ہندستان کی عام زبان قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ زبان عرصہ دراز سے اپنا حق قایم کرچکی ہے اور جو لوگ ہندی کے حامی ہیں وہ ایک ایسی زبان رائج کرنا چاہتے ہیں جو کہیں بولی نہیں جاتی۔ صرف چند اخبارات و رسایل کی مصنوعی سنسکرت آمیز زبان تک محدود ہے۔

دونوں گروہ جہالت کی وجہ سے برسر پیکار نظر آتے ہیں۔ ایک جا و بےجا سنسکرت

کے نامانوس الفاظ سے ایک ایسی زبان اور گرامر رائج کرنا چاہتا ہے جو صرف تحریری بولی تک محدود ہے، کسی حصۂ ملک کی عام بات چیت کی بولی نہیں ہے حتٰی کہ بنارس میں بھی یہ بولی کوئی نہیں بولتا۔ دوسرا گروہ عربی کے بوجھل الفاظ کے ساتھ اس زبان کی گرامر کی خصوصیتوں کو بھی ہندستانی بنانا چاہتا ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سوائے چند کے عام لوگوں تک یہ زبان نہیں پہنچ سکتی حتٰی کہ ان ادھورے پنڈتوں اور نیم ملاؤں کی زبان خود ان کے بچے تک نہیں سمجھ سکتے۔

ہندی کے ہمدردوں کا فرض ہے کہ اگر واقعی وہ کسی زبان کو جسے وہ خالص ہندی کہتے ہیں ملک کے طول و عرض میں رائج کرنا چاہتے ہیں تو وہ ایسی بولی منتخب کریں جو کسی خطۂ ملک میں بولی جاتی ہو خواہ وہ آگرے کے قرب و جوار کی برج بولی ہو، لکھنؤ، فیض‌آباد کی اودھی ہو یا الہ‌آباد و بنارس کی پوربی۔ یہ بولیاں ایک حد تک ایک ہی قسم کی گرامر رکھتی ہیں۔ عام ضروریات زندگی کے لیے جو الفاظ ہیں وہ بھی ملتے جلتے ہیں اور افعال و حرف میں بھی کسی حد تک یکسانیت ہے۔ سب سے بڑی خوبی ان بولیوں میں یہ ہے کہ عوام میں رائج ہیں اور بےتکلف ہر ایک دیہاتی اپنی بولی میں اپنے جذبات کا اظہار کرسکتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ مصنوعی ہندی نہ صرف ان بیچاروں کے لیے ایک نئی زبان ہوتی ہے بلکہ ایک ایسا بار ہوتی ہے جو بالکل نئی زبان سیکھنے کے مقابلہ میں زیادہ بوجھل ہوتی ہے۔ مصنوعی ہندی میں جو نئے نئے لفظ اور محاورے ٹھونسے جاتے ہیں وہ ایک بنی بنائی زبان کی لطافت کو کھودیتے ہیں اور چند دوست‌نما دشمنوں کو موقع ملتا ہے کہ قدامت پرستی اور مذہب کی آڑ میں ہماری سیدھی سادی زبان کا گلا گھونٹیں اور نوے فی‌صدی آبادی کی روزمرہ کی زبان پر ایک ایسا پلاسٹر لگائیں جو نہ صرف اس کے اصلی خط و خال کو چھپادے بلکہ ہندی کے اصلی رنگ روپ کو مٹاکر تمسخر انگیز الفاظ پیش کرے۔

ملاحظہ فرمائیے۔ "جی ہاں" سنسکرت سے دور ہوگیا ہے اس لیے اسے قریب لانا ہے۔ قریب لانے سے یہ فائدہ (؟) ہے کہ چونکہ ہندستان کی دوسری بولیاں بھی سنسکرت سے نکلی ہیں اور ہر ایک بولی بنیادی طور پر اسی طرح ایک ہوسکتی ہے

کہ الفاظ اپنے اصل کی طرف رجوع کریں لہذا تلاش شروع ہوئی ۔ معلوم ہوا کہ "جی" کا ماخذ "آ گیا" ہے ۔ "آ گیا" کا کاف ہزاروں سال کی تگ و دو کے بعد جیم ہوگیا تھا۔ اس لیے اب ماہرین ادبیات ہند کا حکم ہے کہ "جی" کی جگہ "آ گیا" اور "جی ہاں" کی بجائے "آ گیا ہاں" بولا جائے ۔ اسی طرح "آپ" کی جگہ "آلپ" ہندستان کو بھارت ورش۔ برس (سال) کو ورش کہیے ۔ اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ ایک ایسی زبان ایجاد کیجیے جو نہ آپ سمجھیں نہ کوئی دوسرا سمجھے، جو نہ آپ کے گھر میں بولی جاتی ہو نہ کسی حصۂ ملک کے آدمیوں کی مادری زبان ہو ۔ لیکن ہو سنسکرت سے قریب۔

ہندی کے حامیوں میں یہ غلط طریقہ کیسے پیدا ہوا اور انھیں اردو سے کیوں نفرت شروع ہوئی، اس کی ایک وجہ تو پہلے عرض کردی گئی ہے یعنی مذہبی تنگ نظری اور قدامت پرستی ۔ اس سنسکرت کی محبت نے ملکی بولیوں کو بھی پنپنے کا موقع نہیں دیا اور برج، اودھی اور پوربی جہاں تھیں وہاں اب تک ہیں ۔ سنسکرت کے پنڈتوں نے انھیں عوام کی زبان سمجھ کر چھوڑ رکھا ہے ۔ اگرچہ پنڈت جواہرلعل نہرو اور دوسرے بین‌الملیت کے دلدادہ یہ چاہتے ہیں کہ عوام کی بولی یعنی شمالی ہند کے دیہاتوں کی بولی کو ترقی ہو تاکہ عوام تک جمہوریت اور مساوات کے خیالات پہنچیں اور وہ خود اپنا زندہ لٹریچر بناسکیں لیکن اب تک یوپی، بہار اور پنجاب میں یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ عام مدارس میں جو زبان رائج ہو وہ مادری زبان ہو اور شہری یا تمدنی کاروبار اور بین صوبجاتی تعلقات کے لیے ہندستانی زبان ہو جو شہروں میں بولی جاتی ہے اور جس کا دوسرا نام آسان اردو یا فارسی‌آمیز اودھی یا پوربی یا برج ہے ۔ اس زبان میں جو فارسی کے لفظ ہیں وہ بھی ہندستانی ہوگئے ہیں اور اپنی اصل سے بہت دور ہوگئے ہیں اور گو ان کی اصل یعنی فارسی بھی سنسکرت کی ترقی‌یافتہ صورت ہے لیکن قوانین ترقی نے فارسی لفظوں کو بھی ایسے معنوں میں مخصوص کردیا ہے جو سوائے ہندستان کے ایران یا کسی فارسی بولنے والے ملک میں رائج نہیں ۔ بہرحال ہندی والوں کا یہ نظریہ سراسر غلط ہے کہ جو فارسی کے لفظ ہندستانی زبان میں رائج ہوگئے ہیں وہ ہندستانی نہیں ہیں ۔ بلکہ

یہ غلو کیا جارہا ہے کہ اصلی هندستانی لفظوں کو جو براہ راست سنسکرت سے نکل کر بدل گئے ہیں ان کو بھی ایک فرضی و سطحی یکسانیت کے خیال سے بدل کر سنسکرت بنایا جارہا ہے ۔

دوسری وجہ سیاسی ہے ۔ هندستان میں اختلافات کو ترقی دے کر ہی ایک قوم اپنی سیادت قائم رکھ سکتی ہے ۔ فارسی درباری زبان تھی لیکن آسان اردو یا هندستانی عام طور پر سند قبول حاصل کرچکی تھی ۔ اس لسانی یک جہتی نے هندستانی قوم کو عملی طور پر ایک ہی طرح سوچنے اور بولنے کا عادی کردیا تھا ۔ جو لوگ اس اتحاد کے دشمن تھے انھیں یہ بات نہ بھائی ۔ پہلے یہ کوشش کی گئی کہ فارسی کی جگہ اردو رائج ہو ۔ پھر اردو رسم خط سے نفرت کا اظہار شروع ہوا اور بہار میں کیتھی رسم خط سنہ ۱۸۸۱ع سے شروع کیا گیا ۔ اسی سال سی-پی میں بھی هندی زبان اور ناگری رسم خط عدالتوں میں جاری کردیا گیا ۔ اس نفاق کا بیج بونے والوں کی تحریروں کے چند اقتباسات اس تاریخ اور پس منظر کو ظاہر کر سکیں گے جو موجودہ دور کے هندی کے حامیوں کی کوششوں میں نظر آتا ہے ۔

سرکلر نمبر ۴۵ صدر بورڈ مال مورخہ ۳۰ مئی سنہ ۱۸۳۷ع بنام کمشنران مال جس نے فارسی کا خاتمہ کیا :—

"مجھے بیان کرنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ صدر بورڈ صیغہ مال کی رائے میں وقت آگیا ہے کہ جہاں تک ناقابل اعتراض طریقوں سے ممکن ہو پُرزور طریقے اختیار کیے جائیں کہ فارسی کی جگہ انگریزی اور ورنیکلر زبانوں میں صیغۂ مال کا کام جاری ہو ۔"

(صفحہ ۷۱۱ مطبوعہ ۱۸۳۸ع)

"ہز لارڈشپ نہایت ہی آرزومند ہیں

The Secretary to the Board in his Circular No.45, dated 30th May, 1837, addressed to all Commissioners of Revenue, said :—

"I am directed to state that, in the opinion of the Sudder Board of Revenue, the proper time has arrived for taking effectual measures to substitute, as for as may be unobjectionably practicable, the English and Vernacular languages for the Persian, in the business of the Revenue Department.,,

(p. 711, printed in 1838)

"His lordship is extremely desirous, in accordance with the

چونکہ یہی جذبات آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرز کے بھی ہیں کہ باشندگان ہند کی ورنیکلر زبان پھر اپنی اصلی جگہ پر قائم ہو جہاں سے وہ عرصہ دراز سے نکالی پڑی ہے اور اسی زبان میں ملک کا کاروبار پھر شروع ہوجائے " (صفحہ ۷۳۷)

sentiments of the Honourable the Court of Directors, that the vernacular language of the people should resume its proper place, from which it has been so long banished,- in the transaction of the business of the country." (p. 737).

لیکن بنگال کوڈ (Bengal Code) کے قواعد کے مطابق عدالت اور محکمہ مال کی کارروائیوں میں فارسی کا استعمال قانوناً ناگزیر تھا۔ یہ مشکل گورنر جنرل نے اپنی کونسل کی مدد سے حل کردی اور قانون نمبر ۲۹ سنہ ۱۸۳۷ ع (Act 29 of 1837) ۲۰ نومبر سنہ ۱۸۳۷ع کو جاری کردیا گیا اور ورنیکلر زبانوں کو فارسی کی بجائے رائج کرنے کا حق سپریم اگزیکٹو حکومت ہند (Supreme Executive Govt. of India) کو مل گیا۔

لیکن چونکہ هندستان (یعنی بہار، شمال مغربی صوبہ جسے اب ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کہتے ہیں اور صوبۂ متوسط کے بعض علاقوں) میں صرف ایک ہی زبان جاری تھی جسے انگریز ہندستانی اور خود ان ممالک کے لوگ اردو یا ریختہ کہتے تھے اس لیے سرکار کمپنی بہادر نے اتنا کرم فرمایا کہ اسے عدالتوں اور محکمہ مال کی زبان تسلیم کرلیا اور اردو رسم خط جاری رہنے دیا لیکن مزید تفریق پیدا کرنے کے لیے سنہ ۱۸۸۱ ع میں بہار میں کیتھی اور اسی سال سی۔پی میں ناگری جاری کردی گئی۔

اس میں شبہ نہیں کہ جتنا علاقہ انگریز کمپنی نے حاصل کرلیا تھا اس میں گاؤں کے رہنے والوں کی زبان اردو نہیں تھی اور خود ان کی بولیاں اتنی ترقی‌یافتہ نہ تھیں کہ تمدنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرسکتیں۔ بہاری، بھوجپوری، پوربی زبانوں میں ترقی کی صلاحیت ضرور ہے اور سنہ ۱۸۵۶ع کے بعد جب اودھی زبان بولنے والوں کا علاقہ بھی کمپنی کے زیر اثر آگیا تو وہاں بھی شہروں کی زبان اردو اور

قصبات کی معمولی اردو لیکن گاؤں اور دیہات کی بولی اودھی تھی جو کمپنی کے دوسرے علاقوں کی بولیوں سے بڑی حد تک ملتی جلتی تھی۔ گو مرزاپور کے پادریوں کو انگریزی کمپنی کی حمایت میں اسلام اور مسلمانوں کی حکومت پر ہر طرح کے جا و بےجا حملے کرنے کا اختیار تھا لیکن انھیں ابھی یہ چیز نہیں سوجھی تھی کہ ہندو بھی کسی زمانہ میں مد مقابل ہوں گے؛ ادھر انھوں نے توجہ ھی نہیں کی تھی۔ ان کے سامنے تو صرف ایک ایسی قوم تھی جو خود عیسائیوں کو اہل کتاب مانتی تھی اور داتوں کی گروہ بندی کی دشمن اور عالمگیر اخوت و مساوات کی حامی تھی۔ لہذا پہلے اسے مٹانا یا کم از کم زیر کرنا مشنریوں کا فرض تھا۔ انھوں نے بنارس اور مرزاپور سے لوہے کے ٹائپ میں جو کچھ بھی لکھا وہ ہندستانی زبان اور رسم خط میں لکھا۔ اودھ میں فارسی رائج تھی لیکن شاہان اودھ نے ملکی تمدن کو ترقی دے کر اپنا لیا تھا۔ انھوں نے ملکی زبان بھی اردو ھی قرار دے لی تھی اور اس طرح وہ لوگ عوام کے بہت ھی قریب زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ اسی لیے جب عنان حکومت کمپنی کے ھاتھ میں آئی تو اسے اردو کو عوام کی زبان مان لینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

اسی زبان کو ہندی بھی کہتے تھے اور ہندوی بھی۔ ریورنڈ مسٹر کیلاگ اپنی کتاب «ہندی زبان کی گرامر» کے دیباچہ میں کہتا ہے :-

«شمالی ہند کے ان شہروں میں جو ہندو دھرم کے بڑے مرکز ہیں مثلاً بنارس، الٰہ آباد اور متھرا اور ہمالیہ میں گنگوتری، کدار ناتھ اور بدری ناتھ کے مقدس مندروں تک اور ہندستان کی اکثر

The Rev. Mr. Kellogg, in the Preface to his "Grammar of the Hindi Language" 1865, says:-

"Of the two hundred and fifty million inhabitants of India, speaking a score or more different languages, fully one-fourth, or between sixty and seventy millions, own the Hindi as their vernacular. In all the great centres of Hindu faith in North India, alike in populous

Benares, Allahabad and Mathura, and in the mountains about the sacred shrines of Gangotri, Kidarnath and Budrinath, among the Himalayas; in many of the most powerful independent native states of India." (Page 40).

طاقتور ریاستوں میں ...... ہندی ہی آبادی کے بہت بڑے حصہ کی زبان ہے"۔

لیکن ہندی سے اس کا کیا مفہوم ہے اور اردو ہندی میں کیا فرق ہے اسے وہ اگلے جملے میں اس طرح ادا کرتا ہے:۔

"Only where Mahomedan influence has long prevailed, as in the large cities, and on account of the almost exclusive currency of Mahomedan speech in Government offices, have many Hindus learned to condemn their native tongue and effect the Persianized Hindi known as Urdu." (Page 40).

"صرف جہاں کہیں مسلمانوں کا اثر زیادہ عرصہ تک رہا ہے یعنی بڑے بڑے شہروں میں اور چونکہ تقریباً ہر سرکاری دفتر میں صرف مسلمانی زبان رائج ہے، بہت سے ہندوؤں نے اپنی مادری بولی سے نفرت کرنا سیکھ لیا ہے اور فارسی آمیز ہندی بولتے ہیں۔ اس کو اردو کہتے ہیں"۔

اس ہندو دھرم اور ہندی کی محبّت کو مسٹر آر بیمز نے اپنی گرامر کے مقدمہ میں اس طرح بیان کیا ہے:—

Mr. R. Beames, B.C.S., author of "A Comparative Grammar of the Modern Aryan Languages of India" in this work says:-

"Hindi is that language which is spoken in the valley of the Ganges and its tributaries, from

"ہندی وہ زبان ہے جو وادی گنگ و جمن میں بولی جاتی ہے۔ بہ مقام

the watershed of the Jamna, the largest and most important of them, as far down as Rajmahal, the point where the Ganges takes a sudden turn to the south, and breaks out into the plains of Bengal. This area is the centre and principal portion of Aryan India. It includes the Antareed or Doab between the Ganges and the Jamna, the "inner hearth" of the nation. It is therefore the legitimate heir of the Sanskrit, and fills that place in the modern Indian system which Sanskrit filled in the old."

راج محل تک ہے جہاں سے بنگال شروع ہوتا ہے۔ یہ رقبہ آریہ هندستان کا مرکز اور خاص حصہ ہے......لهذا یہ (یعنی هندی) سنسکرت کی جائز وارث ہے اور موجودہ هندستان میں اس کی وهی جگہ ہے جو قدیم هندستان میں سنسکرت کی تھی"۔

صرف مندرجہ بالا تحریر کو اس زمانے سے اب تک هندی کے متعلق ایک بنیادی اور صحیح نقطہ نظر سمجھا جارها ہے۔ اسی قسم کی تحریروں کے ذریعہ سے بعض فرقہ پرور اور قدرتاً تنگ نظر اور قدامت پرست حضرات هندی کی محبت کو هندو دهرم اور آریہ ورت یا بھارت ورش کی محبت قرار دیتے هیں اور یہ سمجھتے هیں کہ شاید کوئی هندی زبان ضرور موجود ہے جو دوآبۂ گنگ و جمن میں یکساں طور پر شہروں اور دیہاتوں میں رائج ہے۔ حالانکہ واقعہ سراسر مختلف ہے۔ برج، اودھی، پوربی، بہاری ایک محدود رقبہ کی بولیاں هیں اور اگرچہ سب هندی کی شاخیں هیں لیکن اس ادبی معیار تک نہیں پہنچیں کہ زبان کہلائیں۔ اسی خیال کو مندرجہ بالا مصنف جب آگے چل کر بیان کرتا ہے تو عصبیت کی عینک سے وہ حقیقت نظر نہیں آتی جو یقیناً همیں متحدہ قومیت اور بین الملیت کی طرف لے جاسکتی ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"Throughout the whole of this vast region though the dialects diverge considerably, one common

"اس وسیع رقبہ میں اگرچہ عام بولیوں میں بہت بڑا اختلاف ہے لیکن

ایک عام اور عالمگیر طرز گفتگو رائج ہے اور سب پڑھے لکھے اشخاص اسے استعمال کرتے ہیں۔ بظاہر یہ عام زبان دہلی کے قرب و جوار سے نکلی...... اس هندی کو تدریجی ترقی ہوئی اور زبان نے کسی قدر نئی شکل اختیار کرلی جس میں اگرچہ اسما و افعال خالص هندی رہے اور عام الفاظ بھی کثیر تعداد میں وہی رہے لیکن فارسی، عربی، حتیٰ کہ ترکی زبان کے بہت سے لفظ اس میں جگہ پاگئے۔ جس طرح لاطینی اور یونانی الفاظ انگریزی میں داخل ہوگئے ہیں اسی طرح ایسے الفاظ نے نہ تو زبان کو بدلا نہ اس پر اثر ڈالا۔ اس کی صوتی کیفیتیں اور گردانیں خالص آرین رہیں۔ یہ چیزیں ولی اور سودا کے یہاں بھی ویسی ہی ہیں جیسی تلسی داس اور بہاری لال کے یہاں۔ اردو اور هندی کو دو زبانیں سمجھنا نہ صرف مسئلہ کے متعلق سخت ترین غلط فہمی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ یہ علم لسانیات کے جملہ اصولوں کے بھی منافی ہے۔ جب بعض لوگ یہ شور غل مچاتے ہیں کہ عدالتوں کی زبان اردو کی جگہ هندی ہو تو ان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ عدالت

universal form of speech is recognised, and all educated persons use it. This common dialect had its origin apparently in the country round Delhi, the ancient capital, and the form of Hindi spoken in age, in which, though the inflections of nouns and verbs remained purely and absolutely Hindi, and a vast number of the commonest vocables were retained, a large quantity of Persian and Arabic and even Turkish words found a place, just as Latin and Greek words do in English. Such words, however, in no way altered or influenced the language itself, which, when its inflectional or phonetic elements are considered, in those of Tulsi Das or Behari Lal. It betrays therefore a redical misuderstanding of the whole bearing of question, and of the whole science of philology, to speak of Urdu and Hindi as two distinct languages. When certain agitators cry out that the language of the English Courts of law in Hindustan should be Hindi and not Urdu, what they mean is that clerks and native writers should be restrained from importing too many Persian and Arabic words into their writings, and should use instead the honest old Sanskrit Tadbhavas with which the Hindi abounds,

کے عملے کو زیادہ فارسی، عربی استعمال
کرنے سے روکا جائے اور ان سنسکرت کے
الفاظ کو رائج کرایا جائے جو ہندی میں
بہت کثرت سے ہیں اور جنھیں تبھو یا
عام بول چال کے الفاظ کہتے ہیں ۔ بے شک
ایسا ہی ہونا چاہیے ۔ لیکن یہ نہ ہونا
چاہیے کہ اردو کو ہندی سے علیحدہ ایک
زبان مانا جائے ۔ عربی اور فارسی الفاظ
کے رواج نے ہندی پر احسان عظیم کیا
ہے کیوں کہ ہندی کو نئے الفاظ کے لیے
بار بار سنسکرت کی طرف رجوع کرنے
اور پُر شکوہ اور پُر معنی سنسکرت الفاظ
کی تلاش سے بچا لیا ہے۔"

By all means let it be so, only let it not be said that the Urdu is a distinct language from Hindi. By means of the introduction of Arabic and Persian words, a very great benefit has been conferred on Hindi, in as much as it has thus been prevented from having recourse to Sanskrit fountains again and again for grand and expressive words." (See Introduction to "A Comparitive Grammar of the Modern Aryan Language of India. Vol. I pp. 31-33).

یہ (تت بھو) الفاظ وہی ہیں جو ابتدا میں سنسکرت سے نکلے تھے اور ہزاروں برس کے بعد منجھتے منجھتے اور عام بولی پر چڑھ کر قبول عام کی سند حاصل کرچکے ہیں یا جیسا پہلے عرض کیا گیا ہے کہ فارسی الفاظ جو سنسکرت کی ترقی یافتہ صورت ہیں انھیں بھی (تت بھو) کہنا چاہیے اور جو الفاظ عام بولی میں گھل مل گئے ہیں انھیں غیر ملکی سمجھ کر ان کے درپے نہ ہونا چاہیے ۔ اس خیال کو مسٹر بیمز اس طرح ادا کرتے ہیں :-

" سنسکرت الفاظ کو ان کی قدیم
کلاسکل صورت میں دوبارہ لانے اور استعمال
کرنے کی کوشش (جو موجودہ زبانوں
میں قرنوں سے جاری ہے اور اب بھی

"This resuscitation of Sanskrit words in their classical form, a process which has been going on in the modern languages for ages, and is still at work as vigorously as ever, just as the resuscitation of Latin

زوروں پر ہے۔ مثلاً لیٹن کو اصلی صورت میں فرانسیسی زبان میں داخل کرنے کی کوشش) نے هندستان کی بعض زبانوں کو شدید نقصان پہنچایا ہے اس لیے کہ اصلی سنسکرت الفاظ کی وجہ سے عام الفاظ (تت بھو) کو چھوڑنا پڑتا ہے اگرچہ الفاظ کی یہ قسم زبانوں کا بہترین خزانہ ہوتا ہے۔ ان سے نہ صرف لسانی ترقی کے مدارج معلوم ہوتے ہیں بلکہ مشکل تلفظ کو (جو قدیم زبان میں تکلیف دہ درجہ تک فاضل ہوتا ہے) چھوڑ دینے کی وجہ سے ان میں انتہائی لوچ، صفائی اور عملی افادیت پیدا ہوجاتی ہے۔ بعض زبانوں (خصوصاً بنگالی) میں "تت سم" (یعنی اصلی لفظ) سنسکرت سے لے لیے ہیں اور تحریر میں لائے جارہے ہیں۔ باوجودیکہ عام بول چال کے اچھے خاصے الفاظ موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بدقسمت کسان جو سنسکرت نہیں جانتا علم حاصل کرنے میں روز افزوں مشکلوں میں پھنس رہا ہے اور عوام کی تعلیم میں اس سے رکاوٹ پیدا ہورہی ہے۔ روزمرہ (تت بھو) کے لیے هندی سب سے آگے ہے وہ هندی بھی جو مقامی ذرائع سے الفاظ لیتی ہے اور زبان کی وہ عام اور

words has always been and is still going on in French, has done a serious injury to some languages of the Indian group, in as much as it has led them to drop their Tadbhavas, which are the most vlauable class of words that a language can possess, not only on account of the light they throw on the philological processes which language has undergone, but because, having cast away all that was difficult of pronounciation, combrous, and superfluous in the ancient language, they possess the perfection of flexibility, neatness and practical usefulness. In some languages, notable in Bengali, Tatsama words have been borrowed from Sanskrit, and employed in written works, in cases where there already existed good serviceable Tadbhavas. The result has been that the unfortunate peasant who knows no Sanskrit, finds it more and more difficult every day to acquire knowledge, and the education of the masses is thus retarded. In respect of Tadbhavas, Hindi stands pre-eminent, whether it be that form of Hindi which relies principally upon indigenous sources for its words, or that other wirely employed form which he incorporated the flower and grace of

ہمہ گیر صورت بھی (جس نے عربی اور فارسی اسما کی خوبی اور لطافت کو جذب کرلیا ہے) جسے کبھی اردو کہتے ہیں اور کبھی ہندستانی"

Persian and Arabic nouns, and which is called sometimes Urdu, sometimes Hindustani.,, (Beam's Comparitive Grammar p.p. 31-33).

زبان کا معاملہ ہندو مسلم سوال کیوں بنایا گیا؟

حقیقت یہ ہے کہ کمپنی کو اپنی حکومت جمانے کے اسی رومن نظریۂ افتراق کو ترقی دینا تھا جس پر ہر جگہ استعمار پرستیوں کی بنیاد ہوتی ہے۔ سب سے پہلے مذہب کے نام پر مشنری آتے ہیں۔ تجارتی حقوق پیدا کیے جاتے ہیں۔ قرض دیے جاتے ہیں۔ اجارے حاصل کرنے کے بعد آپس میں لڑانا اور حکومت کو مضبوط کرنا شروع ہوتا ہے۔ گو ابتدا میں اپنا مذہب پھیلانے کے لیے مسیحی مشنریوں نے ضمناً وہ کام بھی کردیا جو مقامی باشندے اب تک نہ کر سکے۔ یعنی انھوں نے ہندستان کی جتنی بولیاں تھیں سب کی گرامریں اور لغتیں مرتب کر ڈالیں۔ مثلاً رسالہ ایشیاٹک (Asiatic) کی اردو دوستی کے جواب میں بنگال سول سروس کا ایک شخص (Mr. F.S. Growse M.A. Civil Service) ضمناً ان پادریوں کا اس طرح ذکر کرتا ہے:۔

"اس عقیدے کی بنیاد کہ ہندی چند گنواری بولیوں کے مجموعے کا نام ہے جن میں نہ تو باہمی ربط ہے نہ وہ ایک مقررہ معیار پر لائی جا سکتی ہیں یہ ہے کہ ابتدائی دور کے پادریوں نے یہ طریقہ اختیار کرلیا تھا کہ جس ضلع میں وہ ہوتے تھے وہاں ایک لغت مرتب کرنے لگتے تھے۔"

"The only foundation for the belief that Hindi is an arbitrary name for a group of vulgar dialects, which have little in common and could not be reduced to one standard, is the practice of the early Missionaries, each of whom set about compiling a dictionary for the district in which he happened to be placed."

(F.S. Growse of Bengal Civil Service)

ان گرامروں اور لغتوں کی ترتیب کا صرف ایک ہی منشا ہو سکتا تھا کہ مقامی باشندوں کو اس تاریکی سے (بزعم خود) نکالیں جس میں وہ اپنے مذاہب کی وجہ سے پڑے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے مذہب کے مقابلے کی تاب ان میں نہ تھی اس لیے ہندوؤں کی طرف رخ کیا گیا اور مقامی بولیوں میں اظہار خیال کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ہندو نظام جیسے ذاتوں کی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے اور جس نے بہت سے سیلابوں کو ہزاروں سال سے روک رکھا ہے، اس مشنری حملے کی دستبرد سے بھی محفوظ رہا اور جب ان کی نہ چلی تو صرف اسی پر اکتفا کرنا کافی سمجھا گیا کہ ہندو مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر کمزور کردیا جائے، ایک اردو کا حامی بنا دوسرا ہندی کا۔ لیکن ہندوؤں نے ابتدا میں نہایت سلامت‌روی اور فراخدلی کا ثبوت دیا اور صرف یہ خواہش ظاہر کی کہ زبان تو ایک ہی رہے البتہ اردو اور ناگری دونوں خطوں میں لکھی جائے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ صورت پیدا کی گئی کہ ہندوؤں نے اسے مذہبی مسئلہ بنا لیا اور ستم‌ظریفی دیکھیے کہ وہ یہی اپنی دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ دینے لگے کہ چونکہ مسلمان آزادی پسند ہیں اور محکومیت کو توڑنے کے لیے انھوں نے بنگال سے پنجاب و صوبہ سرحد تک مجاهدین کی ایک جماعت تیار کرلی ہے اور جو وہابی مشہور ہیں، لہذا اگر اس تحریک کو کچلنا ہو تو ہندی کو اس طرح ترقی دی جائے کہ ناگری رسم‌خط عدالتوں اور مدرسوں میں جاری کیا جائے۔ اس سلسلے میں راجہ شیو پرشاد سی۔ ایس۔ آئی انسپکٹر تعلیمات نے تعلیمی کمیٹی سنہ (۱۸۷۰ع) کے روبرو شہادت دیتے ہوئے یوں گہرافشانی فرمائی :-

"I think, after all, we are getting on very well in our United Provinces, and very little is wanted here except one thing, which is the root of much mischief, great hindrance, and endless complaints. I mean the court character, which is Persian. The true secret of the success in Bengal is that the same

" میرا خیال ہے کہ ہم ممالک متحدہ میں اچھی خاصی ترقی کر رہے ہیں - بس ایک بات کی کمی ہے جو بہت بڑی برائی کی جڑ ہے اور جس کی وجہ سے بڑی رکاوٹ اور غیر متناهی شکایتیں ہو رہی ہیں۔ میرا مقصد عدالتی رسم‌خط سے ہے

جو فارسی ہے ۔ بنگال کی ترقی کا راز یہ ہے کہ جو خط عدالتوں میں ہے وہی دکانوں اور دیہات میں بھی ہے ۔ بہار میں سر ایشلے ایڈن نے بڑا کام یہ کیا ہے کہ ہندی خط کو فارسی کی جگہ رائج کر دیا ہے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ اودھ اور شمال مغربی صوبے بمقابلۂ صوبہ بہار زیادہ مسلمان ہیں ۔ یہ پٹنہ ہی تھا جہاں وہابی تحریکیں زوروں پر تھیں ۔

(صفحہ ۳۲۷ - رپورٹ آف دی ایجوکیشن کمیشن صوبۂ شمال مغربی و اودھ) ۔

character (Bengali) is used in the courts as in the shops and villages. Sir Ashley Eden has done a great thing in making the Hindi character take the place of Persian in Behar. I do not think Oudh and the North Western Provinces are more Muhammadan than the Province of Behar. It was in Patna that the Vahabi movements were so active."

(p. 327 report of the Education Commission N.W. Province.)

یہی راجہ شیو پرشاد جو اس وقت بابو تھے، اپنی "یاد داشت متعلق رسم‌خط عدالت" (Memorandom on Court Characters) میں سنہ ۱۸۶۸ع میں فرماتے ہیں کہ گورنمنٹ نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ انگریزی عوام کی زبان نہیں ہے ۔ لیکن اس کا ایک غیر مرئی نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ فارسی جو بالکل اجنبی زبان ہے یا یوں کہنا بہتر ہوگا کہ فارسی خط میں لکھی ہوئی اردو جو نیم فارسی ہے، بیچارے عوام کے سر تھوپی جا رہی ہے ۔

چند سال بعد (سنہ ۱۸۷۳ع میں) سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر شمال‌مغربی صوبہ کو ہندوؤں کی طرف سے ایک میموریل بھیجا گیا جس میں مندرجہ ذیل چیزیں اردو رسم‌خط کے خلاف لکھی گئیں :—

"(۱) فارسی خط غیر ملکی ہے ۔

(۲) جمہور اس کے پڑھنے سے معذور ہیں ۔

(۳) خاص برائی یہ ہے کہ اس کا پڑھنا بہت مشکل ہے ۔

(۴) ان تحریروں میں آسانی سے تحریف ہو سکتی ہے۔

(۵) اس تحریر کے رواج کی وجہ سے فارسی اور عربی مشکل الفاظ زیادہ رائج ہو گئے ہیں۔

(۶) ہندی تحریر میں مکروہ فارسی اور عربی الفاظ کم ہو جائیں گے۔

(۷) ہندی زیادہ کام میں (آتی ہے)۔ خط و کتابت، بہی کھاتہ، کاغذات دیہی سب اسی میں ہوتے ہیں۔

(۸) ہندی بھی تیزی سے ایسی ہی لکھی جاسکتی ہے جیسا کہ کیتھی، گڑھوال، سنٹرل انڈیا، دیسی ریاستوں اور نیپال میں رائج ہے۔

(۹) مسلمانوں کو یہ تبدیلی پسند نہ ہوگی لیکن وہ تو آبادی کا صرف آٹھواں حصہ ہیں۔ جمہور کا خیال کرنا مناسب ہے (جو ہندو ہیں)۔

(۱۰) ہندی رسم خط سے عام تعلیم (Mass Education) میں ترقی ہوگی۔

(۱۱) ہندی سیکھنا آسان ہے۔

لہذا فارسی تحریر کی جگہ عدالتوں اور دفتروں میں ہندی یا ناگری رسم رائج کردیا جائے تو ہم ہمیشہ دعائیں دیں گے۔"

ان سب دلائل پر صرف ایک جملہ اور بڑھادیجیے اور دیکھیے کہ موجودہ زمانہ کے بڑے بڑے مدبر اور اہل علم بھی ہندی کی حمایت میں اس سے زیادہ کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ وہ یہ ہے :—

"The prevailing nationality is Aryan. The folklore of the peasantry is enshrined in the old Hindi Bhasha; the Bengali, Marhatti, and Gujrati congeners of Hindi are firmly established in the neighbourhood and it is philologically and politically idle to ignore its importance, present or future. It would

"ہندستان میں سب سے تعداد آریہ نسل کے لوگوں کی ہے۔ کاشتکاروں کی تاریخ و ادب سب ہندی بھاشا میں ہے اور اسی سے ملتی جلتی بولیاں یعنی بنگالی، مرہٹی، گجراتی وغیرہ اس کے اطراف میں مضبوطی سے قائم ہیں۔ اس چیز کی اہمیت کو کم سمجھنا خواہ وہ لسانی طور پر ہو یا سیاسی

طور پر فضول ہوگا۔ بس یہ کہنا حقیقت سے قریب تر ہے کہ عدالتوں کی انڈوپرشین (اردو) زبان کو زندہ رہنے کا کوئی حق سوائے اس کے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مسلمان بادشاہی کی یادگار ہے‘‘ (ڈائرکٹر تعلیمات کی رپورٹ بابت سنہ ۷۴-۱۸۷۳ع)

be nearer the mark to say that the Indo-Persian of the Courts has no raison d'etre except as a remnant and reminiscence of Mahomedan soverignty." (Report of the Director of Education for 1873-4).

ہم کس ہندی کو اختیار کریں؟

فرض کیجیے کہ اوپر لکھے ہوئے بیانات بھی صحیح ہیں اور موجودہ زمانہ کے ہندی دوستوں کے دعوے بھی اس حقیقت پر مبنی ہیں کہ ’’ہندوستان‘‘ یعنی سرہند سے بنگالے تک اور جنوب میں ممالک متوسط کے بڑے حصہ تک ہندی رائج ہے۔ اور فرض کیجیے کہ بنگالی، مرہٹی، گجراتی، پنجابی، پشتو وغیرہ بھی اس ہندی سے بہت ہی قریب ہیں جو ’’ہندوستان‘‘ میں بولی جاتی ہے۔ لہذا نظری حیثیت سے تو مان ہی لینا پڑے گا کہ ضرور ’’ہندی‘‘ رائج کی جائے۔ چونکہ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ بچے کی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہی ہونا ضروری ہے، اگر ہم اس ’’ہندی‘‘ کو بچوں کے لیے نہ استعمال کریں تو اس ظلم کا نتیجہ کم علمی بلکہ جہالت کی صورت میں رونما ہوگا۔ نہ تو وہ اپنے صحیح جذبات کو ایک مصنوعی زبان کے ذریعہ سے ظاہر کرسکیں گے نہ ان کا کوئی لٹریچر بنے گا بلکہ وہ ایک نیم تر ہندستانی کی طرح کبھی بے محل فارسی الفاظ بول جائیں گے اور کبھی بے تکے سنسکرت محاورے۔

لیکن ’’ہندستان‘‘ میں جو بولیاں رائج ہیں، یعنی بولی جاتی ہیں اور لکھنے تک محدود نہیں ہیں، ان کی خالص ہندی صورتوں میں سے کھڑی بولی، اودھی اور پوربی ممتاز ہیں۔ یہ کھڑی بولی قدیم برج بھاشا کی نکھری ہوئی صورت ہے۔ اسی بھاشا میں پرتھوی راج کے درباری شاعر ’’چند‘‘ نے ’’پرتھوی رائے راسو‘‘ لکھی تھی۔ یہ زبان قنوج کے دربار کے اثر سے کافی ترقی کرچکی تھی گو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بکرماجیت کے وقت سے پرتھوی‌راج کے زمانے تک عوام کی کیا زبان تھی۔ بہر حال

شکل کو جو ایک ترقی یافتہ اودھی زبان ہے، کوئی ہندی کا ادیب اپنی تصنیفوں کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ ایک مصنوعی ہندی رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور ہزاروں نہیں، لاکھوں انسانوں کی مادری زبان کو دھرم اور قدامت‌پرستی کی قربان‌گاہ پر بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔

پدماوت کی تحریر کے چار سو برس بعد بھی دھلی اور روھیلکھنڈ تک کے لوگ اس سے لطف‌اندوز ہوتے تھے۔ لیکن اس درمیان میں اودھی بولی بہت کچھ بدل گئی تھی اور ادبی ذوق کو اس سے بحث نہیں تھی کہ زبان ہندی ہے، ریختہ ہے یا فارسی۔ اس لیے اس قدیم اودھی زبان سے زندہ تعلق قایم رکھنے کے لیے سنہ ۱۲۱۱ھ میں یہ قصہ دوبارہ زبان ریختہ میں کہا گیا۔ مقدمۂ "پدماوت ریختہ" کے ضروری اقتباسات یہ ہیں:—

"سبب تالیف۔ خاکسار بےمقدار سید غلام‌علی مشہدی متخلص‌به عشرت ساکن بریلی ابجد خوان دبستان مرزا علی‌لطف صاحب سلمہ‌اللہ‌تعالی (یہ اس وقت زندہ تھے) کہ ذات با برکات ان کی ذوق یاب شعر و شاعری کی کلام کرامت نظام مرزا رفیع‌السودا مرحوم مغفور سے ہے بلکہ شاگرد ان کے ہیں چند روز سے سنہ ۱۲۱۱ھ درمیان شہر رامپور کے کہ نام خاص اس شہر بلند اور بلدۂ ارجمند کا مصطفی‌آباد ہے۔۔۔۔۔۔ وارد تھا۔ کہ مولوی قدرت‌اللہ صاحب شوق نے فرمایا کہ۔۔۔۔۔۔۔میر ضیاءالدین نام متخلص‌به عبرت متوطن شاہجہان‌آباد، خوش باش قصبۂ رامپور ہمارے آشنا تھے اور رفقائے نجو خاں مرحوم کے انیس و جلیس تھے۔۔۔۔۔۔۔خان والا شان مرحوم کی خاطر سے (عبرت صاحب) اشعار فارسی و ہندی کے کہتے تھے۔۔۔۔۔۔ان کی فرمائش سے انھوں نے قصہ راجہ رتن‌سین اور پدماوت کا کہ زبان پوربی میں تصنیف مولانا ملک محمد جائسی کا ہے، زبان ریختہ میں تصنیف کرنا شروع کیا۔ (نصف کے قریب لکھا تھا کہ) عبرت کو مرض‌الموت ہوا اور ساتھ حسرت و غم نا تمامی اس داستان ندرت بیان کے دارالفنا سے دارالبقا کی طرف قدم رنجہ فرمایا۔۔۔۔۔۔ اور وہ صاحب فرمائش زبدۂ خوانین روزگار یعنی نجو خاں سپہ سالار بھی بیچ کارزار فرنگیان آتشبار کے رفاقت نواب غلام محمد خاں پسر نواب فیض‌اللہ مرحوم و مغفور میں، بنام آوری تمام کام آیا۔

مہربان من اب استدعا اور آرزو ہم مشتاقوں کی یہ ہے کہ بسبب فکر تمھاری کے یہ قصہ عجیب و غریب باقی‌ماندہ بیچ نظام آبدار کے آب وتاب انتظام کے پاوے"۔

اس آخری دور میں بھی ادبیات سے سپاہیوں تک کو دلچسپی تھی اور کمپنی بہادر کے گوئندوں کو ابھی ہندی اردو اور ہندو مسلمان، دین اور دھرم کا جھگڑا شروع کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ رامپور میں جو کسی حد تک اب بھی آزاد ہے اور مسلمانوں کی بستی ہے، کون مجبور کرسکتا تھا کہ پوربی زبان سے اتنی محبت کی‌جائے کہ اصل مع ترجمہ اردو شائع ہو اور پھر شاہان مغلیہ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اس کی "ریختہ" میں نظم بھی ہو۔ عبرت کو اس کا شبہ ہوا کہ بعض تنگ‌نظر اس قسم کی چیزوں کو کفر و اسلام کا جھگڑا بنا سکتے ہیں۔ کس خوش اسلوبی سے وہ اس کا جواب دیتا ہے:—

"سوال کرنا قلم نزاکت رقم سے واسطے تالیف اس قصۂ لطیف کے"

جو دیکھی اس کی میں نے رائے صائب　　کہا اپنے قلم سے ہو مخاطب
جہاں میں تجھ سے ہے اشراق ایجاد　　فلاطوں کا تو حکمت میں ہے استاد
یہی دل میں تاکہ میں ہوکر نوا ساز　　نکالوں پردۂ دل سے اک آواز
برائے خاطر یاران بےکیں　　لکھوں اک داستان شوخ و رنگیں
کروں خورشید ساں طبع آزمائی　　سیاہی کی بناؤں روشنائی
بدل شنگرف کے رنگ شفق ہو　　گلستاں کا نمونہ ہر ورق ہو
خموش الفاظ ہوں جوں غنچۂ گل　　معانی میں چھپا ہو شور بلبل
صلاحاً لیک، میں پوچھوں ہوں تجکو　　کہ کرتا ہوں بیان عشق ہندو
کہے کوئی کہ عبرت سا مسلماں　　ہوا ہے عشق کافر سے سخن داں
جواب معترض مجکو بتا دے　　مرے دل سے یہ شبہ تو مٹا دے

جواب تشفی مآب قلم کا

قلم بولا کہ اے سرمایۂ عقل — تو جس قصے کو چاہے کر وہی نقل
کہ عشق آزاد ہے کفر و دیں سے — نہیں کچھ کام اسے شک و یقیں سے
وہ ان دونوں ہی عالم سے ہے آزاد — کرے ہے کفر و دیں دونوں کو برباد
نہیں کچھ مانتا عشق ستمگار — کہ کیا تسبیح ہے اور کیا ہے زنار
مسلماں، کافر اس سے سب ہیں مجبور — حقیقت شیخ صنعاں کی ہے مشہور
ہلاک بلبل ہی کو رکھتا ہے غمناک — کرے ہے گل کے بھی سینہ کو صد چاک
کرے ہے روشن اپنا شعلہ جس دم — جلا دے شمع و پروانہ کو باہم
سنی اے قبلۂ امید عبرت — جناب عشق کی تو نے حقیقت
جہاں میں عشق کو جو رسم و دیں ہے — معاف حضرت شرع متیں ہے
کرے گا اعتراض اس میں جو بیجا — جناب عشق کا مردود ہوگا
قلم نے جب مجھے ڈھارس بندھایا — سخن کے گھر فراغت سے میں آیا

لیکن بدقسمتی سے اب وہ زمانہ آگیا یا یوں کہنا بہتر ہوگا کہ ارباب سیاست نے وہ حالت پیدا کردی ہے کہ گانے اور باجا، محرم و دسہرہ، تولاّ و تبرّا، آریہ اور سناتن، اردو ہندی، اشتراک و انفراد، جمہوریت و آمریت، اقرار و انکار کی وجہ سے اگر کوئی مسلمان وحدت وجود کے متعلق اس قسم کے اشعار کہے تو فوراً اسے کمیونسٹ فرض کرلیا جائےگا اور گو وہ نیم ملاؤں کے فتووں کی پروا نہ کرے اور اپنا اعتماد صاحب فصوص پر رکھے اور رومی و تبریزی کے دجلے کو گنگا کے ویدانت سے ملائے، لیکن سیاست کی خشک منطق کے سامنے ادبی لطافتوں کی کون پروا کرتا ہے، خواہ عبرت لاکھ کہے کہ:—

اسی اک ذات کی ہیں سینکڑوں شان — ہے جن کا مظہر کامل یہ انسان
ز دریا موج گوناگوں برآمد — ز بیچونی برنگ چوں برآمد

ہزاروں شان میں ہوکر وہ گزرا کبھی وامق بنا وہ گاہ عذرا
کہیں شمع شبستاں وہ کہایا کہیں پروانہ ہو دل کو جلایا
کہیں مثل پدم کہلایا بھوگی رتن بن کر ہوا گاہے وہ جوگی
نہ کعبے سے غرض نہ طالب دیر ہے مقصد اس کو اپنے جلوے کی سیر
خم وحدت کی مے کیے ہیں یہ سب جوش کہ کوئی ہوش میں ہے کوئی مدہوش
وہی دیر و حرم میں جلوہ گر ہے کہ ہر اک سنگ میں خفیہ شرر ہے
ہے اک شعلے سے اے شیخ و برہمن چراغ کعبہ و بتخانہ روشن
نمی‌دانم کہ دل یا دوست گویاست صدائے قلقل از مے یا ز میناست

اوپر کی عبارت سے صرف وحدت وجود ہی کا تذکرہ مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ آپ شاعر کی روانی بیان کو دیکھیں۔ یہی ایک ثبوت ہے کہ اردو زبان عام زبان ہوچکی تھی۔ تاہم جہاں عبرت نے پدماوت کا ترجمہ شروع کیا ہے وہ ترجمہ اگرچہ آزاد ہے لیکن ملک محمد کی روانی اور سلاست کو نہیں پہنچتا۔ ملک محمد کا بند جو پہلے دیا گیا ہے اس کا آزاد ترجمہ یہ کیا گیا ہے :-

قسم دیتی ہوں تجکو مجھ سے سچ بول تک اپنے دیدۂ انصاف کو کھول
کہ میرا حسن بہتر یا پدم کا بتادے فرق جو ہو بیش و کم کا
کہا رانی سے سن اے ناز پرور رہے نت چتر دولت تیرے سر پر
پدم کی بات سچ مت پوچھ مجھ سے کہ ہے وہ گل نہایت دور تجھ سے
اگرچہ تو بھی اک رشک پری ہے ترے ہر عضو میں جادوگری ہے
و لیکن اس پری رو کا کف پا ترے منہ سے کہیں دلچسپ ہے گا
جو دیکھے شکل تو اس دلربا کی نظر آوے تجھے قدرت خدا کی
نکل آوے جو خورشید جہاں تاب فروغ مہ اڑے مانند سیماب

مقابلۃً یہ نظم اس لیے زیادہ پھیکی معلوم ہوتی ہے کہ خود "اردو" اس ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں بدل چکی ہے اور ترجمہ کی وجہ سے سلاست زبان باقی نہیں رہی۔

بہر حال منشائے تحریر یہ ہے کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ترقی دیں تو اس

زبان یا بولی کو دہیں جو کسی خطۂ ملک میں عام طور پر بولی جاتی هے اور مرد عورت ' بچے بوڑھے اس میں اپنا اظہار خیال کرسکتے هوں۔ نه وه هندی ترقی کرسکتی هے جو بنارس کے پنڈتوں نے ایجاد کی هے نه وه اردو ملک کی زبان قراردی جاسکتی هے جو علمی رسالوں اور عربی آمیزی تک محدود هے ۔ سیدهی سادی لیکن ترقی‌یافته بامحاوره اور روزمره کی زبان خواه اسے هندی کهیے' ریخته کهیے یا اردو نام رکھیے ایک هی هے اور ایک هی هونی چاهیے۔

سوال هوگا که یه زبان کہاں بولی جاتی هے؟ اس کا جواب نہایت آسان هے که یه شمالی هندستان کے شہروں کی زبان هے اور کانگرس نے هندو مسلم اتحاد کو سامنے رکھ کر اسے نه هندی کہا هے نه اردو بلکه اس کا نام هندستانی قرار دیا هے اگرچه بعض کانگرسی حضرات اب تک اس لفظ کا اصلی مفہوم نہیں سمجھے اور بلاوجه ملک میں سیاسی گتھیوں کے ساتھ ایک ادبی گتھی پیدا کرنا چاهتے هیں ۔ کانگرس کا فرض هے که ماهرین "هندستانی" کی ایک کانفرنس کرنے کے بعد اس مسئله کو همیشه کے لیے واضح کردے تاکه غلط فهمی کی کوئی گنجائش نه رهے اور اس پس‌منظر کا بھی خیال رکھے جس کی وجه سے آسان اردو یعنی هندستانی پر حمله کیا گیا هے تاکه فیصله میں مندرجه ذیل باتوں کا خیال رهے:—

(۱) آسان اردو یا هندستانی شمالی هندستان کی زبان هے ۔ یه خصوصیت سے شہروں اور قصبات میں بولی جاتی هے اور گاؤں کے متمدن باشندے بھی اسے سمجھتے اور بولتے هیں۔ لیکن ان کی عورتوں اور بچوں کی زبان نہیں هے اس لیے یه گاؤں والوں کی مادری زبان نہیں هے۔

(۲) آسان هندی کوئی زبان نہیں هے۔ البته اگر آسان هندی سے یه منشا هے که وه بولیاں جو انباله سے بنگاله تک دیہاتوں میں بولی جاتی هیں اور بولنے والوں کی مادری بولیاں هیں تو هندستانی بولنے والوں کو بہت خوشی هوگی اگر ان میں سے کسی کو ترقی دےکر هندستانی سے قریب لایا جائے ۔ اس میں لٹریچر تیار هو اور عوام کو اسی بولی میں تعلیم دی جائے۔ ان بولیوں میں سے کھڑی بولی' اودھی'

پوربی اور بہاری مشہور ہیں اور راجستھانی شامل کی جاسکتی ہے ۔ ان زبانوں کی گرامر سادہ ہے ۔ ان میں تذکیر و تانیث کا جھگڑا بھی نہیں۔ مثلاً پوربی میں کہیں گے «مہرارو جات با۔ منئی جات با اس کی سنسکرت آمیز مصنوعی ہندی ہے: «استری جاتی ہے ۔ پرش جاتا ہے» اور اس کی ہندستانی ہے: «عورت جاتی ہے ۔ مرد (یا آدمی) جاتا ہے» ۔

(۳) چونکہ ہندستانی زبان میں فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے لفظ بالکل ہندستانی ہوگئے ہیں اور اپنی اصلی شکلوں کو بہت کچھ چھوڑ چکے ہیں اور اس میں سیکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو بین الصوبجاتی (Interprovincial) ہی نہیں بلکہ بین الملی (International) ہیں اس لیے اس زبان کو حق حاصل ہے کہ وہ شمالی ہند کی مختلف ہندیوں کو ملانے اور دوسرے صوبوں میں انگریزی کی جگہ لینے کی کوشش کرے اور ملک کی زبان کہلائے ۔

(۴) ہندستانی گرامر خود اپنے اصول رکھتی ہے ۔ یہ سنسکرت اور عربی کے اصول نہیں مان سکتی اس لیے کہ ان دونوں زبانوں میں تثنیہ (Dual) بھی ایک صیغہ ہے جو ہندستانی میں نہیں ۔ اس کے علاوہ تذکیر و تانیث بہت کچھ سماعی ہے اور جمع بنانے کے قاعدے بالکل نرالے ہیں ۔ فارسی گرامر بھی ہندستانی کے لیے موزوں نہیں ہوسکتی ۔ پوربی یا بنگالی کی طرح فارسی میں افعال کے اندر تذکیر و تانیث نہیں لیکن ہندستانی میں ہے ، اس لیے ہندستانی گرامر کے اصول منضبط ہوجائیں تو بہتر ہے ۔ ان اصول کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اس زبان کی ساخت انوکھی ہے یعنی اگرچہ کچھ کچھ شمالی ہندستان کی ہندیوں سے ملتی ہے، لیکن بعض افعال و روابط اس زبان کے لیے مخصوص ہیں ۔

(۵) ہندستانی زبان کے لیے تین رسم‌خط مانے جائیں ۔ اردو ، ناگری اور لاطینی ۔ اور ہر صوبے میں سرکاری کاغذات وغیرہ کے علاوہ جتنی تعلیمات کے سلسلے کی کتابیں ہوں وہ سب ان تینوں خطوں میں شائع کی جائیں لیکن سب کی زبان ایک ہی ہو ۔

(٦) ایک ایسے مرکزی ادارے کی ضرورت ہے جو ہندستانی زبان کا معیار مقرر

کرے اور مختلف صوبوں کی سرکاری یا نیم سرکاری مطبوعات کی نگرانی کرے اور اگر کسی چیز کو اصلی معیار کی بجائے افراط یا تفریط کی طرف مائل دیکھے تو بازپرس کرسکے۔

(۲) ایک ایسے ادارے کا قیام ہو جو زیادہ سے زیادہ تین ہزار لفظوں میں ہندستانی زبان کے ذخیرہ کو محدود کرانے کے علاوہ ان کے ذریعے سے دوسرے صوبوں اور غیر ممالک کے لوگوں کو ہندستانی لٹریچر پہنچا سکے۔ عام آدمی کو اپنے کاروبار کے لیے ایک ہزار سے دو ہزار تک الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے اور سائنس و ادب کی ایک ہزار اصطلاحیں شامل کرلی جائیں تو ہر قسم کا علمی و ادبی کام ہونا کچھ مشکل نہیں۔ اس ڈکشنری کے ساتھ ایک آسان گرامر مرتب کرنے کا کام بھی اسی ادارے سے متعلق ہونا چاہیے۔ راقم الحروف نے انفرادی طور پر اس کام کو شروع کردیا ہے۔

فرقہ پرستی کا خطرہ

بدقسمتی سے گزشتہ پچاس سال سے فرقہ پروری کے جراثیم کو نہ صرف ترقی ہورہی ہے بلکہ وہ حضرات بھی جو قدامت پروری کی طرف مائل ہیں عوام کی رائے کے دھارے میں بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ جس طرح ابتدا میں فارسی کے خلاف آواز اٹھوائی گئی اور اس کی جگہ انگریزی رائج کی گئی اور جو لوگ انگریزی تعلیم و تمدن کے مخالف تھے انھیں ٹوڈی اور قدامت پرست کہہ کر خاموش کردیا گیا اور اس کے بعد جب اردو رائج ہوئی تو اس کو یہ کہہ کر نکلوایا کہ اس کا رسم‌خط مشکل ہے اور اس صدائے بے‌ہنگام میں ڈاکٹر فیلن (صاحب لغت)، سر ولیم جونز، پروفیسر مونیر ولیمز کے ساتھ اخبار آرین، راجہ شیو پرشاد، پنڈت متھرا پرشاد مصرا وغیرہ شامل ہوگئے اور مسٹر فریڈرک پنکوٹ (Mr. F. Pincott, M.R.A.S.) نے یہ طے کردیا کہ اصلی مسئلہ زبان کا نہیں بلکہ ابجد کا ہے، "The real language question is one of alphabets." لیکن بہت ممکن ہے

کہ اب ناگری رسم‌خط جاری هونے کے بعد هندستانی زبان کو بھی بدلنے کی کوشش کی جائے۔ یہ خطرہ ایک حد تک حق بجانب هے اس لیے کہ اب جو زبان ایجاد کی جارهی هے اس میں سے چن چن کر نہ صرف فارسی عربی کے هندستانی لفظوں اور محاوروں کو نکالا جارها هے بلکہ یہ ظلم هورها هے کہ خالص سنسکرت سے نکلے هوئے هندستانی لفظوں کو پھر مخرج کی طرف واپس کیا جارها هے۔ لیکن جب یہ مسئلہ اٹھایا گیا تھا اس وقت صرف یہ خیال تھا کہ هندستانی زبان سے ایسے الفاظ نکال دیے جائیں جو عوام میں رائج نہیں خواہ وہ کسی زبان کے هوں۔ بابو هریش چندر بنارسی نے ایجوکیشن کمیشن سنہ ۱۸۸۲ع کے سامنے جو بیان دیا تھا وہ ذرا دلچسپ هے وہ کہتے هیں :-

"هم (اردو حرفوں کے ذریعے سے) هزاروں مختلف لفظ بنا سکتے هیں۔ خدا همیں ایسے حرفوں سے بچائے.........

دفتروں میں فارسی حرفوں کا استعمال نہ صرف هندوؤں پر ظلم هے بلکہ هر امپیریل مجسٹی (ملکہ وکٹوریہ) کی وفادار رعایا کی کثیر تعداد کے لیے الجھن اور مشکل کا سبب هے.............

مجھے افسوس هے کہ آنریبل سید احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ نے اپنی شہادت کے سلسلے میں فرمایا هے کہ اردو شرفا کی زبان هے اور هندی دیہاتی بولی هے۔ یہ بیان نہ صرف غلط هے بلکہ هندوؤں کے ساتھ نا انصافی هے.... ... بیرونی لفظوں نے هماری خالص هندی کو برباد کردیا هے۔

Babu Harish Chandra of Benares says:—

"We can have a thousand new pronunciations. May God save us from such letters...........

The use of Persian letters in offices is not only an injustice to Hindus, but it is a cause of annoyance and inconvenience to the majority of the loyal subjects of Her Imperial Majesty....... ....

I am sorry to learn that the Honourable Sayyid Ahmad Khan Bahadur, C.S.I., in his evidence before the Education Commission says that Urdu is the language of the gentry and Hindi that of the vulgar. The statement is not only incorrect, but unjust to the Hindus.

"This interposition of foreign words has spoiled true Hindi. Hindi by itself without much

هندی بغیر غیر ملکی مدد کے ہمارا کام نکال سکتی ہے۔ ... میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ سب فارسی الفاظ ہماری بولی سے نکال دیئے جائیں۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ کون ہے جو ایسے لفظوں کو نکال سکتا ہے جیسے: مطلب، عدالت، حاضر، جہاز، وزیر، بادشاہ، جمع خرچ، نیک نیت، صاحب وغیرہ ... ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ زبان رائج ہو جو خالص اور آسان عوام کی بولی ہو اور ایسے خط میں لکھی جائے جس سے (وفادار) رعایا کی اکثریت مانوس ہو ہاں، سائنس کی کتابوں کے لیے مجبوری ہے کہ ہماری بولی میں مترادفات نہیں ملتے اور ہمیں اصطلاحیں (فارسی؟) استعمال کرنی پڑتی ہیں۔

(رپورٹ صفحہ ۲۰۰-۲۰۲)

foreign aid can easily answer our purpose............ ....

I do not mean to say that all Persian words should be banished from our vernacular. This is beyond our power. Who can dispense with the words 'matlab', 'adalat', 'hazar', 'Jahaz', 'wazir', 'badshah', 'jama kharach', 'nekniyat', 'sahib'.. ....

We want the pure simple vernacular understood by the public and written in character familiar to the majority.

In books of science, of course, we are compelled to use technicalities for which we can not find equivalents in the vernacular."

(see Report of the Education Commission 1882.)

بے شک آپ آسان هندستانی کے حامی معلوم ہوتے ہیں اور ان فارسی کے لفظوں کو نکالنا ناممکن تصور کرتے ہیں جو هندستانی میں گھل مل گئے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم تھا کہ ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ اسمائے نکرہ نہیں بلکہ معرفہ اور علم (Proper Names) بھی بدلے جا سکیں گے اور هندستان کو بھارت ورش، برار کو ودھرب، هندستانی سی پی کو مہا کوشل، آگرہ و اودھ کو جُٹ پرانت کہہ سکیں گے اور نیشنل ادارے بھی منہ تکا کریں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ وزیر بادشاہ وغیرہ کو کون بدلے گا؟ اول تو اس قسم کے انسان اب قصۂ پارینہ ہوگئے ہیں لیکن ہماری

ملکی آزادی طلب کرنے والی جماعت نے جسے عربی میں حزب‌الوطنیہ کہہ سکتے ہیں اور جسے " ہندستانی " کے ہمدردوں نے " راشٹریہ مہاسبھا " کے نام شدہ کیا ہے، اپنی تحریروں اور اعلانوں میں بھی " کانگرس " یا " نیشنل کانگرس " کا لفظ چھوڑ دیا ہے اگرچہ ہندستان کا بچہ بچہ اس لفظ سے آشنا ہے۔ اس جماعت نے چند افراد کو سکریٹری کے نام سے موسوم کیا تھا جو پریسیڈنٹ کے لیے منشی یا کاتب کا کام انجام دیتا ہے۔ لہذا ان غیر ملکی لفظوں کی جگہ پریسیڈنٹ یا صدر کو تو سبھاپتی بنادیا گیا اور سکریٹری کو وزیر فرض کرکے " منتری " کا لقب عطا ہوا۔ صاحب کی بجائے شریمان یا شری‌جت آ گئے۔ جمع خرچ جوڑ تکاس بن گیا۔ غرضکہ بہت کچھ ہوا اور ہونے والا ہے اور سب نیشنلزم اور حریت‌پسندی اور ترقی کے نام پر ہو رہا ہے۔ لیکن ابتدا صرف اسی سے کی گئی کہ ناگری رسم‌خط ہندوؤں کی اکثریت کا رسم‌خط ہے اور زبان ایک ہی ہے جسے آسان ہندستانی کہہ سکتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۰ ع لفٹنٹ گورنر مکڈانلڈ نے یوپی میں ناگری رسم خط کو جاری کیا اس سے بہت پہلے یہ ہندو مسلم مسئلہ بنایا جاچکا تھا اور ہندو اپنی وفاداری کے صدقے میں وہابی اور جہادی خیال کے مسلمانوں کے رسم‌خط کو نکلوانا چاہتے تھے۔ گورنمنٹ کے اشارے سے یوپی کے بااثر مسلمان ہندستانی زبان کے لیے احتجاج کرنے سے روک دیے گئے تھے۔ اس وقت جو فضا پیدا ہوگئی تھی وہ ذیل کی دو نظموں سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نظمیں ناگری رسم‌خط میں پنڈت آر۔ ان۔ ترپاٹھی جی نے ایک نظموں کی کتاب میں جس کا نام "کویتا کومدی" ہے شائع کردی ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب بچوں اور طالب‌علموں کے لیے لکھی گئی ہے اور مسلسل اس زہر کو قائم رکھنے میں امداد دیتی ہے جو آج سے پچاس سال پہلے ہندستان کی مشترکہ قومیت کو مٹانے کے لیے پھیلایا گیا تھا۔ اردو کی اپیل اودھ پنچ لکھنؤ میں ۱۷ مئی سنہ ۱۹۰۰ع کے پرچے میں شائع ہوئی تھی:—

اردو کی اپیل

خدایا بڑی ہی افتاد ہے　　بڑے لاٹ صاحب سے فریاد ہے
مجھے اب کسی کا سہارا نہیں　　یہ بے وقت مرنا گوارا نہیں
مرا حال بھر خدا دیکھیے　　ذرا میرا نشو و نما دیکھیے
میں شاہوں کی گودی کی پالی ہوئی　　مری ہمسائے یوں پائمالی ہوئی
نئے زمانے پھرتی ہے ماؤلی　　خدایا میں دلی کی تھی لاڈلی
ادائیں بلا کی ستم کا جمال　　وہ سج دھج قیامت، وہ آفت کی چال
مرے عشق کا روگ بھرتے تھے دم　　نہیں جھوٹ کہتی، خدا کی قسم
یہ آفت لڑکپن میں آنے کو تھی　　جوانی ابھی سر اٹھانے کو تھی
اٹھائے تھے بچے کچھ ابھی ہاتھ پاؤں　　چمک پھیلتی جاتی تھی گاؤں گاؤں
کہ غیبی طمانچہ سے منہ پھر گیا　　مہ چاردہ ابر میں گھر گیا
مری گفتگو اور ہندی کا حرف　　وہ شعلہ فشانی، یہ دریائے برف
اس انداز پر دل ہوا لوٹ پوٹ　　دولائی میں اطلس کی، گاڑھے کی گوٹ
خدایا نہ کیوں مجھکو موت آ گئی　　کہاں سے مرے سر یہ سوت آ گئی
نہ جھومر نہ جھمکا نہ بالے رہے　　نہ گیسو مرے کالے کالے رہے
نہ اطلس کا پاجامہ کلیوں بھرا　　دوپٹہ گلابی مرا کیا ہوا!
نہ سرمہ نہ مسی نہ مہندی کا رنگ　　عجب تیری قدرت عجب تیرے ڈھنگ
نہ بیلے کی بدّھی نہ اب ہار ہے　　نہ جگنو گلے میں طرحدار ہے
نہ جھانجوں کی جھن جھن، کڑوں کا نہ شور　　دوپٹے کی کھسکن نہ محرم کا زور
وہ بانکی ادائیں وہ ترچھے چلن　　قفیرڑا ہوا، ہوگیا سب ہرن (؟)
بس اب کیا رہا، کیا رہا، کیا رہا　　فقط ایک دم آنا جانا رہا

یہ سودا بہت ہم کو مہنگا دیا — کہ خلعت میں حاکم نے لہنگا دیا
انگوچھوں کی اب تم پھبن دیکھنا — کھلی دھوتیوں کا چلن دیکھنا
وہ سیندور بالوں میں ایسی جٹی — کہ ہے پارک میں جیسے سرخی کٹی
(وغیرہ)

اس کا جواب "بھارت متر" اخبار میں مسٹر بال مکند گپتا نے اس طرح دیا تھا:

اردو کو اُتّر (یعنی جواب)

نہ بی بی بہت جی میں گھبرائیے — سنبھلیے ذرا ہوش میں آئیے
کہو کیا پڑی تم پہ افتاد ہے — سناؤ مجھے کیسی فریاد ہے
کسی نے تمھارا بگاڑا ہے کیا؟ — سنوں حال میں بھی تو اس کا ذرا
نہ اُلٹی میں یوں موت کا نام لو — کہاں سوت؟ مت سوت کا نام لو
بہت تم یہ ہیں مرنے والے یہاں — تمھاری ہے مرنے کی باری کہاں
بہت بہکی بہکی نہ باتیں کرو — نہ سایے سے تم آپ اپنے ڈرو
ذرا منہ پہ پانی کے چھینٹے لگاؤ — یہ سب رات بھر کی خماری مٹاؤ
تمھاری ہی ہے ہند میں سب کو چاہ — تمھارے ہی ہاتھوں ہے سب کا نباہ
تمھارا ہی سب آج بھرتے ہیں دم — یہ سچ ہے تمھارے ہی سر کی قسم
تمھاری ہی خاطر ہیں چھتیس بھوگ — کہ لٹو ہیں تم پر زمانے کے لوگ
جو ہیں چاہتے، ان سے ریجھو رجھاؤ — کوئی کچھ جو بینڈی کہے، سو سناؤ
وہی پہنو جو کچھ ہو تم کو پسند — کسو اور بھی چست محرم کے بند
کرو اور کلیوں کا پاجامہ چست — وہ دھانی دوپٹہ وہ ٹِک ٹِک درست
وہ دانتوں پہ مسی گھڑی پر گھڑی — رہے آنکھ آئینہ ہی سے لڑی
کڑے سے کڑے کو بجاتی پھرو — وہ بانکی ادائیں دکھاتی چلو
مگر اتنا جی میں رکھو اپنے دھیان — وہ بازاری پوشاک ہے میری جان
چنا تھا تمھیں ماں نے بازار میں — پلی شاہ عالم کے دربار میں

ملی تم کو سرکاری پوشاک بھی — وہ بھی دوغلے کاٹ کی فارسی

وہ بھی اور بھی دیکھو چھنتی چلی — وضع روز اس کی بدلتی چلی

وہی تم کو پوشاک بھاتی ہے اب — نہیں اور کوئی سہاتی ہے اب

مگر ایک سن لو مطلب کی بات — نہ پچھلا وہ دن ہے نہ پچھلی وہ رات

یہ ہے ظاہر تم نہ سرکار کے — تم آئی ہو انگریزی دربار میں

ہے اب چھوڑنے شوق بازار کا — ادب کیجیے کچھ تو دربار کا

ادب کی جگہ ہے یہ دربار ہے — کچہری یہ کچھ ہے نہ بازار ہے

یہاں آئی ہو آنکھ نیچی کرو — مٹکنے چمکنے پہ مت اب مرو

(یہاں تین شعر ترک کر دیے گئے ہیں)

یہ سرکار نے دی ہے جو ساگری — اسے تم نہ سمجھو نری گھاگری

تمہاری یہ ہرگز نہیں سوت ہے — یہ حق میں تمہارے کبھی موت ہے

سمجھ لو ادب کی یہ پوشاک ہے — حیا اور عزت کی یہ ناک ہے

ادب اور حرمت کی چادر ہے یہ — چڑھو گود میں مثل مادر ہے یہ

یہی آپ کی ماں کی پوشاک تھی — یہ آزاد سے پوچھنا تم کبھی

عنایت ہے تم پر یہ سرکار کی — تمہیں دوسری اس نے پوشاک دی

برائی نہ اس کی کرو دوبدو — بڑھانے کی ہر دم یہی آبرو

پرائی بھی ہے وہ تمہارے ہی پاس — اسے بھی پہن کر رہو بے ہراس

کرو شکریہ جی سے سرکار کا — کہ اس نے سکھائی ہے تم کو حیا

مندرجہ بالا عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ کچھ لوگ مشترکہ قومیت و تمدن کے مخالف ہی نہیں بلکہ دشمن ہیں اور ان کے اقوال کا اندازہ افعال سے ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں فرقہ پرستی کا خطرہ اگر ہو تو بیجا نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بعض ناسمجھ افراد ایسی باتیں کرتے ہیں، جمہور کا نہ تو غیر ملکی تمدن و علم سے بیر ہے، نہ اس سے ان کا نقصان ہے، لہذا ایسی تحریکیں چند دن میں خود مردہ ہوجائیں گی اور جس طرح مسلمانوں نے "خذ ما صفا" اور "دع ما کدر" پر عمل کرتے ہوئے جس

جھکہ گئے وہاں کا تمدن و علم اپنے اندر جذب کرلیا' اسی طرح باوجود ذاتوں کی کشمکش اور مذہب کی تنگیوں کے ہندوؤں میں بھی جو جماعتیں میدان علم و عمل میں آگے ہیں وہ اسلام کی اخوت و مساوات و حریت' اور یورپ کی علمی ترقیوں کی دلدادہ ہیں اور باوجود شاستروں کی ممانعت کے پنڈت مدن موہن مالوی جی نے سمندر پار کرنے کا راستہ کھول دیا ہے اور صرف محبت وطن کی وجہ سے خاک پریاگ و گنگا جل کو ٹیمز کو بہتر کرنے کے لیے اپنے ساتھ رکھا تھا - اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ شاہ دہلی کا نمکخوار قدیم راجہ رام موہن رائے سمندر عبور کرنے کے جرم میں ذات باہر ہو - اب تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ ہندیوں کی کثیر تعداد نہ صرف یورپین تمدن و علم کی پرستش کرتی ہے بلکہ اس سے مرعوب ہوکر اپنے خالص ہندستانی تمدن کو غیر ملکی قرار دے رہی ہے اور فارسی عربی یا انگریزی سے نفرت کی صدائیں صرف ایسی جماعت کی طرف سے اٹھ رہی ہیں جو ہندستان کو صدیوں پیچھے لے جانے اور گھڑی کے ادھیڑ کر سینے کی سعی لاحاصل کرنا چاہتی ہے -

یہ سچ ہے اور بالکل سچ ہے کہ بعض افراد یا جماعتیں جھوٹے جوش میں ترقی معکوس کا نام ترقی سمجھتی ہیں - لیکن ہندستانیوں کو متفقہ طور پر ان کی بےمعنی کوششوں کو پنپنے نہ دینا چاہیے اور صاف دلی کے ساتھ اپنے خطرات کا اظہار کرنے کے بعد ایک صحیح مسلک اختیار کرلینا چاہیے - زبان کا مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ چند افراد اپنی ذاتی مصلحتوں کو پوری قوم اور ملک پر عاید کریں -

چند سال ہوئے جب " ہندستانی اکیڈیمی " الہ‌آباد کے بعض ہمدردوں نے ہندی اردو کو الگ ہوتے ہوئے دیکھ کر ایک مشترک زبان کی پرورش پر زور دیا تھا' تو ہندی ڈپارٹمنٹ الہ‌آباد یونیورسٹی کے بعض استادوں کو یہ چیز پسند نہیں آئی اور " ہندستانی اکیڈیمی " کے آئین کا حوالہ دےکر یہ بتایا گیا کہ اس اکیڈیمی کا قیام ہی اس غرض سے ہوا ہے کہ ہندی اور اردو الگ الگ ترقی کریں اور اپنی اپنی راہیں علیحدہ علیحدہ بنائیں - اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب بنگال کے بعض اہل علم نے اس مصنوعی ہندی پر نظر ڈالی جو الہ‌آباد و بنارس کی یونیورسٹیوں میں داخل ہے تو

صحیح طور پر اس نتیجه پر پہونچے که پدماوت اور رامائن کی زبانیں اتنی قدیم هیں که اب ان بولیوں کو کوئی شخص اودھ یا پورب میں نہیں بولتا۔ باوجود اس کے یه ایم-اے کے کورس میں داخل هیں ۔ اسی طرح دوحة الابصار یا نوطرز مرصع کی زبان اس دور کی هے جب اردو میں هزاروں متروکات داخل تھے، لیکن پھر بھی یه کتابیں الهآباد کے ایم-اے کے طلبه کے مطالعه کے لیے ضروری سمجھی گئی هیں - ان باتوں پر غور کرنے کے بعد بجا طور پر اهل بنگال نے یه صدائے با هنگام بلند کی که ایسی تنگی اور غیر ترقی یافته زبانوں کو بنگال پر عاید کرنا بنگالی زبان پر سراسر ظلم هے - هندستانی کو نہیں بلکه بنگالی کو "راشٹربه بھاشا" هونا چاهیے - اب بتائیے که مصنوعی هندی اور مشکل اردو کے "نخل آرزو" کی جڑ کٹ گئی یا بچی؟

اس میں شک نہیں که بنگالی هندی هندستان کی دوسری هندیوں کے مقابله میں بہت زیادہ ترقی یافته هے - اس کا لٹریچر ادبیات فرنگ کی پوری دل آویزیوں کے ساتھ سنسکرت کے دامن سے زیادہ وابسته هے - ٹیگور اور نذرالاسلام نے اسے عوام کی بولی سے زیادہ قریب کردیا هے اور اسی لیے اس میں جان هے اور ایسی جان جو بنگال کے بچے بچے کو میدان عمل میں سرگرم بناسکتی هے - اگر نیچر کی مہربانیوں نے اسے دوسرے صوبوں سے بے نیاز نه کیا هوتا اور موسم کی لطافت نے قوائے جسمانی کو نزاکت کی طرف مائل نه کردیا هوتا تو یقیناً بنگال کو اپنی وحدت لسانی کے بل بوتے پر هندستان کی قیادت کا فخر حاصل هوتا - یقیناً مسٹر هیرندر ناتھ دت کا یه خیال درست هے که کسی مصنوعی زبان کو ترقی دینے سے یه بہتر هے که بنگالی زبان کو راشٹربه بھاشا قرار دیا جائے - (دیکھیے تجویز بنگال ساهتیه پرشد کانفرنس - اخبار هندستان سٹینڈرڈ ۳ فروری سنه ۱۹۳۹ع) - لیکن اسی بنگال ساهتیه سمیلن کے جلسه منعقده کوملا میں ۸ اپریل کو کانفرنس کے صدر ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے یه تسلیم کرلیا که بنگالی راشٹربه بھاشا نہیں هوسکتی - البته هندی یا هندستانی کا بنگال پر عائد کرنا "زبردستی" هے - ان کی رائے میں انگریزی هی هندستان کی انٹرپراونشل زبان هوسکتی هے -

غرض کہ ہماری مشترک زبان بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی زبان مشترک زبان تسلیم کرلی جائے ۔ وہ کھڑی ہندی ہو یا پوربی، بنگالی ہو یا آسان اردو، کوئی زبان ہو لیکن اس میں صلاحیت ہو کہ وہ انٹر پراونشل زبان ہی نہیں بلکہ وقت آنے پر انٹرنیشنل زبان بن سکے ۔ اس کے لیے شرط اولین یہ ہے کہ وہ ہندستان کے کسی خطے کی بول چال کی زبان ہو اور اس میں کچھ نہ کچھ لٹریچر بھی موجود ہو ۔ بنگالی زبان سنسکرت کی طرف زیادہ مائل ہے، پنجابی اور پشتو میں فارسیت غالب ہے لہذا اگر کوئی زبان انٹر پراونشل ہوسکتی ہے تو وہ صوبہ آگرہ و اودھ کی ترقی‌یافتہ بولی ہی ہوسکتی ہے خواہ وہ کھڑی بولی پر کھڑی ہو، اودھی پر ہو یا پوربی پر ۔ ہمیں عام اصطلاحات کے لیے انگریزی، فارسی، سنسکرت کی مروجہ اصطلاحوں کو خارج نہ کرنا چاہیے بلکہ حسب ضرورت ان زبانوں سے مدد لینی چاہیے ۔ اگر ہم مختلف بولیوں کے چند بنیادی لفظوں کا مقابلہ کریں تو ہمیں آسانی سے معلوم ہو جائےگا کہ جس زبان میں ہندستان کی مشترک زبان بننے کی صلاحیت ہے وہ شمالی ہندستان کے شہروں کی زبان ہے ۔

نیچے کے نقشے میں چند ایسے ضروری لفظوں کا مقابلہ کیا گیا ہے جن کے بغیر کسی بچے کو بھی چارہ نہیں ۔ فہرست بہت مختصر ہے لیکن نتیجہ نکالنے کے لیے کافی ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ذہن‌نشین رکھیے کہ افعال (Verbs) کی صورتیں ہر بولی میں مختلف ہیں، اگر یکسانیت ہے تو صرف اس شہری بولی میں جو شمالی ہندستان کے شہروں میں رائج ہے، اور اردو رسم خط میں زیادہ واضح طور پر لکھی جاتی ہے ۔ اُسے ناگری، بنگالی یا انگریزی رسم‌خط میں بھی لکھ سکتے ہیں ۔

مختلف ہندیوں کا ہندستانی زبان سے مقابلہ

زبان	Mother	Hand	Water	Bread	House	Cow	Matches	Shirt	Sleep	Good	Where	Marriage
پشتو	مور	لاس	اوبه	ڈوڈئی	کور	غوا	ابی	جامئے	خوب	خوه	چرته	واده
پنجابی	ما	ہتھ	پانڑی	ٹکر	گھر	گاں	ڈبی	کمیز	نیندر	چنگا	کدھے	ویاه
برج یا کھڑی بولی	مائی	ہاتھ	پانی	روٹی	گھر	گؤ	دیاسلائی	کرتہ	نیند	بھلو	کہاں	بیاہ
اودھی	مہتاری	ہتھوا	پنی	روٹی چپاتی	گھر	گئی	آگی کاڑی	انگا شلوکا	نیندس	نیک بھلا	کے کیت	گون بیاہ
پوربی	آیا	ہانت	پنیوا	پرتھنی	"	گئو	دیاسلائی	شلوکا کرتہ	اونگھائی جھوپائی	بھل نیک	کہتے ٹھین	بیاؤ
بہاری	مانا متاری	ہتوا	پانی	روٹی	گھر	گئو	مچس	فتوہی کرتا	ونگھائی	نیمن	کہاں	بیاہ
بنگالی	ما	ہات	جول	رُٹی	باڑی باشا	گورو گائے	دےسلئی	پنجابی	گھوم	بھلو	کوتائے	بیائے
آسامی	آما	ہاتھ	پانی	روٹی	گھر	گائے گورو	مچس	دورا	سوتنو	رامرو	کتا	بیاہ لگن

زبان	Mother	Hand	Water	Bread	House	Cow	Matches	Shirt	Sleep	Good	Where	Marriage
اڑیہ	ماں	هاتو	پاڑیں	رٹی	کھورو	کورو	دیاس لئی	لُگا کمیجو	نِدو	بھولو	کواڑے	بیاہ
تامل	آما	کےیی	تنّی	روٹی	ووڑو	آؤ	نرپ پیٹی	چونائی	تونو	نَے	ایکے	وِواھوں
تلنگی	امّا	چےای	نی:و	رٹائی	الّو	آوو	اگی پٹائی	کمیرو	ندرا	منچی	اکاڑا	پینڑی
مرہٹی	ائی	هاتھ	پیر	باکھری	چھاپرا	کاؤری	کاڈی	کمیج	جھوپے	چانگلا اُتم	کُٹھے	لگنا
گجراتی	منی با	هاتھ	پانڑیں	روٹڑا	نیر	کائے	پٹی دیوا سڑی	کھامیس	هوؤ سوؤ	سارو	کیاں	لگن
سنسکرت	ماتری	هستو	باری	گودھم پشٹک	گری ها	گو	*	*	ندرا	اُتم	کُترا	بیاہ
ہندستانی	ماں	هاتھ	پانی	روٹی	گھر	گائے	دیاسلائی ماچس	قمیص کُرتا	نیند	اچھا	کہاں	شادی بیاہ

اوپر کے نقشے سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں: اول یہ کہ صرف کھڑی بولی، اودھی اور پوربی بولیاں ہندستانی زبان سے بہت ہی قریب ہیں۔ دوسرے یہ کہ سنسکرت نہ صرف ہندستانی سے بہت دور ہے بلکہ اس میں ضروریات تمدن کی ان چیزوں کے نام نہیں ہیں جو اس زمانے میں موجود نہ تھیں' نہ ہونا چاہیے۔ مثلاً ہم آج سے پہلے کے تمدن میں ریل، انجن، ریڈیو وغیرہ کے لیے الفاظ تلاش کریں تو سخت ناکامی ہوگی۔ اس لیے سنسکرت میں دیاسلائی یا ماچس کے لیے کوئی لفظ نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ کرتا یا قمیض بھی اس زمانے میں رائج نہ تھا۔ اس لیے ایسی اور اس کے متعلقات کے لیے بھی الفاظ کا تلاش کرنا عبث ہے۔ وہ تو اتنا سادہ تمدن تھا کہ دیا بھی شاید ایجاد نہیں ہوا تھا۔ غالباً مٹی کی ہانڈیوں میں کھانا پک جاتا تھا۔ یا سب سے زیادہ اہم خوراک دودھ گھی اور پھل تھے۔ اسی لیے روٹی کے لیے سنسکرت میں کوئی لفظ نہیں۔ اسے گون دھم (گندم) سے بنے ہوئے لپشٹک (کھانے) کا نام دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ گیہوں کا دلیا ہو جو گیہوں پیس کر گائے کے دودھ میں پکا لیتے ہیں۔ کاش ہماری زندگی پھر اتنی ہی سادہ اور بیچری ہوسکے اور موجودہ تجارتی غلامی سے ہمیں بھی نجات ملے تاکہ دوسرے ملک بھی جو ہماری وجہ سے غلام ہیں انھیں بھی سانس لینے کا موقع ملے۔ تیسرے یہ کہ چند الفاظ ہندی بولیوں میں ایسے ہیں جو سنسکرت سے بہت دور ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں فارسی سنسکرت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً (ماتری ۔ مادر) (ہستو ۔ دست) (باری ۔ بارش) (گوندھم ۔ گندم) (گو ۔ گاو) (کت را ۔ کجا)۔ ان لفظوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی چونکہ زندہ زبان ہے اس لیے اس نے سنسکرت الفاظ کو ترقی دے کر زیادہ سڈول اور قابل تلفظ بنادیا ہے۔ اس میں موجودہ تمدن کی ضروریات کے لیے بھی کافی لفظ ہیں اور بجائے سنسکرت کے فارسی کو اگر امدادی زبان یا پوشک بھاشا بنایا جائے تو زیادہ مناسب ہو۔

اب ذرا ایک اور نقشہ ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ ہندستانی زبان میں کس طرح ہندو اور مسلمانوں کا تمدن ممزوج ہوا ہے۔ یہ دنوں کے نام ہیں جو

سوائے ایک جمعہ کے لفظ کے کسی اسلامی ملک میں رائج نہیں - اس کے علاوہ سوائے اتوار کے ہر لفظ کے ساتھ وار یا بار کا لفظ بھی ہندستانی سے خارج کردیا گیا ہے اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ترقی کرنے والی زبانوں کے عام قاعدے کے مطابق غیر ضروری اور بوجھل چیزوں کو صرف ہندستانی زبان نے چھوڑا ہے - ذیل میں صرف چند ہندی زبانوں کا ہندستانی سے مقابلہ کیا گیا ہے -

ہفتہ کے دنوں کے نام

سیاروں کے نام پر	سورج کا دن	چاند کا دن	منگل کا دن	بدھ کا دن	برہسپت کا دن	شُکر کا دن	سنیچر کا دن
عربی	یوم الاحد پہلا دن	یوم الاثنین دوسرا دن	یوم الثلاثاء تیسرا دن	یوم الاربعاء چوتھا دن	یوم الخمیس پانچواں دن	یوم الجمعہ	یومُ السبّت (سبت کا دن)
فارسی	یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنج شنبہ	آدینہ	شنبہ
پشتو	دہ اتبار اُرز	دہ گل اُرز دہ پیر ارز	دہ نہی اُرز	دہ شورو دہ بدہ	زیارت یادہ زیارت اُرز	دہ جمے اُرز	دہ خالی اُرز
پنجابی	ایت وار	سوم وار	منگل وار	بدھ وار	برھسپت وار	سُکّر وار جمعہ	سنیچر وار، بار
گجراتی	روی وار	چھوم وار	منگر وار	بدھ وار	گرو وار	سُکّر وار	سنی وار
بنگالی	روبی بار	سوم بار	منگل بار	بُدھ بار	لکھی بار	شُکّر بار	سونی وار
ہندستانی	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر

ہفتے کے دنوں کے ناموں کے مقابلے سے یہ چیز صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ ہندستانی اور یورپین زبانوں کے نام اجرام فلکی کے ناموں پر ہیں۔ یورپ کے بعض نام اس قدیم دیوتا پرستی کی یادگار ہیں جب وہ ان خاص دنوں میں بعض دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ عرب اور ایران میں بھی ایسے ہی نام رائج تھے۔ اسلام نے اس توہم پرستی کو ختم کردیا اور ہفتہ کو سات ہی دن کا باقی رکھا اور اتوار کو پہلا دن قرار دیا۔ اس طرح عربی میں یوم الاحد اور فارسی میں اس کا ترجمہ یکشنبہ ہوگیا۔ جو مسلمان بندے ماترم یا مہابھارت اور رامائن کی اساطیر میں بت پرستی پاتے ہیں انھیں حیرت ہوگی کہ ہندستان میں اکبر کے وقت سے مہینوں اور دنوں کے فصلی اور ہندستانی مشرکانہ نام مسلمانوں میں رائج ہیں اور اب تک کسی عالم دین نے اسے قابل اعتراض نہیں سمجھا۔ ذیل میں مہینوں کے نام درج ہیں جو ہندستان کے مختلف حصوں میں مستعمل ہیں :۔

عربی	فارسی	زمانے نام	پشتو	پنجابی	گجراتی	بنگالی	ہندستانی
محرم	اسفندیار	دھا	دہ حسن حسین میاشت	چیتر	چائتر	چترو	چت
صفر	فروردیں	نیرہ تیزی	صفرہ	ویساکھ	ویشاکھ	بشاکھ	بیساکھ
ربیع الاول	اردی بہشت	بارہ وفات	وژمنی خور	جیٹھ	جیٹ	جیٹھ	جیٹھ
ربیع الثانی	خورداد	مدار	درنمہ خور	ہاڑ	اکھاڑھ	اساڑھ	اساڑھ
جمادی الاول	تیر	میراں جی	دریمہ خور	ساؤن	سراون	سراون	ساون
جمادی الثانی	امرداد	خواجہ معین الدین	سلورامہ خور	بھادروں	بھادرو	بھادرو	بھادوں

رجب	شہریور	خدا	دہخدائے مباشت	اسوں	آشو	آسین	کنوار
شعبان	مہر	شبرات	شوفلو	کتیں	کارتک	کارتک	کاتک
رمضان	آبان	رمضان	روزہ	مگھر	ماگھسر	اگھروں	اگھن
شوال	آذر	عید	وزوکے اختر	پوہ	پوس	پوش	پوس
ذی القعدہ	دے	خالی	دہ خالی مباشت یا میانہ	ماگھ	مہا	ماگھ	ماگھ
ذی الحجہ	بہمن	بقرعید	اولے اختر یا کم اختر	پھاگن	پھاگنڑ	پھاگن	پھاگن

مہینوں کے ناموں کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے عربی ناموں کے استعمال پر اہل ایران کو مجبور نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عربی نام قمری مہینوں کے نام تھے۔ رسول عربی نے قمری سال جاری کردیا تھا اور عربوں میں ہر سال چند روز بڑھانے کا قاعدہ منسوخ کردیا تھا۔ یہ قاعدہ ہندستان میں اب تک جاری ہے اور ماہرین فلکیات نجومی یا جوتشی تین سال میں ایک مہینہ "لوند" کا بڑھاکر قمری مہینوں کو شمسی سال کے برابر لے آتے ہیں۔ لیکن عربی سال کا انحصار موسم پر نہیں رہا اور عربوں نے بہت جلد محسوس کیا کہ ہمیں مالگزاری وصول کرنے کے لیے شمسی سال ہی کو رائج رہنے دینا چاہیے ورنہ کبھی ربیع کا موسم خریف میں آجاتا ہے اور کبھی ذی‌قعدہ میں اور وصول تحصیل میں فصل کا لحاظ نہیں رہتا۔ لہذا ایران میں ایرانی مہینے باقی رہے اور خود ہندستان میں جب مغلیہ سلطنت استوار بنیادوں پر قائم ہوگئی تو فصلی یا الہی سنہ اکبر نے رائج کردیا۔ افغانستان نے اب تک آسمان سے تعلق باقی رکھا ہے۔ جہاں دنوں میں تو سورج

چاند باقی نہیں رہے لیکن مہینوں کے نام بارہ برجوں کے نام پر حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ وغیرہ جاری ہیں اور حیدرآباد میں ایرانی نام رائج ہیں۔

ان ناموں کے مقابلے سے ایک اور چیز معلوم ہوتی ہے کہ عورتوں کی دنیا اب تک الگ ہے مسلمان عورتیں مہینوں کے مخصوص نام استعمال کرتی ہیں جن سے اُن کی مذہبیت اور پیر پرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان ناموں کے ساتھ ایک پوری تاریخ وابستہ ہے۔ یہاں صرف یہ چیز قابل غور ہے کہ محرم، رجب، شعبان اور ذی‌القعدہ کے مہینوں کے نام پشتو اور ہندستانی عورتوں کی زبان میں بالکل ایک ہی ہیں اور پٹھانوں کا اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما سے گہرا تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جس ملک میں جیسی ضرورت ہوئی ویسا ہی مسلمانوں نے کیا اور ان جزئیات کی کبھی پروا نہیں کی کہ کوئی نام دیوتا سے تعلق رکھتا ہے، ستارہ پرستی ظاہر کرتا ہے یا اس سے پیروں اور اولیاؤں کے عرسوں کی تاریخیں ظاہر ہوتی ہیں۔ معمولی معمولی باتوں میں اگر شرک و بت پرستی نظر آنے لگے تو دنیا سے بہت جلد اسلام کی وسعت تخیل مٹ جائے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم نے اب تک من حیث القوم اس کا اندازہ ہی نہیں کیا کہ ہندستان نا اسلام ہندوؤں کے رسم و رواج اور فلسفہ سے کتنی دفعہ قریب آنے کی کوشش کرچکا ہے اور ہندو قدامت پرستی نے بھی کتنی دفعہ کبیر و نانک اور گوتم بدھ کی شکل میں ہندو جاتی کے بندھنوں کو توڑنے اور مذہبی جماعت کے پنجے سے نکلنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علی الرغم شیخ و برہمن ہماری ہندستانی زبان اس کفر و اسلام کا اتحاد کامل ہے جو کسی بھی ترقی کرنے والی زبان کے لیے سرمایۂ فخر ہوسکتا ہے۔ اور اگر ہمیں ایک ہی سر زمین میں زندہ رہنا ہے تو ہمیں ایک دوسرے کے تمدن اور زبان کے زندہ پہلوؤں سے فائدہ اٹھائے بغیر چارہ نہیں۔ بخیال غالب ع

چھوڑونگا میں نہ اس بت کافر کو پوجنا چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام چلتا نہیں دشنہ و خنجر کہے بغیر

اب میں صرف ایک اور نقشہ دیتا ہوں اور اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ یہ نقشہ ہندستانی گنتی کا دوسری زبانوں کی گنتیوں سے مقابلہ کرتا ہے۔ اس پر صرف ایک نظر کافی ہے اور یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ہندستانی گنتی دوسری گنتیوں کے مقابلہ میں لسانی نقطۂ نظر سے بہت سے ارتقا کے درجہ طے کرچکی ہے، زیادہ صاف و سادہ ہے اور انٹر پراونشیل قرار پانے کی مستحق ہے۔

مختلف زبانوں کی گنتی اور ہندستانی

ہندستانی	بنگالی	گجراتی	پنجابی	پشتو	فارسی	سنسکرت	اُڑیہ	عدد
ایک	ایک	ایک	اِک	یاؤ	یک	ایکا	کُٹیے	۱
دو	دوئی	بے	دو	دوا	دو	دی	دوئی	۲
تین	تین	تن تران	ترے	درے	سہ	تری	تِنّی	۳
چار	چار	چار	چار	سلور	چہار	چوتر	چارو	۴
پانچ	پانچ	پانچ	پنج	پنزہ	پنج	پنچا	پانجی	۵
چھے	چھوائے	چھو	چھے	شپگ	شش	ششٹھا	چھورو	۶
سات	سات	سات	ست	آوہ	ہفت	شکتا	ساتی	۷
آٹھ	اشٹو	آٹھ	اٹھ	آتہ	ہشت	اشٹا	آٹھو	۸

عدد	اڑیہ	سنسکرت	فارسی	پشتو	پنجابی	گجراتی	بنگالی	ہندستانی
۹	نوھو	نبا	نُہ	نہو	نو	نو	نوئے	نو
۱۰	دوسو	دش	دہ	لس	دس	دس	دوس	دس
۱۱	اگیارو	اکادش	یازدہ	یاؤلس	یاراں	اگیار	اگارو	گیارہ
۱۲	بارو	دوادش	دوازدہ	دوالس	باراں	بار	بارو	بارہ
۱۳	تیرو	*	سیزدہ	دیارلس	تیراں	تیر	تیرو	تیرہ
۱۴	چودو	*	چاردہ	سوارلس	چوداں	چود	چدو	چودہ
۱۵	پندرو	*	پانزدہ	پنزلس	پندراں	پندر	پندرو	پندرہ
۲۰	پوڑئیے	*	بست	شل	وی	ویس	کوڑی	بیس
۳۰	*	*	سی	درش	تری	تریس	ترس	تیس
۹۰	*	*	نود	نوی	نبّے	نےوو	نبے	نوے
۱۰۰	*	*	صد	سل	سو	سو	ایک سو	سو

مختلف ہندیوں سے ہندستانی زبان کیسے بنی؟

اب تک ہم نے مختلف ہندیوں کے چند بنیادی الفاظ کا مقابلہ کیا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ مختلف دیہات کی ہندیوں کو شہری زندگی نے سدھار کر انھیں رفتہ رفتہ ہندستانی بنا دیا۔ یہ ہندستانی زبان شمالی ہند کے شہروں کی زبان بن گئی اور اس میں شبہ نہیں کہ انگریزی تمدن کے آنے سے پہلے مسلمانوں نے جو تمدن اختیار کیا تھا اس کی پوری جھلک ہندستانی زبان میں پائی جاتی ہے۔ اگر آپ مردم شماری کے اعداد ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف مختلف درباروں سے بلکہ عام طور پر شہری زندگی سے مسلمانوں کو زیادہ لگاؤ تھا۔ شہروں ہی میں شائستہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے ملتے تھے اور ایک دوسرے کی دلچسپیوں، صنعتوں، مشغلوں اور جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور جو چیزیں آپس کے میل جول سے پیدا ہوتی تھیں وہ ہندستانی تمدن کا جزو مشترک بن جاتی تھیں۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے اور شہری آبادی میں کراچی سے ڈھاکے تک اور پشاور سے حیدرآباد تک ہر جگہ مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ لہذا کسی مشترک زبان سے فارسی یا سنسکرت کے لفظوں کا نکالنا ناممکن ہے۔ یہ اسی طرح ممکن ہے کہ اس زبان کے سمجھنے والے بہت کم لوگ رہ جائیں یا نئی زبان بنالیں لیکن یہ طریقہ ترقئی زبان کا نہیں بلکہ اپنی زبان کو قتل کرنے کا ہے اور ہندستان میں اس کا پہلے بھی تلخ تجربہ ہوچکا ہے۔

اردو یا ہندستانی کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ تذکرے تو متعدد موجود ہیں اور گرامریں بھی ہیں جو زیادہ تر سنسکرت، عربی یا انگریزی گراموں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ لیکن اب ضرورت ہے کہ زبان کی خود داخلی شہادت پر زور دیا جائے اور اس طرح اس کی تاریخ، لغت اور گرامر مرتب ہو۔

مثلاً ہندستانی زبان کی تاریخ کے ایک پہلو پر اس طرح روشنی ڈالی جاسکتی ہے کہ ہم غور کریں کہ مختلف ہندیوں کو کس طرح ایک دوسرے میں سمویا گیا۔

فرض کیجیے کہ ایک شخص اودھی هندی میں اپنے مکان کو گھر کہتا ہے اور دوسرا بنگالی ہے وہ باڑی کہتا ہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی اس طرح کوشش کی، کہ اودھ کا رہنے والا بھی گھر باڑی کہنے لگا اور بنگالی ماشا بھی گھر باڑی سے مکان کا مفہوم لینے لگے۔ معلوم نہیں ان مسافروں کی کوششوں اور میل جول کو کتنی صدیاں گزریں کہ آخرکار ایک هی شے کے دو نام ایک جان دو قالب ہوگئے اور گھر اور باڑی سے "گھر بار" بن گیا۔

ایسے الفاظ حضرت امیر خسرو کے زمانے سے بہت پہلے بننے لگے ہوں گے اس لیے کہ خود ان کی زبان میں لفظوں کے یہ جوڑے ملتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس چیز نے اتنی ترقی کی کہ فارسی اور عربی زبان کے مترادف الفاظ کے جوڑے بھی بننے لگے اور عام طور پر اردو (یعنی هندستانی) میں رائج ہوگئے اگرچہ خود فارسی یا عربی انشا پردازی میں اس کا وجود اس طرح نہیں ہے جیسا کہ هندستانی میں ہے۔ یہ چیز بھی فارسی و عربی کے اثر سے هندستان میں پیدا ہوئی صرف فرق یہ ہوا کہ واؤ عاطفہ بیچ میں سے گرا دی گئی۔

پھر یہ ہوا کہ بہت سے الفاظ فارسی اور عربی سے نکل کر هندی لفظوں میں ضم ہوگئے اور ان کا اتنا گہرا تعلق ہوا کہ جب تک اس جوڑے کے دونوں لفظ نہ بولے جائیں زبان کا مزا نہیں آتا بلکہ گفتگو پھیکی سی رہ جاتی ہے۔ اردو (یعنی هندستانی) اور دیہات کی هندیوں میں امتیاز کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ هم دیکھیں کہ الفاظ کے جوڑے جزو زبان بن گئے ہیں یا نہیں۔ ذیل میں ان جوڑوں کی ایک مختصر فہرست دی جاتی ہے۔

وہ جوڑے جن میں دونوں لفظ هندی ہیں

بھائی بند	نائی باھمن	دن دھاڑے
گھر بار	ریل پیل	پکڑ دھر
مار پیٹ	دھان پان	پکڑ دھکڑ

بھاری بھرکم،	راج پاٹ	اہیر گڈریہ
لاڈ چاؤ	کپڑا لتا	لون دھوپ
لاڈ پیار	لاٹھی ڈنڈا	سنگ ساتھ
منک جھنک	گھڑی گھنٹہ	چھین اُچک
سادھو سنت	چل پکار	چور اُچکّا
اینٹ پتھر	ٹھوک بجا	چور چکار
کالی کلوچ	بال پوس	دیو بھگوان
دھوم دھڑکا	بن سنور	جنچا تُلا
سمجھ بوجھ	جھاڑ پونچھ	کاٹ چھانٹ
چال ڈھال	نہا دھو	بھاگ دوڑ
چال چلن	برچھی بھالا	توڑ پھوڑ
نک سک	آگ الاؤ	لگی لپٹی
سکھ چین	ساگ پات	چھین جھپٹ
جھاڑو بہارو	مان دان	سوچ بچار
چاؤ پیار	روکھی سوکھی	سوچ سمجھ
چاہ پیار	گھر دوار	پوچھ گچھ
میل جول	مول بھاؤ	مل جُل
مار دھاڑ	دھول دھپا	
نوک جھونک	بھول چوک	

وہ جوڑے جن میں ایک لفظ ہندی ہے اور دوسرا فارسی

بال بچہ	لچا شہدا	خیر سلا	خاک دھول
جی جان	گانٹھ گرہ	حکیم بید	جنگل جھاڑا

میاں محبت	دھن دولت	حقہ پانی	رنگ روپ
پیار محبت	پیر مرشد	رشتہ ناتا	رنگ ڈھنگ
نوکر چاکر	پیر پیمبر	راہ باٹ	جی ہاں
لونڈی باندی	جوڑی بخار	شادی بیاہ	جی حضور
لاؤ لشکر	جاڑا بخار	حلوا مانڈا	حکم حضور
ہاٹ بزار	ڈیرہ خیمہ	کام کاج	کاغذ پتر
راضی خوشی	راج دربار	عطر پھلیل	دانہ دُنکا
دکھ درد	ناک نقشہ	ناز نخرا	فقیر منگتا
بانہہ بازو	روگ مرض	حال چال	فقیر بھکاری
ریت رسم	تال سم	کرسی مونڈھا	شرم لاج
چاہ محبت	لڑوا دھر	میز تپائی	علم گیان
تیر کماں	اولا برف	ناک ڈور	صبح سویرے
جوتی پیزار	اوڑھنی چادر	گور گڑھا	زیور گہنا
لاج شرم		شیر باگھ	بہادر سورما
ناچ رنگ		ذات پات	مست متوالا

وہ جوڑے جن میں دونوں لفظ فارسی یا عربی ہیں

یار دوست	راہ رسم	صبر شکر	رسم راہ
مال متاع	شرم لحاظ	چاق چوبند	رشک حسد
شرم حیا	عزت آبرو	عزت حرمت	دم درود
نن نوش	زور شور	در دربار	دم خم
شال دوشالہ	وعظ نصیحت	وعظ پند	حرص ہوا
خواب خیال	ہو حق	صورت شکل	آہ و زاری
افسر حاکم	رسم رواج	غم غصہ	شان شوکت

شر فساد	شور غل	لیت لعل	پتہ نشان
شاذ نادر	ہوش حواس	افرا تفری	صبح سحر

ہندستانی گرامر

الفاظ کے نشوونما کے علاوہ ہمیں ہندستانی گرامر کے ارتقا پر بھی ایک تقابلی نظر ڈالنی پڑے گی اور نئے سرے سے ہندستانی گرامر کی تدوین کا کام کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں دو چیزیں ہندستانی گرامر میں ممتاز نظر آتی ہیں۔ اول تو اسما کی جمع بنانے کے سماعی اور قیاسی طریقے۔ دوسرے تذکیر و تانیث کے قاعدے۔ افعال کی جمع سنسکرت میں نہیں ہوتی۔ بنگالی اور بعض دوسری ہندیوں میں بھی یہی چیز رائج ہے۔ غالباً سب سے پہلے پشتو پھر پنجابی اور اس کے بعد کھڑی بولی یا برج بھاشا میں اور اسی کے ساتھ ساتھ دکنی اردو میں افعال کی جمع کا طریقہ رائج ہوا۔ یہ طریقہ فارسی افعال کی پیروی میں لیا گیا ہوگا۔ یا بہت ممکن ہے کہ اور دوسرے اثرات ہوں، ہمیں ان کی تحقیق کرنی ہوگی اور اسما کی جمع کے سلسلے میں یہ چیز بھی نظر کے سامنے رکھنی ہوگی۔ مثلاً

بہاری زبان میں "(میں جاتا ہوں) اور (ہم جاتے ہیں)" دونوں کے لیے "ہم جاتانی" کہتے ہیں۔ (تو جاتا ہے) کو "روا جاتانی" وغیرہ۔ اڑیہ میں ("ایک گھوڑا دوڑا") کو "کٹے گھوڑا دوڑوچی" اور ("بہت سے گھوڑے دوڑے") کو "ایک گھوڑا دوڑوچی" کہتے ہیں۔ اسی طرح گجراتی میں ("ایک آدمی کھاتا ہے") کا ترجمہ ہے "ایک مانس کھائے چھے" اور ("دو آدمی کھاتے ہیں") کو کہیں گے "دو مانس کھائے چھے" گویا افعال میں واحد جمع نہیں ہے۔ لیکن پنجابی میں کھاتا ہے کو کہیں گے (کھاندا ہے) اور کھاتے ہیں کو (کھاندے ہیں)۔ اس لیے سوائے پنجابی اور کسی حد تک اودھی و پوربی کے جتنی ہندی زبانیں ہیں ان کے افعال کا ڈھانچہ بھی اردو (یعنی ہندستانی) سے بالکل الگ ہے اور ہندستانی افعال میں واحد جمع کا داخلہ غالباً فارسی ہی کے اثر سے ہوا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ ہندستانی افعال کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے

که اس میں تذکیر و تانیث بھی پیدا ہوگئی ہے جو نہ سنسکرت میں ہے نہ فارسی میں۔ ہاں بعض ہندیوں میں اس کا کسی کسی فعل میں وجود پایا جاتا ہے۔

ان چیزوں پر غور کرنے سے ہم اس ناقابل انکار نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ مختلف ہندیوں اور فارسی اور سنسکرت نے مل کر ہندستانی زبان کی گرامر اور لغت کی تعمیر کیا ہے۔ اس تعمیر میں سیکڑوں سال صرف ہوئے ہیں اور رفتہ رفتہ ہندستان کی مختلف بولیوں نے ملکر یہی عالیشان زبان بنائی ہے جس میں ہندیوں کی فطری سادگی اور اوج، فارسی کی روانی و سلاست، عربی کا ایجاز و شکوہ اور سنسکرت کا ذخیرۂ الفاظ و طرز بیاں سب کچھ شامل ہے اور اب تو یوروپ کی سائنس بھی ہندستانی زبان کے سرمایۂ عام کو بڑھا رہی ہے اور اس بلند عمارت کی مختلف اینٹوں کو ہندستان کی مختلف قوموں کا تمدن ایک دوسرے سے پیوستہ کر رہا ہے۔ خطرہ ہے کہ اگر کسی نے ایک اینٹ بھی الگ کرنے کی کوشش کی تو ہماری مشترکہ قومیت ہی نہ تباہ ہوجائے۔

بنیادی هندستانی کے لوازم

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ شمالی ہندستان کے شہروں کی زبان جسے اب "ہندستانی" کہتے ہیں، ہندستان کی بولیوں میں سب سے بہتر ہے اور اس کا خزانۂ الفاظ اور گرامر اپنے دامن میں زندگی اور نشو و نما کی پوری قوتوں کو چھپائے ہوئے ہے، ہمیں دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو ایسی فہرست الفاظ تیار کرنا ہے جو بنیادی الفاظ پر حاوی ہو اور دوسرے ایسی گرامر تیار کرنا جسے پڑھ کر نہایت آسانی سے دوسرے صوبوں کے لوگ ہندستانی سیکھ سکیں۔

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ بنیادی ہندستانی کا کام سیکڑوں سال پہلے سے جاری ہے اور بہت کچھ ہوچکا ہے۔ لیکن یہ سمجھنے کے لیے کہ فی الحقیقت "بنیادی ہندستانی" ہے کیا اور اس کا مقصد کیا ہے، ہمیں ایک سرسری نظر بنیادی انگریزی (Basic English) پر ڈالنی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں زبانوں کی کثرت ہمارے افتراق کو ظاہر کرتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان ان علوم و فنون سے جو مخصوص اقوام کی میراث سے ہوگئے ہیں اس وقت تک فائدہ نہیں حاصل کرسکتا جب تک ان قوموں کی زبانوں سے واقف نہ ہو۔ عام آدمی تو کیا خواص بھی سب علمی زبانوں سے واقف نہیں ہوسکتے۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لیے یورپ میں کئی زبانیں ایجاد کی گئیں لیکن (آئڈو) (Ido) تو بہت جلدی ختم ہوگئی اور اسپرانٹو (Espranto) اپنا دم توڑ چکی ہے۔ یہ دیکھ کر انگریزی زبان کے حامیوں نے اپنی سلطنت کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کو بھی عالمگیر بنانا چاہا اور آسان انگریزی کے آٹھ سو پچاس (850) لفظوں کو چن کر ان کے استعمال کے قاعدے بنائے اور گرامر کے چند ایسے اصول منتخب کیے جو ان اقوام میں رائج کیے جاسکتے ہیں جن کی زبان کو انگریزی نہیں ہے، لیکن وہ انگریزی کو ثانوی زبان (Secondary Language) کی طرح استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا موزوں ہوگا کہ بنیادی انگریزی ایک علمی طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے انگریزی نہ بولنے والی قوموں کو انگریزی سکھائی جاسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش ہورہی ہے کہ خود انگریزی زبان بولنے والے، یعنی انگلستان، کینیڈا، آسٹریلیا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ والے بھی تین ہزار لفظوں میں اپنے خزانہ لغت کو محدود کرلیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ بچوں اور عام آدمیوں کے حافظہ پر غیر ضروری اور مشکل الفاظ کا بار نہ ہوگا اور عام لٹریچر کے سمجھنے کے لیے پندرہ بیس ہزار لفظوں کے یاد کرنے سے بچ جائیں گے۔ گویا یہ کوشش ہے کہ انگریزی زبان کو دنیا کی زبان بنانے کے لیے ساڑھے آٹھ سو لفظوں سے کام لیا جائے اور معیاری انگریزی (Standard English) کے لفظوں کی تعداد بھی گھٹائی جائے تاکہ علوم و فنون سے عوام بھی بقدر ضرورت فائدہ حاصل کرسکیں۔

اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوگی، اس کا جواب مشکل نہیں۔ مشرقی اقوام کا تمدن کچھ ایسا ہے کہ یوروپین تمدن سے میل نہیں کھاتا۔ یہاں کی بعض زبانیں بھی اتنی

ترقی یافتہ ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ دوسری زبان اختیار کریں۔ خود ہندستانی زبان اتنی ہمہ گیر ہے کہ انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری یوروپین زبانوں کو ہندستانی بنالیتی ہے اور اپنی گرامر کی وسعت پر ناز کرتی ہے اور جہاں تک یوروپ اور امریکہ کا تعلق ہے وہاں خود ایسی زندہ زبانیں موجود ہیں جو انگریزی کو حاوی ہونے کا موقع نہیں دے سکتیں۔

اب بنیادی ہندستانی کا مفہوم کسی قدر واضح ہوگیا ہوگا: اسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :-

(۱) بنیادی ہندستانی وہ زبان ہوگی جو ہندستان کے ایسے صوبوں کی بین صوبجاتی (Inter Provincial) زبان بن سکے جہاں ہندستانی رائج نہیں ہے۔ اس کا کام وہی ہوگا جو آج کل انگریزی سے لیا جارہا ہے یعنی حکومت کی بھی زبان ہے اور عام کاروبار میں اس کا بول بالا ہے۔ بنیادی ہندستانی کو آٹھ نو سو لفظوں میں محدود کرکے اس کی تدریجی ریڈریں بنانی ہوں گی اور اس سلسلہ میں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ جو لفظ منتخب کیے جائیں وہ مختلف ہندی بولنے والے لوگوں کی زبانوں میں زیادہ رائج ہوں امکن معیاری ہندستانی میں پہلے سے موجود ہوں اور ایسے ہوں کہ ان کے ذریعہ سے ہم ہندستانی زبان میں پانچ چھے ہزار محاورے بناسکیں اور معیاری ہندستانی کے دس بارہ ہزار لفظوں کا کام لیا جاسکے۔

(۲) بنیادی ہندستانی میں عام سائنس کے وہ لفظ جو ہر شعبۂ سائنس میں استعمال ہوتے ہیں منتخب کرنے ہوں گے۔ ان کی تعداد سو سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔ اسی طرح ہر مخصوص سائنس Special Science کے پچاس پچاس لفظ منتخب کرنے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ہم کسی مخصوص سائنس مثلاً کیمسٹری یا ستارا نامی (نجوم) کے متعلق کوئی علمی رسالہ نکالنا چاہیں تو عام سائنٹفک الفاظ کے ساتھ پچاس لفظ مخصوص کیمسٹری یا ستارا نامی کے ملاکر ڈیڑھ سو علمی اصطلاحوں کے ساتھ آسانی سے کام چلاسکتے ہیں۔

(۳) بنیادی ہندستانی کی ایک گرامر ہو جو معیاری ہندستانی کے اصولوں کو ملک ہندوستان کی دوسری ہندیوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی جائے اور خصوصیت سے ان چیزوں کو سمجھائے جو دوسری ہندیوں کی گراموں میں نہیں ہیں مثلاً اصول تذکیر و تانیث‘ جمع بنانے کے قاعدے اور مرکبات اضافی و توصیفی وغیرہ۔ اور جہاں تک نحو اور عروض کا تعلق ہے وہ تقریباً کل ہندیوں میں ایک ہی ہے۔

آٹھ نو سو لفظوں کے جمع کرنے کے متعلق یہ عرض ہے کہ یہ کام اس طرح ہوسکتا ہے کہ آسان اور روزمرہ کی ہندستانی میں سے چند صفحوں کی تحریر کو سامنے رکھا جائے اور حروف تہجی کے سلسلہ سے لفظوں کی فہرست اور ہر لفظ کے استعمال کی تعداد لکھ لی جائے اور پھر بیسک انگلش کے لفظوں سے ان کا مقابلہ کیا جائے؛ اس طرح ہمیں معلوم ہوسکے کا کہ کون کون سے لفظ ضروری ہیں۔ پھر ان ہندستانی لفظوں کی فہرست سے جو بنگالی ‘ اودھی‘ پنجابی‘ گجراتی اور پشتو وغیرہ میں رائج ہیں ان کا مقابلہ کیا جائے اور مشترک الفاظ کی فہرست بنالی جائے۔ اس طرح بنیادی انگریزی کے مقابلے میں بنیادی ہندستانی کا کام زیادہ آسان اور مستقل بنیادوں پر ہوگا اس لیے کہ نہ صرف ہندستان کی مختلف زبانوں میں ہزاروں لفظ مشترک ہیں بلکہ گرامر کے قواعد بھی ملتے جلتے ہیں۔ اور جو کام بیسک انگلش والے ہزار سال میں کریں گے وہ کام چند مہینوں کی محنت سے ہمارے سامنے یہ بات ظاہر کردے گا کہ ہندستان میں بنیادی ہندستانی سیکڑوں سال سے بن رہی ہے اور اس کا بہت کچھ کام ہوچکا ہے۔

میں نے آٹھ نو سو لفظوں کی ایک فہرست تیار کرلی ہے۔ لیکن جب تک اسی طرح مختلف ہندیوں اور ہندستانی کے جاننے والے آزادانہ فہرستیں نہ تیار کریں گے اور بحث و نظر کے بعد ایک متفقہ فہرست تیار نہ ہوگی‘ صرف ایک فہرست کا ملک میں رائج کرنا ضروری نہیں اور میں اسے مفید بھی نہیں سمجھتا اس لیے کہ جب تک مقبولیت کی سند کسی موقر ادارے یا جماعت کی طرف سے نہ دی جائے اس وقت تک ایسی کوششیں جلد کامیاب نہیں ہوسکتیں۔

ان الفاظ کی فہرست بنانے کے سلسلے میں میرے سامنے جو خاص چیز آئی وہ
ہے کہ بنیادی ہندستانی کے بعض الفاظ بالکل بنیادی انگریزی سے مل جاتے ہیں۔
کن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو سنسکرت سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں
عربی سے۔ یعنی ہماری روزمرہ کی ہندستانی میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے ہمیں
اظ کی تلاش میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ لفظ خالص ہندستانی ہوں، خواہ
انگریزی، سنسکرت اور عربی سے قریب ہوں یا نہ ہوں۔ مثلاً نیچے لکھے ہوئے
ظ اگرچہ انگریزی زبان کے بنیادی لفظوں سے قریب ہوجاتے ہیں لیکن چونکہ
دستانی میں رائج نہیں ہیں لہذا ان کا یہ ترجمہ صحیح نہ سمجھنا چاہیے:

End	انت	Sound	صوت
Bad	بد	Basin	باسن
Brother	براد	Point	بندی
Door	دوار	Young	یون
Crime	جرائم	Tall	طال
New	نوا	Cow	گاؤ
Foot	پد	Sun	سوریہ

ہاں اگر ایسے الفاظ جو ہندستانی میں عام طور پر رائج ہوگئے ہیں اور دوسرے
لفظوں کے مقابلے میں وہ انگریزی زبان سے زیادہ قریب ہیں تو ان کو اپنی زبان میں
رور شامل کرلینا چاہیے تاکہ ہندستانی زبان نہ صرف انٹرپراونشل ہو بلکہ انٹرنیشنل
وجائے۔ مثلاً نیچے لکھے ہوئے لفظ انگریزی سے بہت قریب ہیں اور ضرور بنیادی
ندستانی میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں:—

Berry	بیری	Brush	برش
Drawers	دراز	Degree	درجہ
Knot	گانٹھ	Group	گروہ
Hand	ہاتھ	Carriage	گاڑی
Lip	لب	Comb	کنگھی
Over	اوپر	Sign	نشان

قابل	Able	رسید	Receipt
وزیر	Vizier	بازار	Bazar
آواز	Voice	کف	Cough
گرفت	Grip		

اسی طرح بنیادی انگریزی میں جن لفظوں کو انٹرنیشنل قرار دیا ہے ان میں سے اکثر ہندستانی زبان کے علاوہ ہندستان کی دوسری زبانوں میں بھی رائج ہوگئے ہیں۔ مثلاً الکحل، الومینیم، بنک، چک، سگرٹ، کلب، کافی، انجنیر، گیس، ہوٹل، نکل، میم، پارک، پاسپورٹ، فونوگراف، پیانو، پولس، پروگرام، پروپاگنڈا، ریڈیو، رسٹوران، ٹیکسی، ٹیلیگرام، ٹیلیفون، تھیٹر، تمباکو، یونیورسٹی وغیرہ۔ لیکن ان کے علاوہ بھی اور بہت سے انٹرنیشنل اسما ہیں جو ہندستانی زبان میں بطور انٹرپراونشل اور انٹرنیشنل الفاظ کے شامل کیے جاسکتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ہمیں علوم (Sciences) کی اصطلاحوں کے لیے طے کرنا ہوگا کہ بنیادی عام اصطلاحیں براہ‌راست یوروپین زبانوں کی رکھی جائیں یا کچھ یوروپین ہوں اور کچھ ہندستانی۔

اگر ہندستان کی کوئی موقر مجلس علمی اس کام کو انجام دینے کا ذمہ لےسکتی اور ملک کے زبان دانوں کے مشورہ سے بنیادی ہندستانی کی لغت اور گرامر مرتب کرسکتی تو انفرادی کوششوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے کام ہوسکتا اور اس کے بعد ملک کی زبانوں اور بولیوں میں ان کتابوں کا ترجمہ آسانی سے ہوسکتا اور تھوڑی سی کوشش میں ہندستانی زبان شہروں سے قصبات اور قصبات سے دیہات تک پہنچ جاتی۔ پھر ہم فخر سے کہہ سکتے کہ پورے ہندستان کی زبان ہندستانی ہے۔

عربوں کی نثر

از

مولوی عبداللطیف اعظمی صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ، دھلی

عربی زبان کی دو قسمیں ھیں شمالی اور جنوبی۔ شمالی زبان حجاز اور نجد میں بولی جاتی تھی۔ اسے لغت مضر یا لغت عدنان کہتے ھیں۔ جنوبی زبان یمن کے جنوبی علاقوں میں رائج تھی؛ اسے لغت حمیر کہا جاتا ھے۔ یہ دونوں زبانیں آپس میں اس قدر مختلف تھیں کہ انھیں با آسانی دو زبانوں سے تعبیر کیا جا سکتا ھے۔ لسان حمیر کے عروج کا زمانہ عیسی علیہ السلام کی پیدائش تک ختم ھوگیا اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کا دائرہ محدود ھوتا ھوگیا یہاں تک کہ چھٹی صدی عیسوی میں صفحۂ ارض سے معدوم ھوگئی۔

عربی زبان کی یہ دو قسمیں در اصل اس لیے ھوئیں کہ عربی قوم دو مختلف شاخوں میں تقسیم ھوچکی تھی۔ ایک عدنان سے اپنی نسبت جتاتے تھے، دوسرے اپنے کو قحطان شمار کرتے تھے۔ عدنان اور قحطان کا باھمی تعصب عربی تاریخ پڑھنے والے پر مخفی نہیں۔ اس وقت لسان حمیر کا وجود آثار قدیم کے کتبوں کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ قدوم اسلام سے سو برس پیشتر عربی زبان مختلف لہجوں میں منقسم تھی۔ انھیں اختلافات کا یہ اثر ھے کہ مرادف الفاظ کی اتنی کثرت دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتی اور اگر حالت ایسی ھی باقی رھتی اور عکاظ کا بازار گرم نہ ھوتا تو آج عربی زبان متعدد چھوٹی چھوٹی زبانوں میں منقسم نظر آتی۔ یہ سوق عکاظ ھی کا احسان ھے کہ قریش کی زبان دوسرے قبائل کے لہجوں پر غالب آگئی اور تمام عرب نے ان کی زبان کو ایک معیاری زبان تسلیم کرلیا۔ چونکہ عکاظ، حجاز کے وسط

میں واقع ہے اور قریش کی سیادت کو تمام قبائل پہلے سے مانتے تھے اس لیے عکاظ کے میلوں میں دوسرے قبائل کے شعرا آتے اور ان کی زبان کے مطابق اپنے لہجوں کی اصلاح کرتے۔ لیکن عربی زبان پر سوق عکاظ کا اتنا احسان نہیں ہے جتنا کہ قرآن کریم کا ہے۔ ایک عیسائی ادیب سلیمان بستانی ان الفاظ میں یوں لکھتا ہے:

"اس (قرآن) نے زبان کو آج تک محفوظ اور زندہ رکھا اور قیامت تک اس کی بقا کا ضامن ہے۔ ورنہ عربی زبان بھی سریانی، عبرانی اور سنسکرت کی طرح مٹ جاتی[1] قرآن کریم کے اس احسان کو جرجی زیدان اور دوسرے غیر مسلم مورخین نے بھی تسلیم کیا ہے۔

جب ہم اقوام کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نثر سے قبل عموماً شعر وجود میں آتا ہے کیونکہ قومیں جب اپنے ابتدائی دور میں ہوتی ہیں تو اپنے آلام و مصائب، مسرت و شادمانی اور جذبات و تاثرات کو نظم کے ذریعے ادا کرتی ہیں لیکن جب ان کی اجتماعی زندگی ترقی کر جاتی ہے، وہ میدان عروج میں گامزن ہوتی ہیں اور ان کے افکار و خیالات میں تغیّر و تنوّع پیدا ہوجاتا ہے تو وہ مجبور ہوتی ہیں کہ کسی اور چیز کے ذریعے انھیں ادا کریں کیونکہ ان تمام چیزوں کو شاعری کے ذریعے ادا نہیں کیا جاسکتا، اس وقت نثر وجود میں آتی ہے۔ مثلاً یونانیوں کو لیجیے۔ ان میں سب سے پہلے قصصی شاعری پیدا ہوئی، اس کے بعد غنائی، پھر تمثیلی۔ نثر اس وقت وجود میں آئی جب یونان اور مشرقی و جنوبی اقوام کی کشمکش سے سیاسی ہیجان پیدا ہوا، اجتماعی زندگی نے کروٹ بدلی، سیاسی، مذہبی اور فلسفیانہ خیالات میں انقلاب ہوا اور مسائل حیات اس قدر متنوّع ہوگئے کہ شاعری میں وہ کسی طرح سما نہیں سکتے تھے۔

یہی حال رومانی قوم کا بھی نظر آتا ہے اور بعینہ یہی حال عربوں کا ہے۔ ان میں سب سے پہلے شاعری پیدا ہوئی اور ایک مدت کے بعد نثر نے جنم لیا۔ نثر کب پیدا ہوئی؟ اس کے متعلق علمائے ادب میں اختلاف ہے۔ عام طور پر خیال ہے کہ

۱ مقدمہ الیاذہ

نثر کا وجود بہت قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے اور طلوع اسلام تک اس نے اس قدر ترقی کرلی تھی کہ قرآن کریم جیسی نثر کی کتاب ان کے سامنے پیش کی جاسکے۔ مگر بعض علمائے ادب کو اس سے اختلاف ہے۔ ان میں مشہور مستشرق ولیم مرسیہ William Marcia اور ڈاکٹر طٰہ حسین کو اہمیت ہے[1] ڈاکٹر طٰہ حسین نے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد جاہلیت میں نثر کا مطلق وجود نہیں تھا، بلکہ عہد رسالت کی پیداوار ہے اور پہلا نثر نگار ابن المقفع فارسی تھا[2] ان کی دلیل یہ ہے کہ عرب جاہلیت ابتدائی دور Primitive میں تھے جس میں کسی قوم میں نثر پیدا نہیں ہوتی کیونکہ نثر عقل کی ترقی کے زمانہ میں وجود میں آتی ہے۔

لیکن یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی اس لیے کہ یہ علمائے ادب جس عہد کو عربوں کا دور اول کہتے ہیں وہ پانچویں صدی بعد مسیح ہے۔ اس وقت عرب کے قرب و جوار کی قومیں مثلاً ایرانی، ہندستانی، مصری اور یونانی وغیرہ کے یہاں نثر کا وجود ملتا ہے بلکہ پانچویں صدی قبل مسیح سے بھی ان کے یہاں نثر کا وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ پھر کیا یہ صحیح ہوسکتا ہے کہ عرب تہذیب و تمدن اور خصوصاً ادب میں اس قدر پیچھے تھے کہ پانچویں صدی بعد مسیح بھی ان کے یہاں نثر وجود میں نہیں آئی؟۔

حالات و قرائن پر غور کرنے اور تاریخ ادب عرب کے مطالعہ کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ طلوع اسلام سے قبل عربوں کے یہاں نثر موجود تھی۔ اس کی تائید قرآن حکیم سے بھی ملتی ہے کہ عرب جاہلیت کے پاس مذہبی اور ادبی کتابیں موجود تھیں۔

---

۱ مرسیہ کے خیالات معلوم کرنے کے لیے اس کی کتاب Revue Africaine—Nos. 330 & 331 (Ier & 20 trimestres) 1927 اور ڈاکٹر طٰہ حسین کے خیالات معلوم کرنے کے لیے ان کی کتاب شوقی و حافظ اور المجمل ملاحظہ فرمائیے۔

۲ طٰہ حسین کو نہ صرف جاہلی زمانہ میں نثر کے وجود سے انکار ہے بلکہ مارچ سنہ ۱۹۳۳ء میں امریکن یونیورسٹی (الجامعۃالامریکیۃ) میں انہوں نے اپنے ایک لکچر میں یہ بھی فرمایا کہ پہلی صدی ہجری میں بھی نثر کا وجود نہیں تھا اور نہ کوئی اہم اجتماعی کتاب تھی، صرف شاعری ہی شاعری تھی۔

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ كِتَابٍ وَ لَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۔ (عنکبوت)

اور تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتا تھا اپنے داھنے ھاتھ سے، (اگر ایسا ہوتا تو) اس وقت یقیناً یہ جھوٹے شبہ کرتے ۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ظہور اسلام سے قبل کتابیں موجود تھیں جنھیں لوگ پڑھتے تھے اور آنحضور جب گزشتہ اقوام کے حالات بیان کرتے تو کفار سمجھتے کہ انھیں کتابوں کو پڑھ لیا ہوگا ۔ ظاہر ہے یہ کتابیں نثر میں بھی ہوں گی نظم میں بھی ہوں گی، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ صرف نظم ہی میں تھیں، نثر میں نہیں ۔ اسی طرح اس آیت سے "لکھنے" کا بھی وجود ثابت ہوتا ہے تو کیا وہ صرف نظم ہی لکھتے تھے اور رسائل اور خطب جو عربوں کی قدیم مشہور چیزیں ہیں، نہیں لکھتے تھے؟ اور اگر ایسا نہیں تو بتلایا جائے کہ یہ رسائل اور خطبے نثر میں تھے یا کسی اور چیز میں؟

مرسیہ نے ایک مرتبہ (سنہ ۱۹۲۷ع میں) مشہور اھل قلم، ڈاکٹر ذکی مبارک سے پوچھا کہ "اگر عہد جاہلیت میں نثر کا وجود ہوتا تو اگر سب نہیں تو کچھ حصہ تو ہم تک پہنچتا، جس طرح ہندستان، ایران اور روم کی قدیم نثر کے آثار کتابی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں" تو موصوف نے جواب دیا کہ "ان آثار کا فقدان اس بات کے انکار کے لیے کافی نہیں ہے کہ عہد جاہلیت میں نثر موجود نہیں تھی، اگر کوئی اور کتاب نہیں تو قرآن تو موجود ہے جو جاہلی نثر کا نمونہ ہے[۱]"۔

جو لوگ عہد جاہلیت میں نثر کے وجود سے انکار کرتے ہیں، انھیں غالباً اس وجہ سے دھوکا ہوا کہ اگر نثر موجود ہوتی تو ہم تک یقیناً پہنچتی، وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ نہ پہنچنے کے اسباب ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ جس طرح ہندستانی، رومی اور ایرانی قدیم قوموں کی نثر زمانے کی دست برد سے محفوظ رہی اسی طرح عرب جاہلیت کی نثر کو بھی محفوظ رہنا چاہیے تھا حالانکہ اس طرح غور کرنا اصولی غلطی ہے ۔ ہر قوم اور ہر زمانے کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور نتائج و عواقب،

۱ النثر الفنی ص ۳۴

حالات اور ماحول کے ماتحت پیدا ہوئے ہیں۔ دور جاہلیت کے بعد جس دور سے عربوں کو سابقہ پڑا، وہ ان اقوام سے بالکل مختلف تھا۔ گو اس کے محفوظ نہ ہونے کے اسباب یہ بھی ہیں کہ جہالت بہت زیادہ تھی، پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابت کی آسانیاں نہیں تھیں اور نہ عام تھیں، تدوین کا رواج بہت کم تھا لیکن سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ طلوع اسلام کے بعد یکایک عربوں کو انقلابی دور میں داخل ہونا پڑا، ان کی اجتماعی زندگی ایک ایسے ماحول اور حالات سے دو چار ہوئی جو ایام جاہلیت سے بالکل مختلف تھی، اس کی تابانی اور روشنی اس قدر تیز تھی کہ اس کے مقابلے میں تمام چیزیں ماند پڑگئیں۔

ایام جاہلیت میں نثر کے وجود پر اس سے بھی دلیل ملتی ہے کہ قرآن نثر کی پہلی کتاب نہیں ہوسکتا۔ قرآن کی مخاطب یقیناً ایسی ہی قوم ہوسکتی ہے جو بہترین زبان اور بہترین نثر کی حامل ہو، ایسی قوم کبھی نہیں ہوسکتی جو نثر سے قطعی ناواقف ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اسے سمجھنے سے ناواقف ہوتے بلکہ اس سے انکار کردیتے۔ مگر دنیا جانتی ہے کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا، انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ یہ ایسی زبان ہے جس سے ہم بالکل نابلد ہیں بلکہ انھوں نے اس کی خوبیوں کی داد دی، اس کی فصاحت و بلاغت کی تحسین کی اور اس کے مقابلے کی کوشش کی۔

جو لوگ وحی خداوندی کی تاریخ اور کیفیت سے واقف ہیں وہ یہ تسلیم کریں گے کہ جب کوئی پیغمبر کسی قوم میں مبعوث کیا جاتا ہے تو وہ اسی قوم کی زبان بولتا ہے اور اسی قوم کی زبان میں اس کا پیغام ہوتا ہے تاکہ وہ اسے سمجھ سکیں اور اس پر عمل کرسکیں اگر ایسا نہ ہو تو رشد و ہدایت کی راہ میں بہت سی مشکلات پیدا ہوں گی۔ یہ اصول میرا آپ کا بنایا ہوا نہیں ہے، خود قرآن کا ہے:

وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ۔ (ابراهیم)	اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا، مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی، تاکہ ان کو سمجھا سکے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین ان لوگوں میں سے ہیں جن کا خیال ہے کہ جو شاعری دورِ جاہلیت کی طرف منسوب کی جاتی ہے وہ مصنوع ہے یعنی وہ جاہلی شاعری نہیں بلکہ اسلامی شاعری ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایامِ جاہلیت میں شاعری موجود تھی اور نہایت عمدہ۔ تو کیا جس طرح وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر عہد جاہلیت میں نثر موجود ہوتی تو اس کے آثار باقی رہتے یا بقول خلیل مطران[1] اس قدر کم نہ ہوتی کہ ایک چھوٹے سے مجموعہ میں آجاتی، یہی اعتراض ان پر نہیں کیا جاسکتا ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں کہ شاعری سینہ بسینہ محفوظ رہ سکتی ہے اور نثر "سفینہ" کی محتاج ہے جس کے ضائع ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ ٹھیک جس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ امرأ القیس کے قصیدے کو دیکھ کر ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اس سے پیشتر یقیناً نہایت ترقی‌یافتہ شاعری موجود تھی، یہ پہلا قصیدہ نہیں ہوسکتا، اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً قرآن سے قبل نثر کا وجود تھا، یہ نثر کی پہلی کتاب نہیں ہوسکتی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ معترضین حضرات قرآن کو نثر کی کتاب ہی تسلیم نہیں کرتے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا قول ہے:—

ان القرآن لا ہو شعر و لا ہو نثر و انما ہو القرآن

بالکل یہی خیال ولیم‌مرسیہ کا بھی ہے بلکہ النثر الفنی کے مصنف کا خیال ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اسی کے خیال سے استفادہ کیا ہے۔ مرسیہ اپنی ایک فرانسیسی تصنیف میں لکھتا ہے کہ:—

"On est donc fonde a refuser a la langue du Coran le nom de prose au sens plein et strict du not."

جس کا انگریزی میں ترجمہ یہ ہوگا کہ:—

"One is therefore entitled to deny to the language of the Qoran the name of 'prose' in the full and strict sense of the word."

یعنی جہاں تک لفظ "نثر" کا تعلق ہے، اس کے پیش‌نظر قرآن کی زبان کو نثر نہیں کہا جاسکتا۔

---

۱ النثر الفنی صفحہ ۳۳۔

مگر ان چند لوگوں کے علاوہ علمائے ادب نے عام طور پر یہ تسلیم کیا ہے کہ قرآن نثر کی کتاب ہے، اس پر مبسوط مضامین لکھے گئے ہیں اور معترضین کے مدلل جوابات دیے گئے ہیں۔ بہر نوع یہ تسلیم کرلینے کے بعد کہ قرآن نثر کی کتاب ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام سے قبل عربوں کے یہاں نثر موجود تھی اور ایرانیوں اور یونانیوں کے اختلاط سے قبل وہ بہترین ادب اور لٹریچر کے حامل تھے۔

اسلام ایک انقلاب عظیم تھا، اس نے قدیم نظام کی جگہ جدید نظام پیش کیا، اس نے عربوں میں اتحاد اور یگانگت پیدا کی جو اس سے قبل بالکل مفقود تھی، اجنبی قوموں کو اسلام میں داخل کرکے مختلف قسم کی تہذیبوں کو آمیزش کا موقع دیا، اس انقلاب نے ان کی اجتماعی زندگی کو بالکل بدل دیا، وہ ایک ایسے دور سے دو چار ہوئے جس سے بالکل ناآشنا تھے۔

اس کے بعد ممالک فتح ہوئے، اجنبی اقوام سے اختلاط پیدا ہوا۔ اس آمیزش نے زندگی کے ہر پہلو پر اثر ڈالا، عربوں کو ان اجنبی قوموں کے افکار و آرا سے واقفیت پیدا ہوئی۔ ان کے مذاہب، ان کے علوم اور ان کے فلسفے سے واقف ہوئے اور آہستہ آہستہ اس سے متاثر ہوئے، اس سے مسائل حیات میں تغیر ہوا، موضوعات تفکر میں اضافہ ہوا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ زبان میں نہ صرف تغیر ہوا بلکہ انقلاب ہوا۔ ذخیرے میں اضافہ، تعبیر میں توسیع، تخیل میں ترقی اور نظر میں وسعت پیدا ہوگئی؛ دین کے عقائد، سلطنت کے قوانین، تمدن کی ضروریات، علوم کی اصطلاحات، جدید چیزوں کے اسما، مناظر تمدن کی تصویر کشی وغیرہ کا اضافہ ہوا، الفاظ مہذب، اسالیب ترقی‌یافتہ اور زبان صاف ہوگئی۔

قرآن کی بلاغت، احادیث نبوی کی فصاحت نے زبان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور زبان اپنے تنگ دائرے سے نکل کر مذہب اور حکومت کی زبان ہوگئی۔

سب سے بڑا انقلاب جو ہوا وہ یہ تھا کہ ان کو نثر کے نئے نمونے سے سابقہ پڑا جو ان کے دماغ میں اچھی طرح مرتسم ہوگیا اور ان کے زبان و قلم پر بالکل مستولی

ہو گیا۔ یہ قرآن مجید تھا جس میں تشبیہ و تمثیل کی باریکی، اجمال و تفصیل، بلاغت و فصاحت اس حد تک سلامت تھا انھوں نے اس کا بلاارادہ یا بالارادہ تتبع کیا اور ان کی زبان اس کے قالب میں ڈھلتی گئی، ایک طرف اس نے زبان کا ذخیرہ بڑھایا، تعبیر کا دائرہ وسیع کیا، دوسری طرف اس کی خاطر نئے علوم وضع ہوئے جو تمام زبان کے لیے عام طور سے مفید اور ضروری ہیں۔ نحو، صرف اور اشتقاق لحن دور کرنے کے لیے، معانی و بیان اور بدیع اس کا اعجاز ثابت کرنے کے لیے، لغت اور ادب اس کے غریب الفاظ کی شرح کے لیے اور حدیث و اصول، فقہ و تفسیر، اس سے احکام شریعت استنباط کرنے کے لیے وضع کیے گئے جنھوں نے عربی زبان میں بیش از بیش اضافہ کیا اور عربی زبان کو دنیا کی سب سے بڑی اور مدون زبان بنا دیا۔

دوسری طرف رسول‌اللہ صلعم زبان کے مجتہد اور امام تھے، آپ کے کلام میں نئے نئے اسالیب کلام اور مذاهب بیان، تراکیب اور اصطلاحات ہوتی تھیں جس سے زبان کا خزانہ مالامال ہوگیا، بہت سی ضرب‌الامثال، محاورے اور تعبیرات خالص آپ کی ایجاد ہیں۔

خلافت کے ساتھ ہی ساتھ کتابت (نثرنگاری) اور خطابت نے ترقی کی۔ عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ولید کے زمانے میں دفتر کی زبان عربی ہوگئی اور اس سے زبان کی عمومیت اور اس کے ذخیرے میں بہت ترقی ہوئی۔ خلافت بنو امیہ میں انشا نے ایک فن کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ اس وقت کا طرز نگارش حسب ذیل تھا:

الفاظ میں شیرینی، تراکیب میں شان اور اسی کے ساتھ اختصار اور سادگی ہوا کرتی تھی، متکلم کے کلام اور واحد کے خطاب میں جمع کی ضمیریں استعمال نہیں ہوتی تھیں، "بسم‌اللہ" سے ابتدا ہوتی تھی، اس کے بعد "من فلان الی فلان" یا "انی احمد اللہ الذی لا الہ الا ھو" لکھتے تھے اور "والسلام" یا "السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ" پر ختم کرتے تھے۔ ولید نے کچھ تکلف کیا جس کی وجہ سے کچھ دنوں کے لیے اس کا رواج جاتا رہا، پھر اس سے زیادہ شروع ہوگیا اور عبدالحمید نے تو اس کو ایک مستقل فن بنا دیا اور اسے بہت ترقی دی۔ خلاصہ یہ کہ نثر نے چالیس برس

میں دین کی برکت سے ترقی کی بہت بڑی مسافت طے کی اور اس کے سامنے جاهلیت کی رسم کی کوئی چیز باقی نہیں رهی۔ نسبتاً شعر سے نثر نے اسلام سے زیادہ فائدہ اٹھایا اس لیے کہ اسلام کو اس کی ضرورت زیادہ تھی۔

عبدالحمید بن یحیی انشا پردازی کا مجدد بلکہ موجد اور اس فن کا امام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عبدالحمید سے نثر نگاری کی ابتدا هوئی اور ابن عمید پر ختم هوگئی۔ اس نے نثرنگاری کو بہت ترقی دی، بہت سی اصلاحات کیں اور اس کے عہد میں انشا ایک مستقل فن اور ایک شریف پیشہ بن گیا، اس نے اس کے خاص اصول اور قواعد مقرر کیے، نئے اسالیب بیان وضع کیے، تفنن اور تنوع اختیار کیا، سیاسی اور اجتماعی حالات نے اس کی مساعدت کی اور سلطنت کی ضروریات، زمانے کی ترقی اور ذوق کی تبدیلی نے اس کی قدردانی اور همت افزائی کی۔ عبدالحمید پہلا شخص هے جس نے رسائل میں طوالت اور تصانیف میں حمد کی ابتدا کی۔ اس کے رسائل بہت بلیغ هوتے تھے۔ ابن ندیم کا بیان هے کہ اس کے رسائل ۸ هزار صفحات سے کم نہ هوں گے مگر هم تک اس کا بہت کم حصہ پہنچا هے۔ کتب‌خانہ خدیویہ میں ایک مختصر قلمی نسخہ هے جو عبدالحمید کی طرف منسوب هے۔

خطابت کی ترقی کے اسباب میں اسلام کو بہت بڑا دخل هے۔ عہد اسلام میں خطیبوں نے بڑی خدمات انجام دی هیں۔ دینی دعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اصلاح مفاسد، رد بدعت اور لشکر کو جنگ کے لیے آمادہ کرنا اور جوش دلانے کے لیے هر موقع پر خطابت کی ضرورت تھی اور خصوصاً حضرت عثمان کی شہادت کے بعد اور سیاسی اختلافات کے وقت خطابت نے بڑی ترقی کی۔ حقیقت میں خطابت کا دور سقیفہ بنی ساعدہ سے شروع هوتا هے۔ هر جماعت کو قدم پر قدم خطابت کی ضرورت پڑتی تھی اور خوب خوب زبان کے جوهر دکھلانے کا موقع ملتا تھا۔ چنانچہ طبعی طور پر اس دور میں جو سیاسی، ملکی اور دینی انتشار کا زمانہ تھا، کثرت سے باکمال خطیب پیدا هوئے۔ اس وقت کی خطابت کی خصوصیات حسب ذیل تھیں:—

شیرینی الفاظ، پختگی اسلوب، قوت تاثیر، قرآن سے کثرت سے اقتباسات اور وزن و سجع میں حتی الوسع اس کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے اور حمد و صلوۃ سے شروع کرتے۔ خطابت کا طریقہ اس وقت تک ایام جاہلیت ہی کا تھا۔ عمامہ باندھنا، چھڑی لینا، بلندی پر کھڑے ہوکر تقریر کرنا وغیرہ پر سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔

حقیقت میں اسلام کا کوئی دور خطابت میں اتنا بلند تھا اور نہ اس کثرت سے خطبا پیدا ہوئے جتنے اس دور میں تھے۔ اس دور کے مشہور خطبا سحبان بن وائل، زیاد بن امیہ، حجاج بن یوسف، قطری بن فجاۃ وغیرہ تھے۔

عہد اسلام میں رسائل کو بھی اچھی خاصی ترقی ہوئی۔ تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں بہت زیادہ خطوط لکھنے پڑتے تھے۔ یہ رسائل عموماً مختصر ہوتے تھے وہ لکھتے وقت محض مقصد پیش نظر رکھتے، سادے سے سادے الفاظ اور مختصر سے مختصر عبارت میں وہ اپنا مطلب ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ عبارت آرائی نہیں ہوتی تھی، جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے۔

تمدنی اور علمی حیثیت سے بنو عباس کا زمانہ ترقی یافتہ دور کہلایا جاسکتا ہے۔ یہ اسلامی فنون، عربی ادب اور اجنبی علوم کی گرم بازاری کا عہد تھا۔ اس وقت عربی دماغ بھی بہت پختہ اور ترقی یافتہ ہوچکا تھا، حکومت عباسیہ اور دولت امویہ سے چند باتوں میں بالکل ممتاز ہے، جس کی اثر سے زبان محفوظ نہ رہ سکی۔ دولت امویہ خالص عربی سلطنت تھی؛ اس میں پوری عربیت، عربی عصبیت اور عربی خصوصیات اور رنگ موجود تھا۔ اس کا دارالسلطنت بھی دمشق جیسی مرکزی جگہ پر تھا اور اس کے لشکر میں اعلی سردار سے لے کر معمولی سپاہی تک سب عرب تھے اس لیے زبان میں تمدن اور آبادی کے بڑھ جانے سے جو اثرات پیدا ہوسکتے تھے اور اس کے لازمی نتائج تھے، ان کے سوا کوئی انقلاب نہیں ہوا۔

حقیقت میں بنوامیہ نے اپنی عربی خصوصیات، قومی روایات اور زبان کے ترکہ و میراث کی پوری حفاظت کی، اس لیے اس کا دور عربیت کے لیے مبارک ترین دور ثابت ہوا۔ لیکن اس کے برخلاف دولت عباسیہ پر ایرانی رنگ غالب تھا اور یہ سیاسی

حالات کے لازمی نتائج تھے اس لیے عجمیوں کا تسلط اور ان کا اثر نہ صرف سیاست میں بلکہ تمدن میں، زبان میں اور ادب میں پورا پورا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ چند نئی چیزیں پیدا ہوئیں یعنی قومی تاثیر، اختلافات عقائد، الحاد، بےحیائی اور تکلفات ان چیزوں کا اثر زبان و ادب پر بہت خاصا پڑا۔

دولت امویہ کے اواخر اور سلطنت عباسیہ میں عربی زبان دنیا کی سب سے بڑی بین‌الاقوامی، مذہبی، علمی اور سیاسی زبان بن چکی تھی اور تقریباً تمام ممالک مفتوحہ متعرب ہوچکے تھے۔ اس لیے طبعاً لحن زبان میں عام ہوگیا اور عجمیت کی وبا عام ہوگئی، یہاں تک کہ ایک مستقل عامی زبان بن گئی جس میں خاص ملک کی زبان کے الفاظ رائج تھے۔

عصر عباسی میں زبان کا دائرہ تمدن اور نئی علمی ترقیوں اور تحقیقوں کی بنا پر وسیع سے وسیع‌تر ہوتا گیا۔ اس میں کثرت سے فارسی، ہندستانی اور یونانی زبانوں کے الفاظ داخل ہوگئے اور مذاق کی لطافت اور سہولت کی وجہ سے الفاظ میں دقت پیدا ہوتی گئی، علمی اصطلاحات، انتظامی اور سیاسی، اقتصادی اور خانگی الفاظ کا اضافہ ہوا۔ عربی زبان سے فارسی زبان نے صرف مفردات ہی نہیں لیے بلکہ اسالیب بھی اخذ کیے، خطاب میں تعظیم، مخاطب کے ساتھ تکلف اور حضرت اور جناب اور مجلس کی طرف نسبت کرنا اور خلفا، وزرا، امرا اور افسروں کے نئے نئے القاب، خطوط وغیرہ طویل اور مترادف الفاظ سے بھرے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اور دوسری چیزیں ہیں جنھوں نے ایک طرف زبان کو زینت دی تو دوسری طرف اسے سخت نقصان پہنچایا۔ سنہ ۲۳۲ھ سے عربی کی رہی سہی سلطنت اور فوقیت جاتی رہی اور ترکوں کا زور ہوگیا۔ اس نے طبعی طور پر عربوں کو نقصان پہنچایا، تاتاریوں کے بغداد پر حملے نے تو اس کا خاتمہ ہی کردیا ہوتا لیکن قرآن نے اُس وقت سے لےکر اِس وقت تک پوری حفاظت کی۔

عباسیوں کی ترقی کے زمانے میں بہت سی چیزیں نئی پیدا ہوئیں اور نثر کو مرصع اور مزین بنانے کے طریقے نکلے۔ اس کے نئے نئے موضوع پیدا ہوئے، اب وہ

صرف دفتری خطوط اور فرامین کی زبان نہیں رہی بلکہ تصنیف و تالیف، مضامین ومقالات، معاہدے، وصف مناظر اور مختلف ضرورتوں اور تقریبوں کے لیے استعمال ہونے لگی۔ اب انشا کو وہی اہمیت حاصل تھی جو خطابت کو حاصل تھی۔

عصر عباسی کی ابتدا میں نثر نگاری عبدالحمید ہی کے طرز نگارش پر رہی جس کی خصوصیت اختصار اور اعتدال ہے۔ تمدن اور ایرانیوں کے ساتھ اختلاط نے تانق اور تکلف بڑھا دیا یہاں تک کہ قدیم اسلوب بالکل متروک ہوگیا اور مسجع، اشعار اور ضرب الامثال کا استعمال عام ہوگیا لیکن ابھی تک لفظی تکلف رائج نہیں ہوا تھا۔ خلافت کے زوال کے ساتھ ہی ساتھ نثر نگاری میں بھی زوال شروع ہوا اور سادہ نثر لفظی صنائع و بدائع میں الجھ کر رہ گئی۔ بظاہر شاندار و بارونق مگر حقیقت میں قالب بے روح اور جسم بےجان تھی۔ علمی اور تاریخی کتابیں بھی اس وبا سے نہ بچ سکیں۔ اس وقت سے نثر کا وہ مبتذل اور بےجان طریقہ نکلا جس نے طبیعتوں کو مضمون کو اور پڑھنے والوں کے مذاق کو خراب کردیا۔ اس زمانے کے لکھنے والوں میں چار طبقے تھے جن میں ہر طبقہ ایک ایک زمانے میں کامیاب تھا۔ ایک طبقہ وہ ہے جس کا امام ابن المقفع ہے۔ اس کی خصوصیات میں عبارت کئی طریقوں سے ادا کرنا، جملوں کو علیحدہ علیحدہ کرنا، روانی کا خیال رکھنا، مضمون کا اہتمام کرنا اور سجع سے اجتناب کرنا، وغیرہ ہے۔

دوسرا طبقہ جس کا امام جاحظ ہے، اس کا طریقہ پہلے طریقے سے یعنی عبارت کی شیرینی اور روانی وغیرہ میں بہت مشابہ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ یہ ایک جملے کو مختلف مقفّی یا مرسل فقروں میں قطع کردیتا ہے، الفاظ اور جملوں میں زیادہ طول ہوتا ہے، حکمت کے ساتھ ساتھ ظرافت کی چاشنی بھی ہوتی ہے، مضمون کی تحلیل اور اس کا استقصا ہوتا ہے، دعائیہ جملے کثرت سے آتے ہیں، اس طبقے میں ابن قتیبہ، مبرّد اور نوری مشہور ہیں۔

تیسرا طبقہ ابن العمید کا ہے۔ اس کی نثر بظاہر دل آویز معلوم ہوتی ہے اور اچھی خاصی نظم ہوتی ہے، صرف وزن کی کمی ہوتی ہے، چھوٹے چھوٹے قافیے اور مجانست

تاریخی و علمی لطائف، چٹکلے، اشعار اور تشبیہات اس کے لوازم میں سے ہیں۔ اس طبقہ میں صاحب ابن عباد، مہلبی، خوارزمی، بدیع‌الزماں، صابی و ثعلبی مشہور ہیں اور اسی طبقہ کی یادگار "مقامات" ہے۔

چوتھا طبقہ قاضی فاضل کا ہے۔ اس کا طریقہ تیسرے طریقے کے اصول کا پابند ہے لیکن توریہ اور مجانست میں بہت غلو ہے یہاں تک کہ انشا اس کے زمانے میں بالکل ملمع، مصنوعی اور الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔

اس وقت کے ذوق کے مطابق سب سے زیادہ جاحظ، ابن مقفّع کا دور اور ان دونوں سے زیادہ ابن خلدون کا طرز انشا ہے اور قاضی فاضل کے بعد سے ابن خلدون کا تتبع کیا گیا چنانچہ اس وقت کی عربی نثر سب سے زیادہ ابن خلدون اور غیر زبانوں کی نثر سے متاثر ہے۔

خطابت کی دولت عباسیہ کی ابتدا میں بہت کچھ اہمیت اور حیثیت تھی لیکن رفتہ رفتہ اس کو زوال ہوتا گیا اور اس کی جگہ انشا نے لےلی۔ یہاں تک کہ صرف عیدین اور جمعہ کے خطبے باقی رہ گئے، وہ بھی محض رسمی۔

مقالات گارساں دتاسی

ہندستانی زبان و ادب

سنہ ۱۸۷۳ ع میں

۱۔ «سال نو نے گزرتے ہوئے برس کی جگہ لے لی ہے۔ ہماری زندگی کے دن بھی یوں ہی گزر رہے ہیں اور ہم ان کی رفتار دیکھ نہیں سکتے» یہ ہماری محبوب پیرسی عشائے ربانی کے خطبۂ نوروز کے ابتدائی الفاظ ہیں۔ وقت حقیقت میں تیزی سے گزر رہا ہے کیونکہ یہ بائیسویں مرتبہ ہے[1] کہ میں جدید ہندستان کی خاص زبان «ہندستانی» کے متعلق «سالانہ تنقید» پیش کر رہا ہوں۔ یہ زبان باوجود مخالفتوں اور رد عمل کے اب تک اپنی افضلیت برابر برقرار رکھے ہوئے ہے اور دن بدن زیادہ پھیلی جاتی ہے۔ جن دو شاخوں سے یہ زبان مرکب ہے ان میں سے اردو کو ہمیشہ سے اولین حیثیت حاصل ہے۔ دیکھیے کہ مسٹر جان بیمز (John Beames) جو صوبۂ اڑیسہ کے ناظم تھے اپنی کتاب «ہندستان کی جدید آریائی زبانوں کے تقابلی قواعد[2]» میں اس کے متعلق کیا کہتے ہیں:—

---

۱ میرے ابتدائی تبصرے سنہ ۱۸۶۹ ع تک «خطبات» کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ میں نے پہلے دس خطبوں کی فہرست یکم دسمبر سنہ ۱۸۶۲ ع کے خطبے میں دی ہے اور اس کے بعد کے سے سولھویں خطبے تک کی فہرست، سولھویں ہی میں یعنی ۲ دسمبر سنہ ۱۸۱۷ ع کے خطبے میں۔ آخری خطبات سنہ ۱۸۶۸ ع اور سنہ ۱۸۶۹ ع کے ہیں۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۷۰ ع سے «تبصرے» شروع ہوئے۔ پہلا خطبہ محاصرہ پیرس کے زمانے میں لندن میں شائع ہوا۔ بعد کے تبصرے سنہ ۱۸۷۱ ع اور سنہ ۱۸۷۲ ع کے ہیں اور ان کے بعد یہ۔

۲ "A comparative Grammar of the modern Aryan Languages of India" جلد اول۔ اس جلد پر ایک بہت دلچسپ مضمون لکھنؤ کے ہندستانی اخبار «اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ» کی اشاعت یکم اپریل سنہ ۱۸۷۲ ع میں شائع ہوا ہے۔

داں زبانوں کی صف اول میں هندی اور اس کی ضمنی شکلوں، گجراتی اور پنجابی کو جگه دینا چاهیے۔ ان کی پیدائش کا زمانه گیارهویں صدی عیسوی هے اور ان کا تعلق دوسری جدید زبانوں کی طرح واضح طور پر پراکرت سے هے۔ اس کے بعد مرهٹی کی باری آتی هے جو بارهویں یا تیرهویں صدی تک پراکرت کی شکل میں رهی اور بالاخر اڑیا که جس نے چودهویں صدی تک اپنی شکل پوری طرح نهیں بدلی تھی۔ اٹھارهویں صدی تک بنگالی آزاد زبان نه بن سکی۔ جب تک دهلی میں مسلمانوں کی مرکزی قوت کمزور هوتے هوتے اس درجه پر نه پهنچ گئی که صوبجات کے گورنر خود مختار هوگئے تب تک بنگالی هندی سے جدا نه هوسکی اور نه وه رسم‌الخط اختیار کرسکی جو آج ایک مختلف زبان هونے کی حیثیت سے اپنا حق سمجھ کر اس نے انتخاب کیا هے۔ سندهی زبان بڑے پراسرار طریقے پر پیدا هوئی اور نشو و نما پاتی رهی۔

زبانوں کے اس مجموعے کے مستقبل کے متعلق پیشین‌گوئی کرنا بهت دشوار هے۔ اس کا پورا دارومدار سیاسی حالات پر هے جس کے متعلق کچھ نهیں کها جاسکتا۔ پھر بھی اگر تھوڑی بهت قیاس آرائی کی جائے تو اس کا امکان نظر آتا هے که ذرائع آمد و رفت ریل گاڑیوں اور دوسرے ذرائع حمل و نقل کی بڑھتی هوئی افراط کا نتیجه یه هوگا که پنجابی اور راجپوتانے کی بولیاں معدوم هوجائیں گی اور بجائے ان کے ایک یکساں سی زبان عام طور پر اختیار کرلی جائے گی یعنی فارسی آمیز هندی (هندستانی) جو دریائے سنده سے لےکر راج محل تک همالیه سے لےکر بندهیاچل تک رائج هوجائے گی۔ بنگال کے ایک بهت بڑے حصے میں هندستانی عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی هے[1]۔ اڑیسه اور مرهٹی علاقوں میں ان لوگوں کی تعداد (ان میں اکثر کا تعلق نیچ ذاتوں سے هے) جو اردو استعمال کرتے هیں بهت وافر هے اور دن بدن اس تعداد میں اضافه هوتا جاتا هے۔ مختصر یه که اگر صوبجات کی علیحدگی کی وجه سے جو رکاوٹ هے وه دور هوجائے اور ملک کے مختلف حصوں میں آزاد ذرائع آمد و رفت کا رواج

---

۱ مشرقی بنگال کے بڑے مرکزوں، ڈهاکه، چٹاگانگ، باریسال میں بنگالی سے زیاده هندستانی بولی جاتی هے (Annales de la propagation de la for شمارهٔ جولائی سنه ۱۸۷۳ع)۔

ہوجائے تو اردو وہی جو اس قدر صاف، سادہ، لطیف زبان ہے، جو ہر طرح کی بات کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جو اب بھی حقیقت میں ہندستان کے بہت سے حصوں میں «اپنا فرانکا» کا کام دیتی ہے اور جو فاتح قوم کی خاص چہیتی ہے، بلا شک ایک ایسی زبان نظر آتی ہے جو جلد یا بدیر ہندستان کی صوبجاتی بولیوں میں سب کی نہیں تو اکثر کی جگہ لے لے گی اور پورے آریائی ہند کو ایک متجانس اور مہذب بولی عطا کرے گی[1]۔

مسٹر بیمز کی کتاب پر ایک مضمون میں مسٹر جی۔ گاریز (G.Garrez) نے یہ تشریح کی ہے۔ «مسٹر بیمز کے ہندی کے متعلق وہی خیالات ہیں جن کا ایم گارساں دتاسی ہمیشہ اظہار کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے سنسکرت دانوں کے تعصب کو چھیڑا ہے، یہ کہنے کی جرأت کی ہے کہ مسلمان شاعروں کی زبان بھی اتنی ہی خالص ہے جتنی کہ ہندو شاعروں کی زبان اور اسلامی رسم‌الخط دیوناگری رسم‌الخط سے زیادہ سہل ہے اور اردو کو فی‌الحقیقت ہندستان کی قومی زبان بننے کا زیادہ موقع اور زیادہ حق حاصل ہے»۔

مشہور مسلمان سید احمد خان نے بنارس میں ایک دعوت میں جو انھوں نے اپنے آزاد خیالات کے لحاظ سے اپنے مسلمان اور عیسائی دوستوں کو اپنے صاحبزادے کی انگلستان سے واپسی پر ۲۶ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع کو دی تھی، اپنے جام صحت کی تجویز کا جواب اردو ہی میں دیا تھا[2]۔ یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ اس قسم کی صحبت جمع ہوئی تھی مگر توقع ہے کہ یہ آخری موقع نہ ہوگا۔ پہلے تو جس کے لیے یہ دعوت کی گئی تھی اس نے اپنے سفر انگلستان کا حال بیان کیا جس سے کئی چیزوں کے متعلق اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے ہندستان اور انگریزوں کے اتحاد کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایسا اتحاد جو اس کے خیال میں سیاسی سے زیادہ سماجی اہمیت رکھتا تھا۔ اس قسم کا اتحاد بہت آسانی سے ممکن ہے اگر دونوں میں سے

۱ یہ دیباچۂ جلد اول صفحہ ۱۲ سے ماخوذ ہے («اخبارالاخبار» مورخۂ ۱۵ اگست سنہ ۱۸۷۳ع نے اس عبارت کا ترجمہ کیا ہے اور اس رائے سے کامل اتفاق کیا ہے)۔

۲ علیگڈھ اخبار ۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ع۔

ہر ایک دوسرے کی خوبیوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور اس تقریب کے لیے مواقع اتحاد کے لیے سہولتیں فراہم کرتے ہیں اور ہندستانیوں کو اپنے فاتحوں اور حاکموں سے نہیں بلکہ اپنے ایسے دوستوں سے ملنے کا موقع دیتے ہیں جو ان کی طرح اسی بادشاہ کے وفادار ہیں۔

ہم عصروں میں فیض علی خاں قابل ذکر ہیں جنھوں نے اسی یک جہتی کے جوش میں یہ تحریک پیش کی ہے اور اس تحریک میں بہت سے انگریز بھی ان کے ہم خیال ہیں کہ اگر ہندستان میں انگریزی کی تعلیم لازمی قرار دی جائے، جیسی کہ بعض اصحاب کی رائے ہے تو اس کے ساتھ انگریزوں کے لیے بھی ہندستانی کی تحصیل لازمی مقرر کی جائے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ لندن میں ایک خالص کالج قایم کیا جانا چاہیے جہاں متعدد منشی نوجوان انگریزوں کو نہ صرف نظری بلکہ عملی طور پر ہندستانی کی تعلیم دیں اور اس طرح کہ وہ روزمرہ کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور بے تکلفی سے بات چیت کرسکیں۔ ان کے خیال میں اس کی بھی ضرورت تھی کہ عام علوم سے متعلق ایک انگریزی ہندستانی ڈکشنری تیار کی جائے اور سستے داموں ہندستان کے شہروں اور قصبوں میں بیچی جائے تو اس کا اثر بہت مفید ہوگا۔

سر ولیم میور کو ان خیالات سے اتفاق ہے۔ طامسن کالج رڑکی میں جو سول انجنیرنگ کی تعلیم کے لیے پچیس سال سے قایم ہے، اپنی تشریف آوری کے موقع پر، ۲۳ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع کو انھوں نے اردو زبان میں طلبا کو اپنے اسی مشفقانہ اور پرمغز انداز تقریر میں مخاطب کیا جس کے ہندستانی خوگر ہیں اور جس کی وجہ سے وہ ان سے محبت کرتے ہیں[2]۔ اس سال ۱۲ جنوری کو جو دربار انھوں نے آگرے میں علاقہ کی باریابی کے لیے کیا اس میں بھی یہی عمل کیا[3]۔ یہ تقریر میرے خیال میں سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس میں مسئلہ تعلیم نسواں کا ذکر ہے، ان عورتوں کی تعلیم کا جو زنانے کی دیواروں میں دنیا سے اس طرح پوشیدہ ہیں کہ یورپ کے

---

۱ Allen's Indian Mail ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع
۲ علیگڑھ اخبار ۱۷ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع
۳ علیگڑھ اخبار ۲۱ فروری سنہ ۱۸۷۳ع

کسی حصے میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی"۔ تقریر کے خاتمے پر انھوں نے کہا کہ جب تمھاری عورتیں تعلیم حاصل کرلیں گی اور حقیقت میں تمھاری شریک زندگی اس طرح بنیں گی کہ انھیں بھی وہی مرتبہ حاصل ہوجائے گا جو تہذیب یافتہ ممالک میں عورتوں کو حاصل ہے تو ان کا فیض ہندستان میں اس طرح پھیلے گا جیسے ہمالیہ کی برف پگھل کر ندیوں کی شکل میں بہنے لگتی ہے اور ایک نئی زندگی اختیار کرتی ہے۔ بغیر اس انقلاب کے دوسری جنس ہرگز سماجی زندگی میں اعلے درجے تک نہیں پہنچ سکتی۔

کچھ دن کے بعد ۲۴ جنوری کو بہ سلسلہ تقسیم انعامات "سان اے تین کالج" میں جسے مشنریوں نے "روم ایشیائی" یعنی دہلی میں قایم کیا ہے اور جس میں تقریباً ایک ہزار طلبا اور طالبات زیر تعلیم ہیں، سر ولیم نے ریورنڈ آر آر ونٹر کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے اپنے اعلیٰ خیالات کا اردو ہی میں اظہار فرمایا[1]۔

ہندی کے متعلق اخبار الاخیار مورخہ ۱۵ نومبر ۱۸۷۲ ع سے ہمیں اطلاع ملی کہ آئندہ سے اضلاع متوسط ہند میں دفاتر اور عدالتوں میں بجائے اردو کے ہندی سے کام لیا جائے گا اور سرکاری گشتیاں بھی اسی زبان میں نکلا کریں گی۔ بجز سرکاری رپورٹوں اور رجسٹریوں کے فارسی رسم الخط بالکل استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس تبدیلی کے بعد ان اضلاع میں جہاں اس رجعت پسندانہ طرز عمل کا اقدام کیا جائے گا غالباً نئے سیفہ دار مقرر کیے جائیں گے۔ سرکاری حکم سے اس قسم کی تبدیلی دارجلنگ میں اور بنگال میں بھی ہوتی ہے۔

"صحیفہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندستان میں آج کل یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ناگری یا دیوناگری رسم الخط ہندستانی زبان کی تحریر کے لیے فارسی رسم الخط سے زیادہ موزوں ہے۔ کامیابی کا سہرا اس سوال کے اثباتی جواب کے سر ہے اور ابھی سے تبدیلی شروع ہوگئی ہے۔ فارسی حروف کی بجائے ناگری حروف کے استعمال کی وجہ یا سچ پوچھیے تو بہانہ[2] یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اول الذکر کے حروف شکستہ

---

۱ علی گڑھ اخبار ۳۱ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ع۔

۲ یہ حقیقت میں بہانہ ہے کیونکہ ناگری کے قلم برداشتہ حروف کے پڑھنے میں خط شکستہ سے زیادہ دقت ہوتی ہے۔

پڑھنے میں دقت ہوتی ہے اور اس لیے مناسب ہے کہ اب ہم دیوناگری کا استعمال شروع کر دیں — اس بدشکل اور بے وضع رسم الخط کا استعمال جو مدتوں سے متروک ہے۔"

اخبار عالم میرٹھ (مورخۂ ۱۴ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع) نے بھی اسی مضمون پر اسی قسم کی اطلاع شائع کی ہے۔ "ایک عام مجلسے میں اس سوال پر بحث کی گئی کہ کون سی زبان اور کون سا رسم الخط بہتر ہے۔ اکثریت نے فیصلہ یہ کیا کہ ہندی زبان اور ناگری حروف زیادہ موزوں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبۂ ناگپور میں جوڈیشل کمشنر کے حکم سے سرکاری تحریرات کی زبان ہندی اور رسم الخط ناگری ہو گیا۔ لفٹننٹ گورنر نے پریسیڈنسی کے کچھ اور اضلاع کے متعلق بھی یہی حکم صادر کیا ہے۔"

اسی رد عمل کے اثر میں ایک عرضی صوبجات شمالی و مغربی میں بھی شائع کی گئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ عدالتوں میں بجائے فارسی کے ناگری رسم الخط کو رواج دیا جائے۔ قدرتی طور پر اس تحریک کی بانی ہندو جماعت ہے۔ بابو ہریش چندر نے بھی اپنے "کوی بچن سدھا[1]" میں پانیر[2] کے ایک بہت ہی اچھے مقالے "جس میں اردو کی حمایت کی گئی ہے" کے ایک ایسے جواب کو جگہ دی ہے جس میں سخت حملے کیے گئے ہیں اور جو محض اپنی مخالفت کی وجہ سے واہیات معلوم ہوتا ہے۔

اس کے برعکس دوسری طرف علیگڑھ اخبار[3] جو کچھ لکھتا ہے وہ بھی سنیے:

"ان لوگوں کے لیے جو ہندستان کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہوئے پوری قوت سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ناگری رسم الخط اختیار کیا جائے، بہتر ہوگا کہ صوبجات شمال مغربی کی تعلیمی رپورٹ کے ضمیموں کو پڑھ لیں۔ وہ دیکھیں گے کہ اس صوبے کے آٹھ ضلعوں میں ان طلبا کی تعداد جو فارسی حروف استعمال کرتے ہیں ناگری حروف استعمال کرنے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس سے یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ان اضلاع میں عام طور پر فارسی حروف استعمال کیے جاتے ہیں اور ان کی تبدیلی کی کوئی خواہش نظر نہیں آتی"۔

---

۱ شمارۂ ۸ اگست سنہ ۱۸۷۳ع۔ ۲ شمارۂ ۱۵ جولائی سنہ ۱۸۷۳ع۔
۳ شمارۂ ۲۹ اگست سنہ ۱۸۷۳ع۔

سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا اخبار[۲] یہ اطلاع دیتا ہے کہ پٹنہ اور بہار کے دیگر مقامات کے رہنے والوں نے سرکار میں ایک عرضداشت پیش کی ہے جس میں یہ استدعا کی گئی ہے کہ ہندستانی (فارسی) حروف کی بجائے ناگری حروف استعمال کرنے کے جو احکامات جاری کیے گئے ہیں واپس لے لیے جائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل سے کاروبار میں رکاوٹ ہوئی اور نقصان پہنچا اور اس کے نتائج سے جو زحمتیں پیش آئیں وہ عرصے تک محسوس ہوتی رہیں گی۔ اسی لیے اس مبحث پر کوئی یہ توجیہ پھر نہیں پیش کرسکتا کہ یہ فی الحقیقت اردو زبان کی جگہ دوسری زبان کو جانشین کرنے کا سوال نہیں ہے بلکہ محض دوسرے رسم الخط کا سوال ہے۔ منشی ناشی رتھ[۲] اور فضل پنڈت ہریش چندر نے بھی اسی قسم کی توجیہیں پیش کی ہیں۔ منشی جی اس مبحث پر لکھتے ہیں کہ[۳] "اردو اور ہندی زبانیں حقیقت میں ایک ہیں کیونکہ سنسکرت کے دقیق اور ناقابل فہم الفاظ سے عاری ہندی اور عربی و فارسی کے مقبول الفاظ سے خالی اردو میں کوئی فرق نہیں۔ اس زبان کو اردو کہیے یا ہندی جو آپ کا جی چاہے مگر فی الحقیقت یہ محض وہی عام زبان ہے، ادنا سے خالی، مردہ یا بیرونی زبانوں سے ماخوذ، مگر صوبۂ شمالی و مغربی کی پوری آبادی میں رائج۔ میں اردو یا ہندی کی کسی اور تعریف کو سمجھنے یا ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں کہ اردو کب پیدا ہوئی۔ مصنفین دہلی کی قدیم تصانیف نظم و نثر آج ہندی سمجھی جاتی ہیں جو فارسی رسم الخط میں لکھی گئی ہے۔۔۔۔"

یہ اصلی ہندی جو محاورۂ عام میں ناگری کہلاتی ہے ہرگز ہندستانی اردو کی مترادف نہیں جو ہندستان کے بہت سے بڑے بڑے صوبوں کی مادری اور خاص زبان ہے اور جس کو کم و بیش ہندستان کی آبادی[۴] کا بڑا حصہ بول سکتا ہے، وہ تمام لوگ جنھوں نے اس خوبصورت سرزمین کی سیاحت کی ہے اس کے متعلق یہی بیان پیش کرتے ہیں۔

---

۱ اخبار انجمن پنجاب ۲۷ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ء۔ ۲ علیگڑھ اخبار ۳ جنوری سنہ ۱۸۷۳ء۔

۳ ہریش چندر میگزین شمارۂ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ء صفحۂ ۱۱۔ ۴ آخری مردم شماری کی رو سے چھیاسی ملین رعایائے سرکار انگریزی میں اور پچپن ملین دیسی ریاستوں میں۔ سیلون اور سنگاپور کا اس میں شمار نہیں۔

ہندستانی زبان فرانسیسی مقبوضات ہند میں بھی اسی طرح استعمال ہوتی ہے جیسے ہندستان کے باقی حصوں میں۔ پان‌دی‌شیری میں تامل اصل میں ہندوؤں کی زبان ہے۔ مسلمانوں کی زبان ہندستانی ہے اور سپاہی بھی اس کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں بولتے۔ شاہی کالج میں بھی اس کی تعلیم دی جاتی ہے جب سے کہ سنہ ۱۸۲۶ع میں فرانسیسی افسر ہند متعینۂ [illegible] (اسپونتاز کے والد کاونٹ دے بے سین د زبش مون نے اس کی بنیاد ڈالی۔ موزین سست نے پیرس میں میرے درس میں شریک ہونے سے پہلے پان‌دی‌شیری ہی میں ہندستانی سیکھی تھی۔ وہیں مسٹر پال دکواردی (جو اب عدالت اپیل باؤ میں مشیر قانونی ہیں) اور مسٹر ریو (جو کمبرلے میں مفصلات کے مصنف ہیں) نے بھی یہ زبان سیکھی تھی۔ دونوں اس میں بے تکلفی سے گفتگو اور نوشت و خواند کرسکتے ہیں۔ محض پان‌دی‌شیری اور مدراس کے درمیان ریل جاری کرنے کا سوال باقی ہے۔ مدراس میں ہندستانی عام طور پر استعمال کی جاتی ہے اور اس طرح فرانسیسی نوآبادی میں یہ زبان زیادہ اہمیت حاصل کر سکے گی اگر ان دونوں شہروں کا باہمی تعلق بڑھ جائے۔

سر بارٹل‌فریر نے جن کے افریقی مشن نے بعد دقت سلطان زنجبار و زنگبار سید احمد برگش سے انسداد بدسلوکی حبشیان[1] کا عہدنامہ حاصل کرکے بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے' بڑے تعجب سے یہ دیکھا کہ ساحل افریقہ اور سقوطرہ اور مدغاسکر کی ساری تجارت ہندستانیوں کے ہاتھ میں ہے جس میں ہندو اور مسلمان برابر شریک ہیں اور انھوں نے وہاں ہندستانی بالکل اسی طرح بولی جاتی ہے جیسے ہندستان میں

[1] اس میں قلیوں پر تشدد بھی شامل تھا۔ یہ نام (قلی) ان ہندستانیوں اور چینیوں کو دیا جاتا ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے چند سال کے لیے خط غلامی لکھ دیتے ہیں۔ لیکن اصلیت میں اس کاروبار کے چلانے والوں نے اس پیشے کو بہت زیادہ گرا دیا ہے اور اس تجارت کو بہت فروغ ہو رہا ہے کیونکہ سنہ ۱۸۴۲ع کے بعد سے اب تک ایک ملین قلی محض جزیرۂ مارشیس میں درآمد کیے گئے ہیں۔ لفظ «قلی» کے اصل معنے ترکی زبان میں غلام ہی کے ہیں حالانکہ لفظ «غلام» اب زیادہ مستعمل ہے۔ یہ تو معلوم ہوگا کہ مشہور و معروف نادر شاہ کا اصلی نام «طہماسپ قلی» تھا یعنی «طہماسپ ثانی شاہ ایران کا غلام»۔

بولی جاتی ہے۔ انھوں نے اسی زبان سے اپنی گفتگو اور اپنے لکچروں میں بھی کام لیا کیونکہ انھیں ان تاجروں کو مخاطب کرنا پڑا کہ وہ اس قابل نفریں تجارت (تجارت غلاماں) میں کوئی حصہ یہاں تک کہ بالواسطہ حصہ بھی نہ لیں۔

ساحل عرب پر مسقط اور مکلا میں بھی انھیں ہندستانی بولنے کا موقع ملا۔ جہاں انھوں نے اپنے رفاہ عام کے مشن کے لیے اس زبان سے بڑی آسانی سے کام لیا[1]۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ سرکار انگریزی بجائے اس کے کہ پورے ہندستان کے لیے ایک زباں کی تحصیل لازمی قرار دیتی، جو ان حالات میں ہندستانی ہی ہوسکتی ہے، اس کی مخالفت کررہی ہے کیونکہ نہ صرف وہ طرح طرح کی ہمت افزائیوں سے صوبجاتی زبانوں میں جو ہندستانی کی وجہ سے مغلوب، افتادہ اور غیر مستعمل تھیں ایک نئی جان ڈال رہی ہے بلکہ ان زبانوں کو سرکاری کاموں میں بھی دخیل کر رہی ہے۔ ان زبانوں کی گرامریں اور ڈکشنریاں تیار کرہی ہے اور چونکہ ان میں سے اکثر میں ادب سرے سے مفقود ہے، سرکار ان میں ادب تیار کرانا چاہتی ہے اور ان دیسی لوگوں کی ہمت افزائی کے لیے معاوضے دیتی ہے جو ان زبانوں میں جو محض بول چال کی حد تک باقی رہ گئی ہیں، کتابیں لکھیں۔ وہ اپنے عہدہ داروں کو ان کی تحصیل پر مجبور کرتی ہے اور ان لوگوں کے لیے جو کامیابی سے اسے سیکھیں معاوضے کا وعدہ کرتی ہے۔ شمال میں اس نے پنجابی اور سندھی کو از سرنو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر تماشا دیکھیے کہ ہندستانی کے انسداد کے باعث خود اہل سندھ عدالتی کاروبار کے لیے بجائے اپنی زبان کے انگریزی کو ترجیح دیتے ہیں۔ سندھی میں انھیں یہ خامی نظر آتی ہے کہ عدالتی کارروائیوں کے لیے جس صحت بیان کی ضرورت ہے وہ اس میں میسر نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس مضمون کی ایک عرضداشت دفتر کراچی سے مقامی عہدہ دار کے پاس پیش کی گئی ہے[2]۔

---

۱ ایلن انڈین میل مورخۂ ۲۷ مئی سنہ ۱۸۷۳ء۔

۲ علی گڈھ اخبار ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۷۳ء۔

صوبجاتی بولیوں کو سیاسی اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے یہ اہمیت دی جارہی ہے مگر یہ چیز ہندستانیوں کے لیے نقصان رساں ہے کیونکہ اگر وہ زبان کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ رہیں گے تو مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔

مسٹر کیمبل جو ب سر جی کیمبل ہوگئے ہیں، جن کی کئی خاص خوبیوں کی وجہ سے لسانیات کے متعلق ان کے عجیب و غریب نظریوں پر نظر نہیں پڑتی، ہندستان میں متعدد زبانوں کے رواج کے پرجوش حامیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اردو کو علیحدہ کردیا جائے اور اس زبان سے انھیں جو نفرت ہے صاف ظاہر ہے۔ علیگڑھ سوسائٹی نے سائنس کی انگریزی کتابوں کے جو قابل تعریف ترجمے اردو میں کیے ہیں ان سے وہ مطمئن نہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ یہ ترجمے بنگالی اور اڑیسہ کی ٹھیٹھ زبانوں میں بھی کیے جائے[1]۔ مزیدبرآں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ نفرت بنگالی زبان تک بھی بلا ارادہ بڑھ گئی ہے[2] کیونکہ انھوں نے اہل آسام کے لیے آسامی زبان کے از سرنو استعمال کا حکم دیا ہے حالانکہ یہ زبان عرصۂ دراز سے متروک ہے اور اس کی جگہ بنگالی اور اردو نے لےلی ہے۔ جب اس حکم کی تعمیل کی جائے گی تو عدالتی کاروبار اور مدرسوں کے لیے اسی بولی کو استعمال کرنا پڑےگا یہاں تک کہ جب سر جارج کی گورنری بنگال کا زمانہ ختم ہوجائےگا تو حالات پھر اپنی قدرتی صورت اختیار کر لیں گے۔

ان نئے ضابطوں کا انگلستان میں کوئی اثر نہیں ہوا جہاں ہندستانی کی تعلیم میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ادھر کچھ دن پہلے جامعۂ کیمبرج میں سرکاری طور پر اس کی تدریس کا کوئی خاص انتظام نہ تھا بلکہ فارسی کی طرح اسے بھی عربی اور سنسکرت کے اساتذہ مسٹر پامر اور مسٹر کوول براہ مہربانی از خود پڑھا دیا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کی مجلس تنظیم نے اس صورت حال کے روکنے کے لیے مسٹر پامر کو جو عربی کی طرح ان دونوں زبانوں کے بھی عالم ہیں، اس زبان کی باقاعدہ تدریس کے لیے ایک خاص مشاہرے کے ساتھ مقرر کیا ہے۔ اور اب ہندستانی زبانوں کے

---

۱ انڈین میل ۲۴ مارچ سنہ ۱۸۷۳ء

۲ میرا "تبصرہ" متعلق سنہ ۱۸۷۲ء ملاحظہ ہو۔

''آنرز امتحان'' میں جو هندستانی سول سروس کے طلبا کے لیے اور ان طلبا کے لیے جو تقابلی لسانیات کی تیاری کررهے هیں، قایم کیا گیا هے، فارسی اور سنسکرت کے دوش بدوش اردو کی بھی تعلیم دی جاتی هے۔

جامعۂ کیمبرج کے ان طلبه کو جو هندستانی زبان سیکھنا چاهتے هیں اس نئی گرامر سے بہت فائدہ پہنچےگا جسے مسٹر جان پلیٹس شایع کررهے هیں۔ هندستان میں ایک عرصۂ دراز کے قیام اور مشهور اهل هند سے گہری ملاقاتوں کی وجه سے وہ اس کام کے بہت اهل هیں اور ان وجوهات سے توقع هے که وہ اس کام کو صحت سے انجام دے سکیں گے۔

جو لوگ هندستانیوں میں انگریزی زبان کی تعلیم پھیلانے سے دلچسپی رکھتے هیں وہ غالباً مسٹر الٹوڈس پری چارڈ کی کتاب جو انهوں نے اب انگلستان سے واپسی پر شائع کی هے The English Language on Nasmith practical system adapted to Oordoo بہت شوق سے پڑهیں گے یه کام جو انتهائی احتیاط سے دو فاضل مسلمانوں سید جعفر حسین اور مرزا خداداد بیگ کی مدد سے کیا گیا هے، ان هندستانیوں کے لیے جو انگریزی سیکھنا چاهتے هیں اتنا هی مفید ثابت هوگا جتنی که مسٹر نیس متھ کی اصلی کتاب ان انگریزوں کے لیے جو فرانسیسی سیکھنا چاهتے هیں۔ مسٹر پری چارڈ جن کو اس قاعدے پر پورا بھروسه هے اپنی کتاب Elementary Readings in Oordoo Physical Geography کی پہلی جلد مکمل کرچکے هیں اور ان کے اس قسم کے اور رسالہ جات جو علم هئیت اور تاریخ و جغرافیۂ یونانی وروما وغیرہ سے متعلق هیں، زیر طبع هیں۔

۲۔ ایک عجیب متضاد بات یه هے که اسی دوران میں جب گورنر بنگال اردو سے اپنی مخالفت کا کھلم کھلا اظہار کر رهے هیں اگر اخبار انجمن پنجاب[۱] کا بیان سچ هے تو حکومت نے اپنے خرچ سے اور اپنی نگرانی میں ایک بڑی لغت کی ترتیب و اشاعت کا حکم دیا هے جس میں کل اردو الفاظ شامل هوں گے۔ اس کام میں بڑی محنت اور

۱ شمارۂ ۱۱ جولائی سنه ۱۸۷۳ع۔

احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ علاوہ کئی اور لوگوں کے منشی فقیرچند متوطن عرب‌سرائے دھلی اور اسی پایہ‌تخت کے ایک اور ساکن منشی احمد نے باہم اس عظیم‌الشان کام کا بیڑا اٹھایا ہے جس کے لیے کئی برس کی شدید محنت درکار ہے۔

دوسری طرف صوبۂ شمال مغربی کے محکمۂ تعلیمات نے انگریز عہدہ‌داروں میں اردو اور هندی کی تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے یہ طے کیا ہے کہ ہر افسر کو جو اس زبان میں مہارت حاصل کرنے کا سرٹیفکٹ لے سکے‌گا ایک ہزار روپیہ معاوضہ دیا جائیگا اور بعض بعض صورتوں میں دو ہزار روپیے[1]۔

ایک خاص «جریدے» کے مطابق حکومت ہند نے ان مصنفوں کے لیے جو اس عام زبان میں بہترین کتابیں لکھیں‌گے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۲ء اور سنہ ۱۸۷۳ء میں انتیس هندستانی کتابیں اس اعزاز کی مستحق قرار دی گئیں[2]۔ ان کتابوں میں حسب ذیل بھی شامل ہیں۔

«داستان دانش آموز» مظاہر آسمانی و ارضی پر ایک ابتدائی کتاب مصنفۂ مولوی عبداللہ عبید کاکوروی۔

«صبح صادق اخلاق نا» از منشی کالکا پرشاد کانپوری۔

«تنبیہ‌التعلیم» از محمد مبارک‌اللہ متھرا۔

«گلدستۂ ادب» اخلاقی کہانیاں۔ از دیبی پرشاد اجمیری۔

«مراۃ الایشیا» ایشیا اور بالخصوص هندستان کا جغرافیہ از کلیان رامی میرٹھی۔

ان انعامات کے متعلق مدیر علیگڑھ اخبار کی رائے ہے[3]:—

«ہمیں یہ معلوم کرکے فخر کرنا چاہیے کہ دوران سنہ ۱۸۷۲ و سنہ ۱۸۷۳ء میں ہماری فیاض اور ہمدرد سرکار نے انتیس کتابوں پر جو هندستانی (اردو یا هندی) میں لکھی گئیں ان کے مصنفوں کو انعام عطا کیے ہیں اور اس بے‌مثل ہمت‌افزائی سے ان کے حوصلے اور بڑھ گئے ہیں۔ ان کتابوں میں سے آٹھ اخلاقیات سے متعلق ہیں،

۱ انڈین میل مورخۂ یکم دسمبر ۱۸۷۳ء۔
۲ اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ شمارۂ یکم جون سنہ ۱۸۷۳ء
۳ شمارہ ہائے ۳ و ۹ مئی سنہ ۱۸۷۳ ء

دو عام تعلیم سے، پانچ تعلیم نسواں سے - دو ریاضی پر لکھی گئی ہیں، دو علم هئیت پر، دو علوم طبیعیات پر، دو خیالی تصانیف ہیں، چار تاریخ یا جغرافیہ سے متعلق ہیں، ایک تاریخ طبیعی سے اور ایک علم حفظان صحت سے۔ ان کتابوں میں سے تین انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں، دو سنسکرت سے، ایک فارسی سے اور باقی سب تصنیفات ہیں۔ پانچ ہزار پانچ سو روپے کی رقم ان کتابوں پر انعاموں میں صرف کی گئی اور سرکار نے صرف اسی قدر فیاضی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ بعض مصنفوں سے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ اشاعت کے بعد ان کی کتابیں خریدے گی بھی اور اس کا بھی اعلان کیا ہے کہ آئندہ سال وہ دیسی (اردو یا ھندی) کتابوں کے مصنفین کو ہزار ہزار روپے کے پانچ انعامات عطا کرے گی۔

سائنس جو شمع کی مانند، بلکہ اس سے بھی زیادہ اور شمع کے شعلے کی مانند ہے، هندستانیوں کی طبائع کی وجہ سے همیشہ مسافت پر رہی اور وہ سرچشمے جو هندستان قدیم میں کثرت کے ساتھ پھوٹ نکلے تھے بالکل بند ہوگئے۔ یہ سرسبز باغ باد سرد جہالت سے اس حد تک ویران ہوگئے تھے کہ لوگ اس زمانے میں بھی انتہائے غفلت کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ قدیم کتابیں جن کو پڑھ کر وہ اس قدر محظوظ ہوتے ہیں آدمیوں نے نہیں بلکہ دیوتاؤں نے لکھی تھیں۔ اب ان سرکاری انعامات کی همت‌افزائی کی برکت سے وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ جو کام وہ دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے خود کرسکتے ہیں اور اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان تصانیف نے وہ درجۂ کمال حاصل نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا، پھر بھی ہم یہ توقع کرسکتے ہیں کہ جس طرح پودے شروع میں بہت نازک ہوتے ہیں لیکن اگر ان کی وقت پر باقاعدہ آبیاری کی جائے تو آخرکار ان میں پھل پھول نکلتے ہیں اسی طرح ہمارے ہم‌وطن وقت آنے پر وہ پھل پیش کریں گے جن کی خوشبو تازگی مشامہ اور آسودگی ذائقہ کا باعث ہوگی۔

میں اس سے قبل ذکر کرچکا ہوں کہ اردو عیسائی ادب کو فروغ دینے کے لیے

---

۱ Allen's Daily Mail ۱۷ فروری سنہ ۱۸۷۳ء

صاحب لفٹننٹ گورنر صوبۂ شمال مغربی نے اپنی جیب خاص سے ڈھائی ہزار روپے کے انعامات اس قسم کی ان تصانیف کے لیے مقرر کیے ہیں جو ان کے پاس بھیجی جائیں۔ بیس مسودے وصول ہوئے جن میں سے سات مشنریوں کے لکھے ہوئے تھے اور تیرہ ہندستانی عیسائیوں کے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر "Pligrim's Progress" کا اردو ترجمہ ہے جو شرف الدین جلیسوری نے اردو نظم میں کیا ہے۔ تین زبانوں میں اس کے ترجمے موجود ہیں اور اردو اور ہندی نثر میں بھی اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ ہندی میں منشی بھوانی پرشاد سے ٹن الموزہ نے ''مدغاسکر میں عیسائیت کی تاریخ'' لکھی ہے۔

اسی طرح کے ایک اور نئے انعامی مقابلے[1] کا آغاز " North India Tract and Book Society " الٰہ آباد کی جانب سے زیر سرپرستی سر ولیم میور، ہندستانی (اردو اور ہندی) میں عیسائی ادب کی اشاعت کے لیے ہوا ہے۔ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۷۴ع سے پہلے سیکریٹری کے پاس تصانیف کا پہنچ جانا ضروری ہے۔

دیسی ادب کی اصناف قدیمہ ہرگز متروک نہیں ہونے پائیں۔ آئے دن مجموعہ ہائے سخن یعنی دیوان شایع ہوتے رہتے ہیں اور ان کی طلب برابر جاری ہے۔

گزشتہ سال ''دیوان سروری'' کے نام سے منشی غلام سرور صاحب لاہوری نے اپنا دیوان محبوب سبحانی کی مدح میں شایع کیا ہے۔ حضرت محبوب[2] سبحانی مسلمانوں کے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں اور بکثرت مسلمان ان کے مزار پر کھنچ کھنچ کر آتے ہیں کیونکہ مسلمان اپنے بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کے لیے اکثر جایا کرتے ہیں اور اگر کوئی بزرگ شہید بھی ہیں تو سرخ یا سبز جھنڈیاں لے جاتے ہیں۔ ہندو بھی اسی قسم کے مظاہرات کرتے ہیں اور ہندستان ہمیشہ زائرین کی سفرگاہ بنا رہتا ہے۔

۱ اس مقابلے کی تفصیلات اور تصنیف کی نوع کے متعلق معلومات اقوین مبل مورخۂ ۸ جولائی سنہ ۱۸۷۳ع سے حاصل ہوسکتی ہیں۔

۲ ان کے حالات ''یاد داشت مذہب مسلمانان ہندستان'' میں درج ہیں صفحۂ ۸٦ -

ایک اور بہت مشہور اہل قلم کا دیوان، جن کا چند مہینے ہوئے انتقال ہوا ہے، لاہور ہی سے شائع ہورہا ہے۔ یہ مجموعہ محض دیوان نہیں کیونکہ اس میں غزلیات کے علاوہ قصیدے اور اردو کے سوا فارسی اور عربی قطعات بھی شامل ہیں جس کا حجم تقریباً دو سو بارہ صفحات ہوگا۔ ان میں سے کئی نظمیں مصنف کے زمانۂ حیات میں ہندستانی رسالے "کوہ نور" لاہور میں شائع ہوکر بہت مقبول ہوئی تھیں۔

سید غلام حیدر لکھنوی کی دو تصانیف قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلی موسوم بہ "سیر مقبول" کا موضوع آغا مقبول اصفہانی کی فرضی سیر و سیاحت ہے۔ یہ ایک جغرافیائی افسانہ[1] ہے جس پر علیگڑھ اخبار میں دو مضمون شائع ہوچکے ہیں ایک خود اڈیٹر کے قلم سے اور دوسرا بابو کاشی ناتھ کے قلم سے۔ دونوں مضامین تعریف سے پر ہیں۔ سیاحت و مہمات کے حالات کا پیرایۂ بیان بہت دلکش معلوم ہوتا ہے اور اپنی دلچسپی اور سادگی کے باعث سندباد جہازی اور داستان کامروپ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ سبق آموز اور اخلاقی اقوال سے پر ہونے کی وجہ سے اخلاقی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ کتاب جدید اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ اس کی (اردو ادب کی) اہمیت گھٹتا تو ایک طرف آئے دن وہ نئی تصانیف سے مالامال ہورہا ہے۔ مصنف اپنے ہیرو کو دنیا کے تمام ممالک کا سفر کراتا ہے، حالات طبعی دریاؤں اور پہاڑوں کا ذکر کرتا ہے، قدیم تاریخ بیان کرتا ہے اور جدید حالات دکھاتا ہے، پیداوار اور رسم و رواج سے واقف کراتا ہے اور پھر سب کے ساتھ چوبی نقش اور جغرافیائی نقشے شامل ہیں۔

لاہور میں سید عماد علی کی "تفسیر قرآن" کی طباعت شروع ہوگئی ہے۔ یہ کام بہت قابل قدر ہے کیونکہ یہ پہلی بار ہے کہ اردو میں مسلمانوں کی مقدس کتاب کی سچی تفسیر شایع ہو رہی ہے۔ اب تک صرف تراجم موجود تھے جن میں کہیں کہیں حاشیوں پر تشریح بھی کردی جاتی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت بھی مسلمانوں کی بیداری کی نشانی ہے جس کا میں نے اکثر ذکر کیا ہے۔ زیرنظر کتاب میں پہلے

---

۱ آکٹیو و تقطیع کے ۲۳۲ صفحات مطبوعۂ کانپور۔

تو اصل آیات ہیں، پھر ان کا لفظی ترجمہ (لفظی لیکن صاف اور واضح) اور پھر تفسیر جس میں بحث اور ضروری تشریحات داخل ہیں۔

سید اشرف علی گلشن آبادی نے جو چونتیس[۱] مختلف کتابوں کے مصنف ہیں بمبئی سے « تحفۃ المثال فی الاصطلاحات و الامثال » کے نام سے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی ضرب الامثال اور محاورات کا مجموعہ شایع کیا ہے۔

بیگم صاحب بھوپال جو اس سے پہلے اپنے حالات حج تحریر کرچکی ہیں، اب اردو ہی میں اپنی ریاست کے دوسرے کا حال نظم و نسق کی بہتری کے لیے شائع کرنے والی ہیں[۲]۔

ہندی تصانیف میں سے، جو حال میں شایع ہوئی ہیں، قابل تعریف منشی شیو پرشاد کا مکمل رسالۂ علاجات مستعمل ہندستانیاں ہے۔ اس کے بعد « منوسمرتی » (منو کا قانون) جو سنسکرت سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

« اودھ راج چرتر » کو بریلی کے پنڈت دیودت نے سنسکرت سے ترجمہ کیا ہے۔

« سچی بہادری » جس کو پنڈت رام برن نے اسی عنوان کی اردو کتاب « سچی بہادری » سے ترجمہ کیا ہے۔ فارسی لفظ بہادری، ہندی لفظ برتا کے ہم معنی ہے۔

« وکرم اروسی » کو الہ آباد کے رام پرشاد تواری نے سنسکرت ہی سے ترجمہ کیا ہے۔

« پوتھی سری گپت جی » برج لال لاہوری نے « بھگوت گیتا » کا نیا ترجمہ پیش کیا ہے۔

سب سے آخر میں بنارس کے بابو شیو پرشاد کی تاریخ ہند موسوم بہ « اتہاس تمرنسک » کی تیسری اور آخری جلد ہے جو ہندستانی ماخذوں سے لے کر یورپی تشریحات کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔

انھیں بابو صاحب نے « گوتکا » یعنی مرقع کے نام سے اردو اور ہندی کا ایک مجموعۂ نظم شایع کیا ہے جو صوبجات شمالی و مغربی کے تعلیمی درس میں شامل ہے[۳]۔

---

۱ ان کتابوں میں سے ایک کا ذکر میری « تاریخ ادب ہندوی و ہندستانی » میں دیکھیے۔ جلد دوم صفحہ (۱۹)۔

۲ انڈین میل ۲۱ جون سنہ ۱۸۷۳ ع

۳ علی گڑھ اخبار ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۷۳ ع۔

نئی کتابوں میں سے مذکورۂ ذیل کا ذکر میں نے مسٹر کولن براؤننگ (Colin Browning) کی سنہ ۱۸۷۱ع کی رپورٹ میں دیکھا ہے۔

« قانون شیخ » (یعنی بوعلی سینا) بابت فن طبابت۔ پانچ جلدوں میں۔ عربی سے ترجمہ۔

« علاج الامراض » آکٹیوو تقطیع۔ ۶۵۰ صفحات۔

« ذخیرۂ خوارزم شاہی » فن طبابت پر ایک اور کتاب۔ چھے جلدوں میں۔

« تاریخ عبدالقادر بدوی » (تاریخ اکبر) فارسی سے ترجمہ۔

« فتاوئ عالمگیری » عربی سے ترجمہ۔

ایک « تاریخ ہند » مولفہ منشی محمد حسین پرتاب گڑھ۔ اودھ کے مدرسوں میں تدریس کے لیے شائع کی گئی تھی۔ اس کے مصنف کی کئی نظمیں ہندستانیوں میں بہت مقبول ہیں۔ پنڈت رامانند سکسائی نے ایک اور « تاریخ ہند » لکھی ہے جو ہندو راجاؤں، مسلمان سلطانوں اور حکومت انگریزی کی بابت ہے۔

لاہور کالج کے مولوی محمدحسین آزاد نے محکمۂ تعلیمات پنجاب کی سرپرستی میں « قصص ہند » کا دوسرا حصہ پیش کیا ہے جس میں اہم ترین تاریخی شخصیتوں کے حالات حکایات کے طور پر بیان کیے ہیں اور شستہ پیرائے میں سچی اور بہت اچھی اردو میں قلمبند کیے ہیں[1]۔

منشی گوکل پرشاد رئیس لکھنؤ نے جو عام طور پر اپنے تخلص «رسا» سے مشہور ہیں، سکندر نامۂ نظامی کا اردو میں کارنامۂ اسکندری کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ مترجم نے لفظ بہ لفظ فارسی متن کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس طرح کہ وہ ہندستانی جو فارسی زبان نہیں جانتے اس ترجمے کے ذریعے جو مقفّی نثر میں ہے، اس تاریخ سے واقف ہوسکیں۔ اس سے خود ان کی اپنی زبان میں یہ تاریخ دستیاب ہوسکے گی۔ اس جرنلسٹ نے جس سے میں یہ اطلاع نقل کررہا ہوں میری طرح یہی خواہش ظاہر کی ہے کہ ہندستان میں اس کی اشاعت ہو اور ہندستان کی کثیر آبادی کے یہ کام آئے[2]۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی

---

۱ انڈین میل ۳ فروری سنہ ۱۸۷۳ ع۔ ۲ اخبار انجمن پنجاب ۱۸ اپریل سنہ ۱۸۷۳ع۔ علیگڑھ اخبار ۲۵ اپریل سنہ ۱۸۷۳ ع۔

ہے کہ یہ ترجمہ ایک ہندو نے کیا ہے جو اپنی اردو شاعری کی وجہ سے مشہور ہے اور اس کا شمار ان رجعت پسندوں میں نہیں جو پرانی ہندی کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں۔ برخلاف اس کے چونکہ وہ لکھنؤ میں ایک ہندستانی اشاعت خانے کا مہتمم ہے' اس کے یہاں اس حسین زبان کی (جس کو ہمیشہ ہندستانی کی قومی زبان کے لقب سے یاد کرتا رہوں گا) کتابوں کی ایک بڑی تعداد زیر طبع ہے۔

'تہذیب مقال' یا 'تعوید ایمان' کے نام سے ہندستانی مصنف میں آقا حسین نے جو میراں صاحب کے لقب اور نامی[1] تخلص سے بھی مشہور ہیں' گجرانوالہ میں (جہاں منشی گوپال داس 'تاریخ و جغرافیہ[2]' شائع کرنے والے ہیں) 'پرا بودھ چندرودے' مشہور سنسکرت ڈرامے کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کا ترجمہ نند داس جیو ہندی میں اور اس سے قبل بھگوان داس دہلوی اردو میں کر چکے ہیں۔

'آئینہ جہاں نما' کے نام سے گجرانوالہ ہی میں احمد حسین لکھنوی نے تاریخ عالم موسوم بہ 'مرآۃ العالم' کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

ان تمہیدی تصنیفوں میں سے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں' میں 'کلید سخن' کو خاص اہمیت دیتا ہوں جس کو کلکتہ یونیورسٹی کے اردو کورس کے لیے مولوی محمد حسین لکھنوی استاذ اردو ہارڈنگی ہائی اسکول نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب جس کی موافقت میں ۲۸ مارچ کے علی گڑھ اخبار میں ایک مضمون چھپا تھا' نو حصوں پر مشتمل ہے جس میں ایک گرامر شامل ہے۔ ایک حصہ اخلاقیات سے متعلق ہے' ایک تصوف سے' ایک علم عروض سے' ایک تاریخ سے وغیرہ وغیرہ مضمون نگار لکھتا ہے کہ یہ کتاب فی الحقیقت ایک گلدستۂ فصاحت ہے اور تعریف و توصیف کی مستحق ہے۔ طلبا کے لیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی کیونکہ اردو زبان ترقی کر رہی ہے اور اس کی فوقیت کا وقت آچکا ہے[3]۔

اس کے علاوہ اسی رسالے کا ایک اور نامہ نگار ہمیں اطلاع دیتا ہے کہ اس کتاب پر فاضل قدردان کمال مسٹر کولن براؤننگ (Colin Browning) ناظم سر رشتۂ تعلیم اودھ نے

۱ ملاحظہ ہو 'تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی' جلد دوم صفحۂ ۴۳۰۔

۲ تاریخ گجرانوالہ کوارٹو ۴۹۲ صفحات۔

۳ ملاحظہ ہو سر جارج کیمبل کی رائے ہندستانی ہیرالڈ کی رائے سے کس قدر مختلف ہے۔

ایک انعام عطا فرمایا۔ اسی سلسلے میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "اگر ہندستان میں اس طبیعت کے عہدہ‌دار اور زیادہ ہوتے تو وہ انگلستان کے مقابلے میں اس‌قدر پست نہ ہوتا"۔ ہندستانی شعرا نے اس قابل ناظم کی تعریف میں قصیدے بھی لکھے ہیں جو اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ میں شایع ہوئے ہیں۔

ایک اور تمہیدی کتاب "تسہیل الکلام" یا Hindustani made easy، کپتان ڈبیلو۔آر۔ایم۔ ہال رایڈ (W.R.M. Holroyd) ناظم سررشتۂ تعلیمات پنجاب نے بڑی احتیاط سے مرتب کی ہے اور حقیقت میں اسم بامسمّٰی ہے۔

سید نصرت علی دہلوی نے لاہور سے ایک اردو انگریزی قواعد "کتاب مفید عام" کے نام سے شایع کی ہے جو ایک طرح کی چھوٹی سی انسائیکلوپیڈیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندستانیوں اور انگریزوں کے لیے یکساں مفید ثابت ہو۔ کتاب کے خاتمے پر کچھ منظوم قطعات ہیں اور ایک جنتری ہے جن میں سالہائے ہجری کی سنہ ۱۸۶۵ع سے لے کر سنہ ۱۹۶۶ع تک کے عیسوی (جنتری نگاروں کی اصطلاح میں گریگوروی جنتری) سے مطابقت کی گئی ہے۔ گریگوری اس وجہ سے کہ پاپائے گریگوری سیزدہم نے سنہ ۱۵۸۲ع میں یہ نئی جنتری قایم کرنا چاہی تھی اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ جولین جنتری کی ابتدا کے بعد سے نقطہ‌ہائے خط سرطان اور نقطہ‌ہائے معتدل‌النہار میں انحطاط ہوچکا ہے۔ یورپ میں اس تبدیلی کی وجہ سے سلسلہ‌وار واقعہ نگاری میں بڑی زحمت پیش آئی اور بہت مزاحمتوں کے بعد یورپ کے بعض حصوں نے اسے قبول کیا چنانچہ جرمنی نے تقریباً سنہ ۱۷۰۰ع میں، انگلستان نے سنہ ۱۷۵۲ع میں سویڈن نے سنہ ۱۷۵۳ع۔ روس اور کلیسائے شرق نے اس نئی ایجاد کو منظور نہیں کیا اور جہاں تک ضرورت کا تعلق ہے یہ اصلاح بہت زیادہ صحیح بھی نہیں ہے [1]۔

سید حسین پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ نے اسی عام زبان میں اصطلاحات علمیہ پر ایک رسالہ شایع کیا ہے۔ ان کا مقصد انگریزی اصطلاحات علمیہ کے مترادف الفاظ

---

1 "Manuel de chronologie" از A. Sedillot جلد اول صفحہ ۱۴

اردو میں تلاش کرتا تھا اور دیسی رسالے ان کی کوشش سے مطمئن ہیں[1] -

نئے نئے اہل قلم منظر ادب پر نمودار ہوئے ہیں۔ شعرا میں سب سے پہلے میں ایک مدراسی خاتون کا ذکر کروں گا جن کا گزشتہ جون میں انتقال ہوگیا۔ انھوں نے اردو نظم میں عہد نامۂ جدید (انجیل مقدس) کی کئی عبارتوں کا ترجمہ کیا تھا۔ اردو میں انھوں نے کئی مثنویاں بھی لکھی تھیں اور اپنے کلام کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی تھی[2] -

"پنجابی اخبار[3]" نے پٹنہ کے ایک شاعر سے ہمارا تعارف کرایا ہے جو آتش[4] کے شاگرد ہیں اور (اس زمانے میں) پنجاب کا سفر کر رہے تھے۔ اردو نظم و نثر میں انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ مضمون نگار نے جو ان کے زور طبع کا بہت معترف ہے مثال کے طور پر ان کی کئی غزلیں اور نثر کے پارے پیش کیے ہیں جن میں سے ایک کو ۸ مارچ کے میرٹھ گزٹ نے نقل کیا ہے۔ یہ مصنف جن کا نام شیخ اعظم حسین ہے، پیارے صاحب کے عرف سے بھی مشہور ہیں۔ علاوہ ان کی تصانیف کے ان کی گفتگو کی بھی قدر کی جاتی ہے جس کا موضوع اکثر اخلاق و روحانیت ہوتا ہے۔ ان میں اور بھی بہت سی خوبیاں جمع ہیں۔ اردو ادب کی طرف سے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود نئے واقعات کے قابل قدر لوگ برابر ابھر رہے ہیں اور پوری کامیابی سے زبان کو نشوونما دے رہے ہیں اور اپنے پیشرووں کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔

اسی اخبار نے نصیراحمد المتخلص بہ ناصر جن کی کچھ غزلیں اس نے چھاپی بھی ہیں اور اشرف علی اشرف[5] (سید عبدالفتاح) جو زمانے کے مشہور ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں اور اپنی مادری زبان ہندستانی کے سوا عربی، فارسی اور انگریزی میں مہارت کامل رکھتے ہیں، کا بھی تعارف کرایا ہے۔ ان کی (اشرف علی اشرف کی)

---

۱ علیگڑھ اخبار ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۷۳ء۔ ۲ اخبار انجمن پنجاب ۶ جون سنہ ۱۸۷۳ء۔
۳ شمارہ جات یکم و ۸ مارچ سنہ ۱۸۷۳ء - ۴ یعنی خواجہ حیدر علی آتش. ملاحظہ ہو "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی" پہلی جلد صفحۂ ۲۰۲ -
۵ شمارۂ ۲ مئی سنہ ۱۸۷۳ء -

تصانیف کی تعداد انیس بتائی جاتی ہے اور یہ سب کی سب سررشتۂ تعلیمات بمبئی میں مدرسوں کے درس میں شامل ہیں۔ میں صرف ان کتابوں کا ذکر کروں گا جو اردو میں لکھی گئی ہیں:۔ "خزینۂ دانش" پانچ جلدوں میں۔ "کلید دانش"۔ "تائیدالحق"۔ "تحفۂ محمدیہ"۔ "صد حکایت"۔ "خلاصۂ عام جغرافیہ"۔ "تاریخ افغانستان"۔ "تاریخ انگلستان" اور ایک قواعد انگریزی موسوم بہ "رسالۂ تعلیم الایقان فی لغت انگلستان"۔

سنہ ۱۲۸۴ھ (سنہ ۱۸٦۸ع) میں عدالت ضلع خاندیش میں ایک خدمت پر ممتاز رہنے کے بعد ناصر صاحب الفنسٹن کالج بمبئی میں عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد اشرف صاحب نے "اشرف الانشا" تصنیف کی جس کا شمار ان کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے اور جس کے نام میں انھوں نے اپنے تخلص کی رعایت رکھی ہے۔ ان کتابوں کی طرح جن کے اس قسم کے نام ہوتے ہیں یہ کتاب محض خطوط نویسی کے آئین سکھانے تک محدود نہیں بلکہ فن تحریر پر ایک جامع کتاب ہے جس میں عروض اور بلاغت دونوں پر جامع بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد "اشرف اللغت" شایع کی جو ہندستانی، فارسی، عربی اور انگریزی کی لغت ہے اور جس کو اڈیٹر "پنجابی" نے اکثر استعمال کیا ہے۔

اگرچہ بمبئی میں مرہٹی اور گجراتی کا رواج زیادہ ہے پھر بھی یہاں سے سنہ ۱۸٦۱ع و سنہ ۱۸۷۲ع میں بہت سی ہندستانی کتابیں شایع ہوئیں جن میں سے زیادہ تر مذہب اسلام سے متعلق نہیں۔ اکثر گجراتی حروف میں ہیں۔ ان میں سے قابل ذکر یہ ہیں:۔ حاتم کے متعلق ایک ڈراما (حاتم ہندستانی ناٹک)۔ کبیر کی نظمیں "کبیر گویا"۔ تین قصے موسوم بہ "تمبولن" "لعل و گوہر" "نجنٹی پاتھن" مختلف مصنفین کے لکھے ہوئے۔ گیتوں کا انتخاب۔ اس کے علاوہ اردو مہابھارت جو بالاقساط شایع ہو رہی ہے اور جس کا آٹھواں حصہ طبع ہوچکا ہے۔

انگریزی سے ہندستانی میں ترجموں کی تعداد ہمیشہ کثیر رہتی ہے۔ "اخبار انجمن پنجاب" مورخۂ ۱۸ اپریل سنہ ۱۸۷۳ع نے ترجموں کے موضوع پر

سب سکریٹری حکومت ہند کا ایک خط سکریٹری حکومت صوبۂ شمال مغربی کے نام شایع کیا ہے[1]۔

مولوی شیو دیال سنگھ کی کتاب «اخلاق ہندی» کا نام دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ اردو میں انگریزی زبان کی گرامر ہے۔ کتاب مکمل ہے اور «پنجابی» مورخۂ ۲۱ دسمبر سنہ ۱۸۶۲ء میں اس کی سفارش کی گئی ہے۔

بابو کیشب رام نے اردو میں چوسٹھ صفحات کا ایک «جغرافیۂ بنارس» شایع کیا ہے جس کی «پنجابی» مورخۂ ۲۰ ستمبر سنہ ۱۸۶۳ء نے بجا طور پر تعریف کی ہے۔

«اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی» فارسی میں فلسفۂ اخلاق و معاشرت پر مشہور و معروف کتابیں ہیں۔ ہندستان میں «اخلاق محسنی» کی طرح ان کا بھی ترجمہ ہوچکا ہے لیکن مولوی کریم بخش[2] نے ان میں سے چیدہ چیدہ اور بےحد دلچسپ حصوں

---

۱ اس خط کا ایک حصہ ملاحظہ ہو۔ از مورث وایر کالج مورخۂ ۷ دسمبر سنہ ۱۸۷۲ء «ہوم ڈیپارٹمنٹ پبلک انسٹرکشن» «علیگڑھ اخبار شمارۂ ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۸۷۰ء میں ان اہم انگریزی کتابوں کی ایک فہرست شایع کی گئی تھی جو دیسی زبانوں میں ترجمہ اور اشاعت کے لایق ہیں۔ یہ فہرست قابل و فاضل انگریزوں کی مدد سے تیار کی گئی تھی۔ حکومت ہند نے اسے تسلیم کر لیا ہے اور مناسب خیال کیا ہے کہ اس موضوع پر مزید تحقیق کی جائے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ ان میں سے کون کون سی کتابیں اردو، ہندی اور بنگالی میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔ اسی خیال سے اس فہرست کی کاپیاں بکثرت انجمنوں اور سررشتۂ تعلیمات صوبۂ شمال مغربی کو بھیجی گئی ہیں اور ان کی رائے طلب کی گئی۔

جو جوابات وصول ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوا کہ جو کتابیں اس فہرست میں شامل ہیں ان میں سے کوئی ہندی، بنگالی یا اڑیا میں ترجمہ نہیں ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کے زیر اہتمام صرف اردو میں ترجمے ہوئے ہیں۔ مثلاً منشی ذکاءاللہ نے حساب کی کتابوں کے ایک سلسلے کا ترجمہ کیا ہے جو سوسائٹی کی مدد سے چھپ رہا ہے۔

صاحب گورنر جنرل کی رائے ہے حکومت اس تجویز کی ہمت افزائی کرے گی اور باعتبار مرتبہ ترجموں کی قدر کرے گی۔ اس طرح ترجموں کی تعداد اور اصل تصانیف کی تحریر کا شوق دن بدن بڑھتا جائے گا۔ جو لوگ اس کام کو محنت سے انجام دیں گے حکومت ہند انہیں مالی معاوضے، خلعتیں، اعزازی خطابات عطا کرے گی۔ اس کا تصفیہ لفٹنٹ گورنر کے مختلف انجمنوں سے مشورہ کرنے کے بعد ہوگا کہ ان میں سے کن کتابوں کے ترجمے کی مدد کرنی چاہیے۔

۲ ان کے حالات میری «تاریخ ہندوی و ہندستانی» میں ملاحظہ فرمائیے۔ جلد دوم صفحۂ ۱۶۵۔

کا انتخاب ' کبیر اعظم ' کے نام سے آکٹیوو تقطیع پر ۹۲ صفحات میں لاہور سے شایع کیا ہے۔ اس کے سوا مرزا محمد علی نے اسی قسم کی ایک کتاب ' اخلاق محمدی ' کے نام سے شایع کی ہے۔ بنگلور کے ایک اخبار نے اس کی بڑی تعریف کی کیونکہ اسی شہر[1] کے ایک اور اخبار نے اسی زمانے میں اس پر تنقید کی تھی۔

محمد اکرم غنیمت نے جن کے دیوان کی وجہ سے ان کا شمار پنجاب کے منتخب شعرا میں ہونے لگا ہے، لاہور ہی میں ایک مثنوی شایع کی ہے جو ایک نواب زادے کے عشق کی داستان ہے۔ یہ قصہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے اور ایسے لطیف اوصاف سے لبریز ہے کہ اڈیٹر ' پنجابی '[2] نے ایک طویل مضمون میں اسے سلسلۂ تصاویر سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن اس کی تعریف کرتے کرتے اڈیٹر نے انداز بیان کی بعض خصوصیتوں پر نہایت باریک بینی کے ساتھ تبصرہ کیا ہے اور اس سے اس کی وسیع معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ 'گلزار کشمیر' کے نام سے پنڈت بشن نراین لاہوری نے خاص کشمیری زبان کی ایک قواعد شایع کی ہے جس کی تعریف میں 'پنجابی' رطب اللسان ہے[3]۔

میرٹھ سے شاہنامہ کا ایک نیا اڈیشن اردو میں شایع ہوا ہے جو دیدہ زیب تصاویر سے آراستہ ہے۔ اس پر بھی اس کی قیمت بہت مناسب رکھی گئی ہے۔ دهلی میں ' شمس الانوار ' کے نام سے ' بوستان خیال ' کا اردو ترجمہ شایع ہوچکا ہے جو بہرام گور کی رومانی سرگزشت ہے اور فولیو تقطیع کے ۲۵۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

"Bibliotheca Indica" اپنی انتہائی اہم مطبوعات میں ایک ایسی هندستانی کتاب کو بھی شمار کرتا ہے جسے فی الحقیقت تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ میرا اشارہ قدیم هندی نظم یا منظوم داستان کی طرف ہے جسے چند[4] شاعر نے اسلامی فتوحات سے پہلے گیارھویں صدی عیسوی میں ' پرتھی راج رساؤ[5] ' (یعنی اجمیر اور دهلی

---

۱ علیگڑھ اخبار ۳ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ء۔ ۲ شمارۂ ۲۲ فروری سنہ ۱۸۷۳ء۔

۳ شمارۂ ۱۱ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ء۔

۴ میری 'تاریخ هندوی و هندستانی' میں ان کا مضمون ملاحظہ ہو۔ اس شاعر اور اس کی نظموں کے متعلق اور بہت سی تفصیلات ریورنڈ جان رابسن (Rev. John Robson) کے مضمون مطبوعۂ انڈین میل ۱۲ مئی سنہ ۱۸۷۳ء سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

۵ لفظ 'راس' کی ابتدائی شکل ہے۔ میری کتاب "Rudiments hindovi" ملاحظہ ہو۔

کے راجا پرتھی راج جو سنہ ۱۰۵۰ع میں پیدا ہوا کے وقایع) کے نام سے تحریر کیا تھا۔ یہ محض میرے مشہور دوست مسٹر جان بیمز (John Beames) کی انتھک کوشش اور محنت کا نتیجہ تھا کہ اس بیش بہا کتاب کی ترتیب و اشاعت کا کام انجام پاسکا۔ پہلا کبت بلکہ زیادہ مناسب الفاظ میں پہلا حصہ (ادی پرو) ان لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہوگا جنھیں محض راماین اور مہابھارت کے ہندستان سے نہیں بلکہ مقابلۂ جدید ہندستان سے دلچسپی ہے۔ مرتب نے ایک خاص خط میں مجھے لکھا ہے کہ انھوں نے نہایت احتیاط و پابندی سے صرف ایک متن کی پابندی کی ہے اور باقی نسخہ‌جات کے اختلافات صرف حاشیہ میں تحریر کیے ہیں اور دوسرے نسخوں کی چھان بین کا کام اپنے دوسرے ماہر ہندیات ساتھیوں کے لیے رکھ چھوڑا ہے جو جس طرح دل چاہے تصریحات کرتے رہیں جس طرح اب آئے دن ہومر اور ورجل کی عبارتوں کی کی جاتی ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ یہ کام خیر و خوبی سے انجام پا جائیگا کیونکہ اس کے لیے نہ صرف غیرمعمولی قابلیت کی ضرورت ہے بلکہ اس قسم کے کام کے لیے کثیر وقت اور استقلال بھی درکار ہے۔ یہ خیال کرنے کی بات ہے کہ اس وقت تک صرف ایک ہی حصہ شایع ہوا ہے جو ٦٦ صفحات پر مشتمل ہے اور اس قسم کے ٦٨ حصص اور باقی ہیں جن میں سے بعض بعض پہلے حصے سے کہیں زیادہ طویل ہیں۔ مسٹر بیمز نے پہلے حصے کے ساتھ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالے کے شمارۂ دوم میں جو اطلاع شایع کی ہے اس میں یہی لکھا ہے۔ یہ کہنا بےمحل نہ ہوگا کہ یہ کتاب ان لوگوں کے خلاف جو ہندستانی سے تمام فارسی و عربی الفاظ خارج کردینا چاہتے ہیں دلیل قاطع ہے، کیوں کہ ایسے الفاظ چند کے کلام میں بھی بکثرت ملتے ہیں جو حقیقت میں ہندستان کا قومی شاعر ہے[۱]۔ اس کے سوا دوسرے مشہور ہندو شاعروں کبیر، تلسی، سور داس، دادو، بہاری وغیرہ کے کلام میں بھی اس قسم کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ مسٹر جان بیمز نے مجھ سے کہا تھا کہ جوں جوں

---

۱ چند الفاظ جو چند کی نظم میں کثرت سے پائے جاتے ہیں یہ ہیں: «شہر»، «خبر»، «ظالم»، «حکم»، «تیغ»، «فوج»۔

اس دلکش زبان کا مطالعہ کیا جائے یہ یقین ہوجاتا ہے کہ اردو اور فارسی الفاظ اس میں مضبوطی کے ساتھ جاگزیں ہیں۔ یہ کبھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ کبھی بھی ہندی زبان عربی اور فارسی الفاظ سے خالی رہی ہے۔ بابو شیو پرشاد نے اپنے مقالے "کچھ بیان اپنی زبان کا" میں بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ وہ ان لوگوں کے مخالف ہیں جو ہندی سے عربی و فارسی الفاظ خارج کردینا چاہتے ہیں اور محض سنسکرت الفاظ لینا چاہتے ہیں۔

اسی زمانے میں جبکہ مسٹر بیمز اپنی "السنۂ جدید کی ہند تقابلی قواعد" مرتب کررہے تھے، ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ (Dr. Ernest Trumpp) جو بڑے ان تھک آدمی ہیں "افغانیوں کی زبان اور فارسی اور شمالی ہندستان کے محاورات کی تقابلی گرامر[۱]" شایع کرنے کے بعد "ازمنۂ وسطیٰ کی ہندستانی زبانوں کی قواعد" کی ترتیب شروع کردی تھی تاکہ پرانی پراکرت اور جدید ہندستان کی زبانوں کے درمیان جو جگہ (تحقیقی نقطۂ نظر سے) خالی رہ گئی تھی وہ بھر جائے۔ اس کی ضرورت ہے کہ سنسکرت کے بعد کی آریائی زبان پر، جس کو سامان شاستری (یعنی شاستروں کی زبان) کہتے ہیں اس زمانے تک کی تمام تبدیلیوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ایک تبصرہ شایع کیا جائے۔ اس قسم کا تبصرہ لسانیات کی کسی اور شاخ میں موجود نہیں۔

علمائے لسانیات کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ انجمن لاہور نے انھیں ڈاکٹر ٹرمپ کے مرتب کردہ "سکھوں کے گرنتھ" کو شایع کرنے کا تصفیہ کیا ہے[۲]۔ انھیں یہ معلوم کرکے بھی خوشی ہوگی کہ الہ آباد کے ریورنڈ ایس۔ ایچ۔ کیلاگ (Rev. S. H. Kellogg) کی ایک ہندی گرامر زیر طبع ہے جو نہایت مکمل ہے اور جس میں مشہور ہندو مصنفوں کی کتابوں سے بکثرت مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

تلسی داس کی ہندی رامائن کو ہمیشہ سے ہندستان میں غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ شہرت میں وہ والمیک کی رامائن کے برابر ہے بلکہ معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ اس سے بھی بازی لے جارہی ہے۔ بنارس کے مسٹر گرفتھ (Mr. Griffith) کے

۱ Grammar of the Pasto or language of the Afghans Compared with the Iranian and North Indian idiosm مطبوعۂ لائپزش

۲ اخبار انجمن پنجاب ۲ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ع۔

ترجمۂ رامائن سنسکرت کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ تیسری جلد شایع ہوچکی جس کی بابو کاشی‌ناتھ نے بہت تعریف کی ہے[1]۔

یہ تو سب کو معلوم ہوگا کہ پروفیسر ویبر (Weber) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رامائن کا خیال ہومر سے لیا گیا ہے۔ انھیں منشی کاشی‌ناتھ نے اس نظریے کی تردید ایک مضمون میں کی جو پہلے تو رسالہ "Native Opinion" میں شایع ہوئی اور پھر ایک رسالہ کی صورت میں طبع ہوئی[2]۔

میں نے متعدد مرتبہ ان قدیم سنسکرت ڈراموں کا ذکر کیا ہے جو اب بھی کبھی‌کبھی ہندستان میں تمثیل کیے جاتے ہیں[3]، کبھی اصلی زبان میں اور کبھی ہندستان کی عام زبان میں۔ لیکن جو چیز اس زمانے تک نظر نہ آتی تھی اور ایک سچا ہندستانی تھیٹر، ایک مستقل "قومی" تھیٹر، وہ بھی اب کلکتہ میں قائم ہوگیا ہے جس میں ملکی باجوں کا آرکسٹرا ہے اور عورتوں کی بجائے لڑکے ادا کاری کا کام انجام دیتے ہیں۔ انگریزی اخبارات نے اپنے نامہ نگاروں کے حوالے سے ایک ہندو کامیڈی کی جو اس تھیٹر میں تمثیل کی گئی، روئداد شایع کی ہے۔ یہ ایک معمر برہمن کا قصہ ہے جس کی دو لڑکیاں بیوہ ہیں اور جو خود ایک نیچ ذات کی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ تجویز آزادانہ ہے اور یہ کشمکش قابل‌دید کہ اس کی لڑکیاں اس بے جوڑ رشتہ کی بہت مخالف ہیں۔ بہرحال ان کی ناراضی کی اصل وجہ یہ نہیں بلکہ محض یہ ہے کہ ہندی سماج کے اصول مطابق ان کی دوبارہ شادی نہیں ہوسکتی اور انھیں سوتیلی ماں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ جو چیز ہمیں اس قصے میں عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں اس پر افسوس کرتی ہیں کہ سرکار انگریزی نے ستی کی ممانعت کردی۔

---

۱ علیگڑھ اخبار ۲۵ اپریل سنہ ۱۸۷۳ء۔

۲ Allen's Indian Mail شمارۂ ۲۳ مارچ سنہ ۱۸۷۳ء۔

۳ گزشتہ جنوری میں فریدپور کے بازار میں لوگوں کی دلچسپی کے لیے ایک کھیل "رام بیساکھ" کے نام سے پیش کیا گیا تھا۔ (انڈین میل ۸ جون سنہ ۱۸۷۳ء)۔

ان کے خیال میں ستی، حالت بیوگی سے کہیں زیادہ بہتر ہے[1]۔ خوش قسمتی سے بوڑھا برھمن بہت پس و پیش کے بعد اپنے ارادے سے دست بردار ہو جاتا ہے۔

اخبارات نے ایک اور کامیڈی "نو سو روپے" کا بھی ذکر کیا ہے جو کسی موقع پر کھیلی بھی گئی تھی۔ اس کے چھے ایکٹ اور اٹھارہ مناظر ہیں اور کھیل کا وقت پانچ گھنٹے ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک باپ شادی کے ایک دلال کے مشورے پر نو سو روپے کے عوض اپنی لڑکی کی شادی کردینا، بلکہ اسے بیچ ڈالنا چاھتا ہے۔ دلال ایک شوہر یعنی ایک خریدار فراہم کرتا ہے۔ لیکن ہونے والی دلھن کا چچا جو حشیش بہت پیتا ہے، اسے اس سے زیادہ قیمت پر بیچنا چاھتا ہے۔ لڑکی بیہوش ہوجاتی ہے۔ ایک ڈاکٹر، ایک ہومیوپیتھک معالج اور ایک حکیم بلایا جاتا ہے۔ چچا ان طبیبوں کا مذاق اڑاتا ہے اور بالآخر کہتا ہے کہ لڑکی کی بیماری مرض عشق کے سوا کچھ نہیں۔ جس شخص سے اسے محبت ہے وہ بلایا جاتا ہے لیکن اس کے پاس مقررہ رقم موجود نہیں اور پھر عاشق و معشوق کے نسب میں بھی کچھ فرق ہے۔ لیکن چھٹا ایکٹ بخیر و خوبی ختم ہوتا ہے۔ روپے بھی فراہم ہوجاتے ہیں،

۱ یہ بالکل درست ہے کہ ہندستانی عورتوں کو اس وحشیانہ رسم کے مٹ جانے کا افسوس ہے۔ کچھ دن ہوئے متوفی راجہ جودھپور کی درجن بھر بیویاں اور بکثرت خواصیں بڑی خوشی سے ان کی چتا پر جل مرنے کو تیار تھیں۔ مگر انھیں بڑی مایوسی اس وجہ سے ہوئی کہ نئے راجہ نے جو بقول ہندستانی اخبارات کے یورپ زدہ ہیں، انھیں اس کی اجازت نہیں دی۔

حال ہی میں "ناماتارا" واقع ٹونک میں ایک برھمن مرگیا۔ اس کی بیوی ستی ہو جانا چاھتی تھی لیکن چونکہ سرکار نے اس رسم کی ممانعت کردی تھی اس لیے ناماتارا کے ایجنٹ نے کچھ سواروں کو نگرانی پر مقرر کیا اور اس عورت کو نظربند کردیا۔ جب ہندو رسم کے مطابق برھمن کی لاش چتا پر رکھی جاچکی اور آگ لگائی جانے والی تھی، عورت کسی ترکیب سے دروازہ کھول کر نکل بھاگی۔ سپاھیوں نے اس کا پیچھا کیا وہ اپنے شوہر کی چتا میں گر کے جل مرنے ہی کو تھی کہ ایک مسلمان سپاھی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس پر اسے بہت غصہ آیا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس نے اس شخص کو بد دعا دی "اے بھگوان یہ شخص مجھے اپنے شوہر کا ساتھ دینے کی نیکی سے روکتا ہے، اسے اس گناہ کی سزا دے اور اگر تو میری قربانی قبول کرنا چاھتا ہے تو مجھے اپنے شوہر کے ساتھ جا ملنے کی اجازت دے" یہ الفاظ کہتے کہتے وہ ختم ہوگئی اور اس طرح اس نے اپنے شوہر کا ساتھ دیا۔ (پنجابی مورخہ ۱۳ جون سنہ ۱۸۷۲ء)۔

دونوں کا نسب بھی ایک ھی ثابت ھوتا ھے اور حبشی کا عادی اس عادت بد سے توبہ کرلیتا ھے۔

میں ایک اور ڈرامہ کا ذکر کروں گا جو اسی تھیٹر میں بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا تھا۔ میرا اشارہ "نیل درپن" کی طرف ھے جس کی وجہ سے سرکار کو سنہ ۱۸۶۷ع میں اچھی خاصی فکر پیدا ھوگئی اور جس کی وجہ سے ریورنڈ۔ جے لانگ (Rev. J. Long) کو کئی مہینے کی سزائے حبس برداشت کرنی پڑی۔ وجہ یہ تھی کہ اس میں نیل استعمال کرنے والوں پر سخت حملے کئے گئے تھے۔ تمثیل کے وقت ان حملوں کا لہجہ بہت نرم کردیا گیا اور جہاں ضرورت تھی ڈرامے میں کانٹ چھانٹ کی گئی۔

۳ - ان وجوھات میں سے جن کے باعث ھندستانی انگریزی حکومت کو پسند کرتے ھیں ایک یہ بھی ھے کہ اس نے انھیں تحریر و اشاعت کی آزادی عطا کی ھے۔ اخبار "آب حیات ھند" اس موضوع پر لکھتا ھے کہ انگریزوں کی قوم ایک آزاد قوم ھے اور وہ دوسروں کو بھی اسی طرح آزادی دینا چاھتی ھے۔ قانون کی پابندی کے لیے اس کا انصاف حد درجہ غیر جانبدارانہ ھے۔ حکومت ھمیشہ اخباروں کی مفید تجاویز کو سننے لیے تیار ھے اور رعایا اس لیے خوش ھے کہ اس کا اخبارات کے ذریعے حکومت پر اچھا خاصا اثر ھے۔

انجمن ادب دھلی کے ایک اجلاس میں اسی اھم ذریعۂ اثر پر بحث کی گئی تھی سیکریٹری[۱] نے تبصرہ کرتے ھوئے کہا "بدقسمتی سے انگریز دیسی زبانوں کے اخبارات کو نہیں پڑھ سکتے اور حکومت کے مترجم جو سرکاری خلاصہ دفتہوار پیش کرتے ھیں وہ اس مقصد کے لیے کافی نہیں۔ اس لیے یہ بہت مناسب ھوگا کہ ھندستانی لوگ انگریزی اخبارات اور رسالے شایع کریں اگرچہ ابھی تک انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی ھے۔ اسی طرح ان کے خیالات کا حکومت کو اچھی طرح علم ھوسکے گا۔" بکثرت ممبروں نے اس مباحثے میں حصہ لیا جس کا آغاز سیکریٹری نے کیا تھا اور

۱ علیگڑھ اخبار ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۷۳ع۔

موافق و مخالف آرا کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک صاحب سری رام نامی نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت دیسیوں کی رائے معلوم کرنے کی بہت خواہش‌مند ہے۔ چنانچہ انھوں نے لارڈ لارنس سابق گورنر جنرل ہند کی مثال پیش کی جو بہت کثرت سے ہندستانی اخبارات کا مطالعہ کیا کرتے تھے مگر انھیں اس کی شکایت تھی کہ جس چیز کی انھیں تلاش تھی انھیں نظر نہیں آئی۔ کسی نے ان سے کہا کہ ہندستانیوں کو حکومت سے بہت شکایت ہے اور ان کی ہمت نہیں پڑتی کہ آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کریں مثلاً جو لوگ میونسپل کمیٹیوں یا اور دوسری کمیٹیوں کے ممبر ہیں، ڈرتے ہیں کہ اگر وہ کسی تجویز کی مخالفت کریں گے تو انھیں کمیٹی سے برخاست کردیا جائےگا اور ان کی بےعزتی بھی ہوگی۔

یہ سچ ہے کہ جس چیز کو رائے عامہ کہتے ہیں اس کا ہندستان میں وجود نہیں۔ جن رایوں کا وہ اظہار کرتے ہیں اکثر جزوی ہوتی ہیں اور حکومت پر ان کا برائے نام اثر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر کسی معاملے میں ان کی ایک متفقہ رائے ہو اور حکومت کو یہ معلوم ہو کہ اس کی کوئی تجویز عام طور پر غیر مقبول ہوگی تو وہ فوراً اس سے دستکش ہوجائےگی[1]۔

''علیگڑھ اخبار'' جس پر ''علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ'' کا نام زیادہ پھبتا ہے، ایک ایسا انگریزی اخبار بھی شائع کرنا چاہتا ہے جس میں دیسی اخبارات کے مضامین کے ترجمے شائع کیے جائیں تاکہ یوروپین پبلک کو ان خیالات اور آرا کا علم ہوسکے۔ متعدد ہندستانی انگریزی زبان میں اخبارات شایع کرتے ہیں جن کا اینگلو انڈین صحافت میں خاصہ حصہ ہے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر ''پسانیر'' (Pioneer) بنگالی ''ہندو پیٹریاٹ'' (Hindoo Patriot) اور ''نیٹو اوپینین'' (Native Opinion) ہیں جن کو ہزارہا ایسے ہندستانی خریدتے اور پڑھتے ہیں جن کو انگریزی زبان میں بھی اتنی ہی مہارت حاصل ہے جتنی اپنی مادری زبان میں۔ انگریزی اخبارات کی مثال اکثر ان کے پیش نظر رہتی ہے اور انھیں کی جرأت بیان کی بھی وہ پیروی

---

۱ علیگڑھ اخبار شمارۂ ۱۷ و ۲۴ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع۔

کرتے ہیں ۔ وہ اکثر مخالفت بھی کرتے ہیں' ہندستانی زبان کے اخباروں کو اس کی ہمت نہیں پڑتی اور کم و بیش ہندستانی یوروپین کا ان پر اثر رہتا ہے ۔ انہیں مقلد یورپ اخبارات سے حکومت کو اعلیٰ اور متوسط طبقوں کی رائے کا علم ہوتا ہے۔ دیسی زبان کے اخبارات کی اکثر شہروں میں خاص اہمیت ہوتی ہے ۔ صوبجات شمال مغربی' پنجاب' اودھ' صوبجات متوسط اور راجپوتانے میں کئی اخبارات نکلتے ہیں جن میں سے اکثر ہفتے میں ایک یا دو بار شایع ہوتے ہیں ۔ صرف اودھ سے ۲۵ اردو اخبارات شایع ہوتے ہیں جن کی مجموعی اشاعت پانچ ہزار سات سو نوے ہے اور جن میں مقامی اور بیرونی خبریں شایع ہوتی رہتی ہیں ۔

ان میں سے چوبیس اخبارات کا ذکر میں اس سال کے تبصرے میں کروں گا :-

• آثارالامصار و اصح الاخبار • لکھنؤ سے نکلتا ہے اور اس میں مسلمان مولویوں کے فتوے شایع ہوتے ہیں اس کا ایک نام • صبح الاخبار • بھی ہے ۔

• اخبار عام • لاہور کا ایک مقبول عام رسالہ ۔ خبریں کثرت سے شایع کرتا ہے ۔

• اخبار انجمن شاہجہاںپور • اس شہر کی ادبی انجمن کا اخبار جس نے • سنڈراس گزٹ • (Sandras Gazette) کی جگہ لے لی ہے؛ میں نے سنہ ۱۸۷۱ ع کے تبصرے میں اس کا ذکر کیا تھا ۔

• اخبار سررشتۂ تعلیم • (صوبۂ شمال مغربی) اس کے ایڈیٹر بابو شیورام ہیں ۔

• اخبارالاخیار • لکھنؤ کا ایک ہفتہوار اخبار جو مرزاپور اور مدراس کے دو ہمنام اخباروں سے مختلف ہے ۔ اس کے اڈیٹر منشی محمدعلی ہیں ۔

• بھارت پتریکا • لکھنؤ کے اس رسالے کا ہندی نام ہے جس کا اردو لقب • اخبار انجمن ہند • ہے اور جس کا اس موخرالذکر نام سے میں نے اپنی • تاریخ ہندوی و ہندستانی • میں ذکر کیا ہے ۔ یہ ہفتہوار اخبار صرف تعلقداران اودھ کے مضامین کے لیے وقف ہے ۔

• برہم گویاں پرکاش • بمبئی کا اردو اخبار جس کا مسلک وحدت پرستی کی اشاعت ہے۔

"دھولپور گزٹ" دھولپور کا اردو اخبار جس کی مدیر "علیگڑھ اخبار" نے تعریف کی ہے۔

"هادی حقیقت" ایک نیا اخبار جو لاهور سے مہینے میں دو بار چھوٹی تقطیع کے چار صفحوں پر شایع هوتا هے جو برهما سماج کے نقطۂ نظر سے مذهبی مسائل پر بحث کرتا هے۔ اس میں خدا کی وحدت کے دلائل پیش کیے جاتے هیں اور هندو دھرم کے سچے اصول بیان کیے جاتے هیں، گمراہ اور باطل اوهام کی تردید کی جاتی هے اور مذموم رسوم کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی جاتی هے۔

"هریش چندر میگزین" جس کا آئندہ ذکر آئےگا۔

"هندی پرکاش" هفتہوار اخبار جو امرتسر سے "دھرم سبھا" کی جانب سے ۱ دسمبر سنہ ۱۸۷۳ع سے تین طرح کے رسم الخط اردو، دیوناگری اور گورمکھی میں شایع هوتا هے۔

"گوالیار گزٹ"۔ میں اس امر سے قطع نظر کرتا هوں کہ "گوالیار اخبار" کے نام سے میں نے اس پر اپنی "تاریخ هندوی و هندستانی" میں تنقید کی تھی۔ اب اس اخبار میں دو کالم هوتے هیں، ایک اردو میں اور دوسرا مارواڑ کی بولی میں۔ اس میں دربار گوالیار کی خبریں اور احکامات شایع هوتے هیں۔

"اسٹریچی گزٹ" مرادآباد۔ اس نئے اخبار کے اڈیٹر منشی مهدی حسن خاں نے یہ دیکھ کر کہ بہت سے اردو اخبارات مشهور انگریزوں کی سر پرستی میں جاری کیے گئے هیں اور انھیں کے ناموں سے نکلتے هیں مثلاً "لارنس گزٹ، میور گزٹ، میو گزٹ" اپنے اخبار کو سر جان سٹریچی (Sir John Strachey) کی سر پرستی میں شایع کیا هے اور اخبار کا نام بھی انھیں کا ذرا بگڑا هوا نام هے۔ علیگڑھ اخبار مورخۂ ۷ فروری ۱۸۷۲ع نے اس کی تعریف کی هے۔

"جبل پور کرانیکل" جبل پور کا اردو اخبار هے۔

"جہلم پنجاب" اخبار انجمن پنجاب میں اس اخبار کا ذکر هے۔

"خیر خواہ اودھ" لکھنؤ سے شایع هوتا هے۔

« خیر خواہ عالم » دھلی سے عیسائی مذہب کی تردید کے لیے نکلتا ہے مگر اس میں تازہ خبریں بھی شایع ہوتی ہیں۔

« لوح محفوظ » مرادآباد جس نے اڈیٹر پر مباحثات میں غیر پارلیمنٹی محاورات کے استعمال کا الزام لگایا گیا ہے۔

« لارنس گزٹ » میرٹھ کا اردو رسالہ جس کے اڈیٹر منشی سید جمال الدین ہیں۔

« میسور اخبار »۔ یہ اخبار بہت شستہ اردو میں بنگلور کے اعلیٰ فن طباعت (جس کو « فردوسی » کہتے ہیں) کا مظہر ہے۔

« مارواڑ گزٹ »۔ یہ سرکاری اخبار جودھپور سے دو زبانوں میں نکلتا ہے ایک کالم اردو میں اور دوسرا مارواڑی میں۔ عدالتی خبریں درج ہوتی ہیں۔

« ناصرالاخبار » جو دھلی سے ستمبر سنہ ۱۸۷۳ع سے شایع ہورہا ہے۔

« نور افشاں » لودھیانے کا خبروں سے مالامال اخبار جو ایک مشنری کی ادارت سے اردو اور انگریزی میں شایع ہوتا ہے۔

«نورالافلاک» کانپور۔ یہ اخبار جو اگست سنہ ۱۸۷۳ع سے جاری ہوا ہے اس کا اعلان کرتا ہے کہ مختلف انواع کے مضامین اس میں شایع ہوں گے جس کے لیے « متاع نیک هر دوکان کہ باشد » کا انتخاب کیا جائےگا۔

« نورالانوار » ایک اور اخبار ہے جو کانپور سے شایع ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ‌تر انگریزی اخبارات کے تراجم اور اردو اخبارات کے منتخب مضامین شایع کیے جاتے ہیں۔ اس میں اکثر منظوم قطعات اور معمے بھی ہوتے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حکومت انگریزی کا مخالف اور (سر) سید احمد خاں کے خیالات کے خلاف ہے۔ اڈیٹر اخبار سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ نے لکھا تھا کہ اس اخبار کے لیے زیادہ مناسب نام « ظلمت شعار » تھا کیونکہ موجودہ لقب اس کی خصوصیات کی ضد ہے۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔

« پنجاب گزٹ » پنجاب کا سرکاری اخبار ہے' اردو میں شایع ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو « اردو گورنمنٹ گزٹ پنجاب » بھی کہتے ہیں۔ جنوری ۱۸۷۳ع سے یہ لاہور

سے زیر نگرانی ناظم تعلیمات کپتان ہال رایڈ (Holroyd) شایع ہو رہا ہے۔ انھوں نے مجھے اس کا مجموعہ بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔

«روزنامہ»۔ لکھنؤ سے بہت شستہ زبان میں شایع ہوتا ہے۔ اس میں تمام عدالتی خبریں درج ہوتی ہیں۔

«صادق الاخبار» بہاول پور۔ دھلی سے بھی اسی نام کا ایک اور اخبار شایع ہوتا ہے لیکن مقدم‌الذکر اس علاقے کا سرکاری جریدہ ہے۔

«سید الاخبار»۔ یہ نیا اخبار جو دھلی سے شایع ہوا ہے اپنے همنام لاهوری همعصر سے مختلف ہے۔ یہ گزشتہ مئی سے ایک دس بارہ کوارٹو تقطیع کے ۲۰ صفحات پر دو کالموں میں شایع ہوتا ہے۔ اس کے اڈیٹر منشی مراری لال ہیں جنھوں نے مجھے بھی از راہ عنایت اس کے کچھ شمارے بھیجے۔ میں نے ان کو بڑے شوق سے پڑھا اور ان کا شستہ و صاف اسلوب بیان مجھے بہت پسند آیا۔

«سوشل سائنس کانگریس» کا اخبار اردو میں جےپور سے ریاست کی زیر سرپرستی سرکاری طور پر شایع ہوتا ہے اور اس میں اکثر خبریں اور سرکاری احکامات شایع ہوتے ہیں۔

«صبح الاخبار»۔ اس کا تذکرہ بیشتر «آثار الامصار» کے نام سے کیا جاچکا ہے۔

«تہذیب الاخلاق» علیگڑھ کا اردو اخبار ہے جس کا انگریزی لقب «محمڈن سوشل رفارمر Mohammedan Social Reformer» ہے۔ اس کی ابتدا مسلمانوں کے قایداعظم مولوی سیداحمد خاں نے اپنے سفر یورپ کے بعد سنہ ۱۲۸۷ھ (سنہ ۱۸۷۰ع) میں کی۔ انھوں نے علیگڑھ کی ادبی سوسائٹی اور اس کے اخبار کی بھی بنیاد ڈالی اور وہ پوری سرگرمی سے اسی شہر میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی تجاویز میں منہمک ہیں۔ اس کے لیے گزشتہ موقع پر پٹیالے میں بکثرت همدردانہ جلسے کیے گئے۔

اس رسالے کے سرپرستوں نے ایک طرح کی انجمن بنا رکھی ہے جس کا نام بھی وہی ہے جو اس رسالے کا ہے۔ تمام مشہور و معروف آزاد خیال هندستانی مسلمان اس میں شریک ہیں۔ سید احمد خاں کے قابل فرزند سید محمود نے، جو اب هندستان

واپس ہوئے ہیں کہ اپنے محترم والد کی اعلیٰ ادبی و اصلاحی خدمات میں ان کا ہاتھ بٹائیں، مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس رسالے کے پہلے دو برس کے مکمل پرچے مجھے بھیجیں گے۔ تب میں ان کی خوبی اور اہمیت کا اندازہ کرسکوں گا۔ یہ رسالہ مہینے میں دو بار کوارٹو تقطیع کے ۸ صفحات پر چھپتا ہے۔ یہ علیگڑھ سوسائٹی کے اخبار کی طرح چھپتا ہے اور دوسرے تمام اردو اخبارات کی طرح لیتھوگراف میں نہیں چھپتا۔ پہلے شمارے کی تاریخ یکم شوال سنہ ۱۲۸۷ ھ ہے، دوسرے کی ۱۵ اور پھر اسی طرح سلسلہ وار۔ اس بےمثل رسالے میں جو سلسلۂ مضامین نکل رہا ہے ان میں سے اکثر اسلامی دینیات، فلسفۂ عملی و علمی سے متعلق ہیں۔ ان سے مذہب سے سچی دلچسپی اور روشن خیالی کے ساتھ انسانی ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے۔ زیادہ تر مضامین خود سید احمد خاں کے ہوتے ہیں جن میں مذہب اسلام، اس کے اصول، پیغمبر اسلام، احادیث اور چار اسلامی فرقوں، مذہبی اعتقادات اور تعصبات، غلامی، آزادی خیال، مصر کی قابل تقلید اصلاحات، تربیت اطفال اور تعلیم عمومی، فلسفیانہ اور روایاتی علوم، مذہب اور حکومت کی ہم آہنگی، جدید سائنسوں کی ترقیوں، علم ہئیت کے متعلق اسلامی خیالات، فرق مابین تعلیم و تربیت اور بہت سے اہم اور دلچسپ مباحث پر بحث کی جاتی ہے۔ سال دوم کے تمامتر شمارے (سر) سید کے مقبول نظر مقصد یعنے مسلمانوں کے لیے ایک اعلیٰ یونیورسٹی کے قیام کی تجویز سے متعلق مضامین سے پر ہیں۔

"طلسم فرزین" بنگلور سے نکلتا ہے جس میں کبھی کبھی اچھے مضامین چھپتے ہیں۔

"اردو دہلی گزٹ"۔ آگرے کا یہ اخبار بلا لحاظ اپنے نام کے ہفتہ میں ایک بار چھپتا ہے اور خبروں سے لبریز ہوتا ہے۔ اس میں کابل کے ایک نامہ نگار کی اطلاعیں بھی چھپتی ہیں۔

لاہور کا اردو اخبار موسومبہ "پنجابی" اپنے ایک شمارے[۱] میں اپنے ایک مضمون "ہندستانی شاعری" میں بر سبیل تذکرہ تہذیب‌الاخلاق کی تعریف کرتا ہے۔

"تین یا چار شعرا کے سوا مشاہیر شعرا نے فن قصیدہ نگاری کو ترقی دینے کے قابل

---

۱ شمارۂ ۱۹ مارچ سنہ ۱۸۷۳ ؁ء

نہیں کروانا۔ آتش نے ایک شعر بھی کسی کی مدح میں نہیں لکھا۔ سودا، ناسخ، جراءت، مومن، ذوق، وغیرہ نے قصیدے لکھے تو ہیں لیکن صلے کی توقع کے بغیر۔ غالب کی حد تک یہ، کہ اگر مجھے ان کے احباب اور ان کے شاگردوں کو جو ہندستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں رنج دینے کا خوف نہ ہوتا تو میں یہ ضرور کہتا کہ اس شاعر میں جہاں اور ہر طرح کی اعلیٰ خوبیاں تھیں وہاں یہ عیب بھی تھا کہ جب کبھی وہ کسی نواب، کسی خان، کسی رائے یا کسی مشہور ہندستانی کا ذکر کرتا تو قصیدے کا رنگ اختیار کرلیتا۔ لیکن میں یہاں صرف ان لوگوں کی اصلی کیفیت پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو فن شاعری اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اب شاعری کرنا بہت دشوار ہے۔ جو لوگ اس طرف توجہ کرنا چاہتے ہیں، مفلسی اور ضروریات کی محتاجی انھیں روکتی ہے۔ اس کا اندیشہ ہے کہ اس صدی کے ختم تک بلکہ شاید کچھ ہی عرصے میں یہ فن لطیف بالکل نابود ہوجائے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ اب شعرا باقی نہیں رہ گئے ہیں یا کوئی شخص شعر نہیں کہنا چاہتا۔ اس کے برعکس شاعری کی طلب بڑھ گئی ہے مگر شاعری کا معیار گرگیا ہے۔ ہمارے دور کے شعرا شعر کہتے وقت یہ سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ پڑھنے والوں کو ان کے شعر خوشگوار یا ناخوش گوار معلوم ہوں گے کیوں کہ اچھے شعر سنتے وقت ہر شخص ناقص اشعار کا طالب معلوم ہوتا ہے۔ شعرگوئی کا ہندستانی زبان سے جس قدر تعلق ہے شاید ہی کسی اور زبان سے ہو مگر بدقسمتی سے بجائے اس کے کہ نئے خیالات تلاش کیے جائیں اور نئی طرح ادا کیے جائیں وہی اسلوب اور وہی صنعتیں استعمال کی جاتی ہیں جو متقدمین استعمال کرتے تھے۔ ہندستانی حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ لکھا جاسکتا تھا متقدمین لکھ چکے ہیں اور اب بجز ان کے خیالات کو دہرانے کے اور کوئی صورت نہیں۔

سید احمد خان نے اس امر پر نظر ڈالی ہے کہ نثر کا بھی وہی حال ہے جو نظم کا ہے۔ اس میں بھی ہر جگہ تقلید ہی تقلید نظر آتی ہے۔

انگریز اس امر کو اپنے ادب کا کمال سمجھتے ہیں کہ اس میں آئے دن نت نئے خیالات کا اضافہ ہوتا جائے۔ ہندستانیوں کو ہرگز یقین نہیں آئے گا اگر ان سے یہ کہا جائے کہ ان جدتوں میں فصاحت کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ مگر ہندستانی تو مسلسل تقلید کے قائل ہیں اور کسی نئے اسلوب بیان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہمیں اب یہ چاہیے کہ تقلید ترک کردیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے خاص انداز تحریر کے مطابق لکھے۔

اخبار " پنجابی " جس سے میں نے یہ نقل کیا ہے، محمد اعظم صاحب[۱] کی مستقل ادارت میں شایع ہوتا ہے اور اب تک کامیابی سے نکل رہا ہے۔ اس کا ہرشمارہ کم از کم کوارٹو تقطیع کے تیرہ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر صفحے پر تین کالم ہوتے ہیں حسب سابق مضامین حقیقت میں ادبی لحاظ سے بلند پایہ ہوتے ہیں اور نظمیں بہت دلکش ہوتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعلی اردو شاعری کا مذاق باوجود تخریب کی کوششوں کے اب بھی ہندستان میں بڑی حد تک موجود ہے۔ قابل ذکر مضامین میں سے میں اس سلسلۂ مضامین کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس میں ان فارسی محاورات اور ضرب الامثال سے بحث کی گئی ہے جو اردو میں رائج ہیں۔ ان کی تشریح کے لیے مثالوں کا بہت اچھا انتخاب کیا گیا ہے۔ مجھے اس رسالے کی ایک اور خصوصیت پسند ہے اور وہ یہ کہ اس میں نئی دیسی تصنیفات پر بہت بسیط مضامین ہوتے ہیں۔ ان مضامین کے درمیان ایک ایسا بھی مضمون ہے جو کسی قسم کی دلچسپی کا موجب نہیں[۲]۔ یہ مضمون اہل سنت کے مذہب سے متعلق ایک کتاب موسوم بہ " اظہارالحق " کی تردید میں لکھا گیا ہے۔ اس مضمون کے مصنف جن کا تعلق فرقۂ شیعہ یعنی امامیہ سے ہے، سنیوں کے ادعا کے اور ان کے اس دعوے کے کہ وہ دین برحق پر ہیں، شاکی ہیں۔

---

۱ یہی صاحب جو مشہور مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں، لاہور کے ایک عربی اخبار " النفع الاعظم " کے بھی اڈیٹر ہیں جس کے نام میں ان کے نام کی رعایت رکھی گئی ہے۔ ہندستان بھر سے یہی ایک اخبار عربی میں نکلتا ہے۔

۲ شمارۂ یکم مارچ سنہ ۱۸۷۳ع۔

ایک اور شمارے[1] میں ایک مضمون کا موضوع خطابات کا مذموم اثر ہے جو ایشیا پر بالعموم اور ہندستان پر بالخصوص پڑا۔ یہ خطابات اصلی ناموں کے پہلے یا ان کے بعد اضافہ کیے جاتے ہیں[2] ۔ واجد علی شاہ سابق بادشاہ اودھ نے ہر شخص کو «دولہ» کا خطاب دے رکھا تھا۔ اس طرح ان کا باغبان بجائے محض «مالی» کہلانے کے «گلبان الدولہ» کا خطاب رکھتا تھا۔ ان کے باورچی کا خطاب «نمکین الدولہ» تھا۔ مضمون نگار کا منشا یہ تھا کہ انگریزوں کی متانت کی پیروی کی جائے اور آئندہ سے ان مظاہر پُر شکوہ لیکن فی الحقیقت مہمل خطابات کو ترک کردیا جائے۔

علی گڑھ اخبار[3] کا ایک نامہ نگار بھی ان ہندستانی اعزازی خطابات کا شاکی ہے؛ وہ ان لوگوں کی شکایت کرتا ہے جو بلا امتیاز اور بے لحاظ اس قسم کے القاب استعمال کرتے ہیں جن کا مقصد واضح نہیں ہوتا؛ مثلاً «قبلہ و کعبۂ دوعالم» «ماوا و ملجائے بیکساں» «چارۂ بے چارگاں» وغیرہ ۔ مزید برآں طرز تحریر میں یہ لوگ اس قدر غلو اور مبالغہ سے کام لیتے ہیں کہ بعض اوقات خطوط کا مطلب سمجھنے کے لیے صحاح اور قاموس کی ضرورت ہوتی ہے!

اخبار انجمن پنجاب مورخۂ ۱۵ جولائی سنہ ۱۸۷۲ع میں ایک بلند پایہ اور بےحد دلچسپ مضمون مشرقی مبالغے اور ذوق ستایش کی مخالفت میں شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار کشن لال صاحب طالب ساکن راولپنڈی ہیں اور مضمون اٹھارہ کالموں پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدا ایک قصیدے سے کی گئی ہے جس کا قافیہ «مبالغہ» ہے۔ خاتمہ بھی ایک نظم پر کیا گیا ہے۔

اسی موضوع پر ایک اور مضمون «اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ[4]» میں بھی شایع ہوا ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بدرجۂ مجبوری گورنمنٹ کو ان طولانی اعزازی القاب اور سرکاری خطوط میں آداب انشا کے تکلفات کے خلاف قدم اٹھانا پڑا۔ چنانچہ

---

۱ شمارہ ۲۰ جنوری ۱۸۷۳

۲ ملاحظہ ہو میری کتاب "Memoire sur les noms et titres musulmans"

۳ شمارہ ۳۰ مئی ۱۸۷۳ء

۴ شمارہ یکم اگست سنہ ۱۸۷۳ع

ڈاک کے محکمے میں ان کے استعمال کی ممانعت کردی گئی ہے کیونکہ اکثر پرتکلف القاب کے ہجوم میں نام کا پہچاننا مشکل ہوگیا تھا۔

«اخبارالاخبار» جو بہار کی ادبی انجمن کا اخبار ہے اب بھی اسی طرح دلچسپ ہے اگرچہ کہ سر جارج کیمبل (Sir. G. Campbell) کو خوش کرنے کے لیے اردو متن کے ساتھ ساتھ ہندی ترجمہ بھی شامل کردیا گیا ہے جس کی وجہ سے مضامین کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ ضخامت وہی ہے جو پہلے تھی۔

«اتالیق پنجاب» میں دلچسپ اور مفید مضامین برابر شایع ہوتے رہتے ہیں۔ خصوصیت سے قابل ذکر ایک سلسلۂ مضامین ہے جن میں قدیم اور جدید ہندستان کی مشہور خواتین کے تذکرے ہیں۔

انجمن مناظرہ دہلی سے ہر ماہ اس کا رسالہ شایع ہوتا رہتا ہے جس کا ذکر پنجاب کی اشاعتوں کی سرکاری فہرست میں کیا جاچکا ہے[۱]۔

«المورّہ اخبار» ضلع بدایوں کے اسی قصبے سے شائع ہوتا ہے جس کے نام سے وہ موسوم ہے۔ یہ دیوناگری رسم‌الخط میں چھپتا ہے۔ اس کا کوئی پرچہ میری نظر سے نہیں گزرا اور میں اس کی سیاسی اور ادبی اہمیت کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا لیکن منشی محمدحسین نے علیگڑھ اخبار[۲] میں ہندستان کے خاص اخبارات پر تبصرے کرتے ہوئے اس کو «میٹھا پھوس» کہا ہے۔ اس لفظ کا مفہوم انگریزی لفظ Trash [۳] سے ادا ہوتا ہے۔ اس پر اخبار کے اڈیٹر کو بہت غصہ ہے اور اس لفظ سے پیچ و تاب کھاکر انھوں نے پلٹ کر منشی صاحب کو «بھونکنے والے کتے» کا لقب دیا ہے۔ یہ دونوں القاب پارلیمانی معلوم ہوتے ہیں۔ یورپ میں بھی ہم لوگ اسی قسم کی خوش اخلاقی کے عادی ہیں۔

---

۱ میں نے اس کا ذکر اپنے مقالۂ سنہ ۱۸۷۲ع میں کیا ہے۔

۲ شمارۂ ۲۶ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ ع

۳ اس لفظ سے پرووانسال (Provensal) لفظ "estresse" یاد آتا ہے۔

بٹالہ کی ادبی انجمن لکشمن سہائے کی ادارت میں اپنا ماہوار رسالہ برابر شایع کر رہی ہے جس کا نام «رسالۂ انجمن بٹالہ» ہے۔

ہندی کا بہت پسندیدہ رسالہ «کوی بچن سدھا» ایک مدت سے بابو ہریش چندر کی ادارت میں پہلے ماہانہ پھر مہینے میں دو بار شایع ہوتا رہا اور اب گزشتہ ستمبر سے ہفتہوار شایع ہو رہا ہے اور اس کے مشہور اڈیٹر نے ۱۵ اکتوبر سے چند اور مشہور ہندستانیوں کے ساتھ ہندی ہی میں ایک اور ماہوار رسالہ «ہریش چندر میگزین» کے نام سے نکالنا شروع کیا ہے جس میں نظموں کے انتخابات، تصانیف پر تبصرے، تاریخی، ادبی، سیاسی، فلسفیانہ مباحث، افسانے اور ضرورت کی وجہ سے گپ‌شپ اور لطائف و ظرائف شایع ہوا کریں گے۔ پہلا شمارہ جو بابو صاحب کی عنایت سے میرے پیش نظر ہے کوارٹو تقطیع کے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے پر دو کالم ہیں جن میں رادھا سودھا کی «ساتکا» کے ابتدائی ۲۵ شعر ہیں جو بھکتی سوترا سے لیے گیے ہیں، ایک ڈراما کا ٹکڑا ہے، چند سوالات ہیں جو ہندوؤں کی جانب سے انگریزوں سے کیے ہیں، مختلف مضامین پر کچھ کالم انگریزی میں ہیں۔ ہریش چندر کے ایک مضمون کا ابتدائی حصہ ہے جس کا عنوان «اُراھنا» ہے «کھتری» فرقہ کی ابتدا کے متعلق ایک دلچسپ مضمون ہے جو مسلسل شایع ہوتا رہےگا، دو دوستوں کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ آخر میں مذہب تثلیث پر ایک مضمون ہے اور بابو گدھر سنگھ کے ایک بنگالی ناول کا ابتدائی حصہ ہے۔

«اردو گائیڈ» جس کا اپنی «تاریخ ادب ہندوی و ہمدستانی» میں میں نے صرف ذکر کیا ہے، کلکتے سے شایع ہوتا ہے۔ دو کالم ہوتے ہیں ایک انگریزی اور دوسرا اردو۔ یہ بہت اچھا اخبار ہے اور اس کی اشاعت کثیر ہے۔

اپنی اسی تصنیف میں «شمس‌الاخبار» کا میں نے محض نام ہی گنایا ہے۔ علی‌گڑھ اخبار[۱] سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو اخبار مشنری حضرات مسلمانوں کے خاص عقاید کی تردید میں نکالتے ہیں۔ اس کے اڈیٹر ایک مرتد مسلمان رجب‌علی ہیں۔

---

۱ شمارۂ ۲۶ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ء

گزشتہ سال میں نے محض اشارتاً "پٹیالہ اخبار" کا ذکر کیا تھا جو پٹیالے سے نکلتا ہے۔ لیکن اس کی اشاعت ۱۹ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع میں ایک مضمون "ہندستانی صحافت" پر شایع ہوا ہے جو توجہ کے قابل ہے۔ علی‌گڑھ اخبار نے اپنی ۲۷ دسمبر کی اشاعت میں اس کو نقل کیا ہے۔ ابتدا میں انھیں خیالات کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے اور اس کے بعد کے شماروں میں اسی بحث کی مزید تشریح کے لیے اور بہت سے مضامین شایع کیے ہیں۔ یہ مضامین بہت طویل ہیں اور رسالہ کے کئی کالم ان سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں ان مضامین کا محض ایک نہایت مختصر سا خلاصہ یوں کرسکتا ہوں۔

اڈیٹر "پٹیالہ اخبار" کی رائے میں اخبارات کا پہلا مقصد ناظرین کی ہدایت ہے اور دوسرا مقصد رعایا کی شکایتوں کو حکومت کے سامنے پیش کرنا اور ان کا علاج تجویز کرنا۔ لیکن ان دونوں مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اخبارات کے اڈیٹر خود بھی معزز ہوں، ضروری حد تک فاضل ہوں اور جن مضامین کو پیش کرنا چاہتے ہوں ان کی تشریح و اشاعت کا ہر ممکن ذریعہ استعمال کریں۔ اڈیٹر کی رائے میں بہت کم دیسی اخبارات اپنے اعلی فرائض انجام دینے کے قابل ہیں۔ صرف خبریں ہی ان اخبارات میں کچھ اہمیت رکھتی ہیں مگر ان کی حیثیت بھی ضمیمے کی سی ہے کیوں‌کہ پست مضامین، جن سے اخبار کا اکثر و بیشتر حصہ بھرا ہوتا ہے، کے بعد تھوڑی سی خبریں بھی چھاپ دی جاتی ہیں۔

"پٹیالہ اخبار" کے اڈیٹر کی تمنا ہے کہ ہندستانی اخبارات میں بھی ٹائمز اور دوسرے انگریزی اخبارات کے سے بلند پایہ مضامین شایع ہوسکیں۔ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ ان اخبارات کی انتہائی احتیاط سے ادارت کی جائے تاکہ حقیقی طور پر بہتر نتائج حاصل ہوسکیں اور وہ اثر حاصل ہوسکے جو تعلیم کی عام اشاعت کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میری رائے میں وہ ایک ناقابل عمل تجویز بھی پیش کرتا ہے کہ اس مقصد کے لیے ایک مرکزی کمیٹی بنائی جائے جس میں ارکان کا بہت وسیع پیمانہ پر انتخاب کیا جائے اور یہ کمیٹی ہندستان کے تمام اخبارات کی نگرانی کرے۔

اور بھی بہت سے خیالات جو بہت تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں دائرۂ عمل سے باہر ہیں۔ ان مضامین کا مصنف اخبارات میں اس شے کا طالب ہے جو کسی بات میں حاصل نہیں ہوسکتی۔ یعنی کمال۔ وہ چاہتا ہے کہ نقصان رساں مضامین نہ شایع کیے جائیں (اس حد تک تو اس کا کہنا صحیح ہے) مگر اس کے ساتھ ہی اس کی یہ بھی خواہش ہے کہ انتہائی غیر جانبداری برتی جائے، اشتہارات کی قسم کے مضامین شایع نہ کیے جائیں، ظریفانہ مضامین اور ایسے مضامین جن میں تخییل کی چاشنی ہے، مسترد کردیے جائیں اور صرف سنجیدہ اور کارآمد مضامین شایع کیے جائیں۔ آخر میں وہ باشندگان ہند کے عدم اتفاق پر افسوس کرتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ مسلمانوں کے بھی وہی خیالات ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ مضمون نگار کسی پارٹی کے نمایندے نہ بنیں بلکہ جو کچھ لکھیں عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے لکھیں۔ سب سے بڑھ کے وہ یہ چاہتا ہے کہ اخباروں کے سامنے ذاتی منافع نہ ہوں بلکہ رفاہ عام کے مقاصد ہوں۔

اخبار "پنجابی"[۱] لکھتا ہے کہ اخبارات کی جادوبیانی یہ ہے کہ ایسے محاورات استعمال کیے جائیں جو عام فہم ہوں، زبان سلیس اور صحیح ہو اور سب اس کو سمجھ سکیں اور خیالات جن کا اظہار کیا جائے، پاکیزہ ہوں۔ اس کے سوا ضروری ہے کہ اڈیٹر خبروں کی چھان بین کرے اور انھیں دلچسپی کا موجب بنائے۔ مزید برآں اڈیٹر کو ذہین اور تجربہ کار ہونا چاہیے۔ ضروری ہے کہ وہ سماج سے اچھی طرح واقف ہوں، زندہ دل ہوں، موقع اور محل کی مناسبت سے کوئی برمحل محاورہ یا اچھا سا لفظ استعمال کرنا جانتے ہوں، ایسی رائے جو عوام الناس کے لیے مفید ہو سلیس اور رواں مضامین میں ظاہر کرسکتے ہوں۔ یہ سب خصوصیتیں ہر اڈیٹر کے لیے بہرصورت ضروری ہیں۔ لیکن اگر ان کے ساتھ ساتھ اڈیٹر صاحبان سائنس اور فنون میں بھی قابلیت رکھتے ہوں تو دن بدن ان کے اخبارات کی شہرت اور مقبولیت ناظرین میں بڑھتی جائے گی۔

---

۱ شمارۂ ۲۶ اپریل سنہ ۱۸۷۳ء

اخبارات کی تعلیمی خدمات کے متعلق ایک مضمون "قاسم‌الاخبار بنگلور" کی اشاعت ۲۰ جنوری سنہ ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا ہے جس میں "اخبار عالم" میرٹھ مورخۂ ۲۶ فروری کے ایک مضمون پر رائے‌زنی کی گئی ہے۔ اسی بحث پر اور بکثرت مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ زیادہ بہتر تھا کہ اگر ان مضامین کے لکھنے والوں کے نام معلوم ہوسکتے۔ اخبارات میں اگر ایک طرح کی ترتیب پیش‌نظر رکھی جائے تو بہت ہی اچھا ہو، مثلاً پہلے وہ مضامین جو عام فلاح و بہبود کے لیے لکھے گئے ہیں، پھر خبریں اور پھر وہ مضامین یا خبریں جو نسبتاً کم اہم ہیں۔ یہ سوال بھی قابل غور ہے کہ مضمون نگاروں کے ناموں کے ساتھ مضمون شائع ہوا کریں یا بغیر ناموں کے جیسا کہ انگلستان میں رواج ہے۔ "علیگڑھ اخبار" کا خیال ہے کہ مضامین اگر ان مشاہیر کے زور قلم کا نتیجہ ہوں جن کی قابلیت مسلم ہے تو ان کے نام کے ساتھ شائع کرنا ہی زیادہ مفید ہے۔ اگر صورت برعکس ہو تو اس کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اگر اڈیٹر اس ذریعے سے اپنی قابلیت اظہار کرنا چاہیے تو کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ اس مضمون کا ہندستانی مصنف لکھتا ہے "یہ امر قابل افسوس ہے کہ ہندستان کے اکثر جرائد میں مضامین کے ساتھ ان کے مصنفین کے ناموں کی اشاعت کا مقصد ناظرین کو ان سے واقف کرانا ہے۔ اڈیٹروں کو یہ زحمت گوارا کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اکثر یہ مضامین اس قدر مہمل ہوتے ہیں کہ جن اخبارات میں چھپتے ہیں ان کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں"۔

"پنجابی" مورخۂ ۱۵ مارچ نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس امر کی شکایت کرتا ہے کہ باوجودیکہ ہندستانی زبان روز بروز ترقی کررہی ہے مگر اخبارات وہیں ہیں جہاں پہلے تھے۔ وہ ان کی عدم غیر جانب‌داری کی شکایت کرتا ہے کہ اکثر بے‌محل تعریف اور غلط تنقید محض اڈیٹر کی طبیعت کے لحاظ سے چھاپی جاتی ہے۔ اسے اس کی بھی شکایت ہے کہ یہ اخبارات خود کوئی نئی چیز پیش نہیں کرتے بلکہ انگریزی اخبارات کی نقل کرتے ہیں۔ آخر میں وہ ایسے اخبارات کے اجرا کی خواہش ظاہر کرتا ہے جو خصوصیت سے مذہبی، ادبی اور سائنٹفک

مضامین پر بحث کریں۔ اڈیٹر «الموزہ اخبار» عورتوں کے لیے خاص اخبارات نکالنے کی تجویز پیش کرتا ہے تاکہ آزادئ نسواں کی کوششوں میں اس سے مدد مل سکے[1]۔

«علیگڑھ اخبار» مورخۂ ۲۳ مئی میں یہ خواہش ضرور کی گئی ہے کہ دیسی ریاستوں میں جدید تصانیف پر مضامین شائع کیے جائیں۔ مضمون نگار لکھتا ہے کہ «نئی تصانیف پر ذمہ‌دارانہ تبصرے مصنفین کی ہمت افزائی کا باعث ہوتے ہیں اور کھرے نقاد کی نکتہ‌چینی لکھنے والوں کو اپنے کام کی طرف اور زیادہ متوجہ کرتی ہے»۔ میں یہ کہنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ کچھ عرصے سے بے‌شک ہندستانی رسائل میں اس قسم کے تبصرے شائع ہو رہے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر میں محض بے‌اندازہ مدح‌سرائی کی جاتی ہے اور کتاب کے مضامین کا ایک مختصر سا خلاصہ درج کردیا جاتا ہے۔ (باقی آیندہ)

---

۱ اخبار انجمن پنجاب ۹ مئی سنہ ۱۸۷۳ء۔

مولوی مظہر علی سندیلوی کی ڈائری

(۲)

(از نورالحسن صاحب ہاشمی ایم اے، علیگ)

اب ہندستان کی ریاستوں کی خبریں ملاحظہ ہوں۔ یہ خبریں محض انتخاب ہیں کل نہیں ہیں۔ ابتدا میں واقعات بہت مختصر لکھے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک خود ان کو اپنی زندگی سنوارنے کا موقع نہ ملا تھا لیکن جیسے جیسے ان کی مالی حالت بہتر ہوتی گئی ڈائری میں واقعات زیادہ اطمینان سے لکھے جانے لگے۔

کپورتھلا — یکم نومبر سنہ ۱۸۶۷ع:— لشکر کپورتھلا آج سندیلا ہو کر گزرا۔ چونکہ راجہ صاحب بذریعہ ریل واسطے ملاقات گورنر جنرل بہادر کے لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں لہذا لشکر براہ خشکی پیدل منزل بہ منزل جاتا ہے۔

بلرام پور — ۲۸ مئی سنہ ۱۸۸۲ع:— ۲۷ مئی کو مہاراجہ درگبجے سنگھ والی ریاست بلرام پور و تلسی پور عارضہ استسقا میں بمقام الہ آباد فوت ہوئے، عمر ۵۹ سال تھی۔ مہاراجہ کو سرکار انگلشیہ سے بہت بڑا اعزاز ملا تھا اور گیارہ ضرب توپیں سلامی کی ان کی آمد و شد میں سر ہوتی تھیں۔ سنا گیا کہ قبل وفات ایک لاکھ روپیہ پجاریان الہ آباد وغیرہ کو دیا تھا۔

حیدرآباد — ۱٤ نومبر سنہ ۱۸۸۲ع:— مولوی ضامن حسین صاحب حال سٹی مجسٹریٹ حیدرآباد میری ملاقات کو تشریف لائے اور عندالتذکرہ بیان کیا کہ حیدرآباد دکن میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی کسی کی ملاقات کو آتا ہے تو جس وقت دوسرا پان

صاحب خانہ ملاقاتی کو دیتا ہے تو اس سے رخصتی مفہوم ہوتی ہے اور اہل ملاقات پان کھاکر رخصت ہوجاتا ہے۔

۸ فروری سنہ ۱۸۸۳ ع - سر سالار جنگ مختارالملک وزیراعظم دکن حیدرآباد نے بعارضہ ہیضہ وبائی، آج انتقال کیا۔ یہ بہت بڑے مدبر و فرزانہ روزگار تھے اور ان کے عہد وزارت میں ریاست حیدرآباد نے بہت ترقی حاصل کی۔

٦ فروری سنہ ۱۸۸۰ ع - کل نظام حیدرآباد گدی نشین ہوئے۔ لارڈ رپن صاحب گورنر جنرل بہادر ہند نے گدی نشین کیا۔

بھوپال | ۲ نومبر سنہ ۱۸۸۵ ع :- معائنہ اودھ اخبار سنہ ۱۸۸۵ ع سے معلوم ہوا کہ ۲٦ ماہ حال کو بحکم گورنمنٹ مولوی صدیق حسن خاں صاحب شوہر رئیسہ بھوپال سے خطاب نوابی واپس لیا گیا اور کار ریاست سے بے تعلق ہوئے اور ۱۷ ضرب توپ سلامی کی موقوف ہوئی جس کا سبب یہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب موصوف رعایا پر ظلم و جور بہت کرتے تھے جس کی شکایت سر لیپل گریفن صاحب ایجنٹ راجپوتانہ نے گورنمنٹ سے کی تھی۔

اندور | ۱۷ جون سنہ ۱۸۸٦ ع :- آج مہاراجہ ہلکر نے ۱۱ بجے دن کو انتقال کیا۔

رامپور | ۲٦ مارچ سنہ ۱۸۸۷ ع :- نواب کلب علی خان صاحب والی ریاست رامپور بعوارض چند در چند ۲۳ مارچ یوم چہار شنبہ کو فوت ہوئے۔ نواب صاحب کی ذات سے بہت سے امور متعلقہ رفاہ عام سر انجام پاتے تھے اور قبل وفات نواب صاحب مرحوم نے ایک لاکھ روپیہ واسطے مرمت جامع مسجد دھلی کے عطا کیا تھا۔

حیدرآباد | ۳ نومبر سنہ ۱۸۸۸ ع :- معائنہ اودھ اخبار لکھنؤ سے واضح ہوا کہ سر سالار جنگ مرحوم وزیراعظم حیدرآباد دکن کی پوتی کی شادی ایک امیر زادہ سے ہوئی۔ عمر دولھا تین سال اور دلھن کی ایک ماہ سات دن کی ہے۔ ایسی شادی نادرالوقوع ہے جو قبل اس کے کبھی سماعت میں نہیں آئی اور اسی وجہ سے اس مقام پر اس کا اندراج ہوا۔

بھوپال

۱۹ فروری سنه ۱۸۸۹ع :- آج چودھری نصرت علی صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن تعلقداران اودھ و آنریری مجسٹریٹ لکھنؤ سے ملاقات ہوئی۔ کمال تپاک سے پیش آئے اور مجھے وہ تحریریں معائنہ کرائیں جو ان کے نام شاہجہاں بیگم صاحبہ والئی ریاست بھوپال اور نواب صدیق حسن خاں صاحب شوہر رئیسہ نے بجواب شقه طلب (شادی چودھری عزت علی خلف چودھری صاحب موصوف) بھیجی ہیں اور رئیسه نے ایک ہزار روپیه کا کرنسی نوٹ بطریق نیوته و تیاری جوڑہ کے بمعیت اپنے معتمد کے بھیجا ہے۔ تحریروں سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ ہر دو صاحبان کی نظر الطاف چودھری صاحب پر زاید ہے اور ان کو امیدوار ملازمت بعہدہ نائب وزارت مال کے کیا ہے جس کا اشارہ تحریر نواب صاحب میں درج تھا۔ تعداد مشاہرہ کی بالفعل چار سو پچاس قرار پائی ہے اور آئندہ کو امید ترقی ہے لیکن منشا چودھری صاحب بباعث غیر استقلالی و تلون ریاست کے معلوم نہیں ہوتا۔

رامپور

یکم مارچ سنه ۱۸۸۹ع :- معائنه اودھ اخبار مطبوعه امروزہ سے معلوم ہوا که نواب مشتاق علی خان صاحب والی ریاست رامپور نے بعارضه سرسام بعمر ۴۳ سال واقعه ۲۵ فروری سن حال روز دو شنبه ۲ بجے دن کے انتقال کیا۔ دو لڑکے خورد سال چھوڑے۔ حامد علی خاں ولیعہد کی عمر ۱۴ سال کی ہے۔ صاحب ایجنٹ روھیلکھنڈ نے ولیعہد صاحب کو بتاریخ ۲۷ فروری مسند نشین ریاست کا کیا اور اختیارات ریاست اس وقت عطا ہوں گے جب وہ علوم متعرفه کو حاصل کرکے لیاقت پیدا کریں گے اس وقت تک امور انتظامی بذریعه کونسل تصفیه پاتے رہیں گے جس کے وائس پریسیڈنٹ جنرل اعظم الدین خان صاحب و ممبر جوڈیشل نواب اکرام اللہ خان صاحب یارجنگ و منشی علی حسن خان صاحب ممبر مال ہیں۔ نواب مشتاق علی خان صاحب مرحوم ابتدا عمر سے بعارضه فالج مبتلا تھے۔

بوندی

۵ اپریل سنه ۱۸۸۹ع :- معائنه اودھ اخبار ۵ اپریل سے معلوم ہوا که ۲۸ مارچ سن رواں کو مہاراؤ راجه رام سنگھ والئی ریاست بوندی بعمر ۷۸ سال فوت ہوئے۔ ان کی رعایا ان سے بہت رضامند تھی۔ بجائے راجه صاحب متوفی ان کے بیٹے رگھوبر سنگھ گدی نشین ہوئے۔

بھوپال

۲۶ فروری سنہ ۱۸۹۰ :— بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ سے معلوم ہوا کہ نواب صدیق حسن خان صاحب شوہر شاہجہاں بیگم رئیسہ بھوپال واقعہ ۱۹ فروری سن رواں کو بعارضہ استسقا فوت ہوئے اور ۲۰ کو دفن ہوئے۔ نواب صاحب ساکن قنوج ادنی درجہ کے آدمی تھے لیکن اقبال نے کچھ ایسی ترقی کی کہ دفعتاً شوہر رئیسہ ہو کر مرتبہ اعلی پر پہنچے اور خطاب نوابی گورنمنٹ انگلشیہ سے حاصل ہوا اور گیارہ ضرب توپ سلامی کے مقرر ہوئے۔ لیکن تھوڑے عرصہ میں بہ ثبوت مخالفت گورنمنٹ نے خطاب وغیرہ واپس لیا اور عہدۂ مدارالمہامی ریاست سے معزول کیا جس کا سخت صدمہ نواب صاحب کو ہوا اور کوئی کوشش حصول اعزاز کارگر نہ ہوئی۔ بالآخر اسی کوفت میں انتقال کیا۔ اگرچہ ذی علم تھے لیکن مادہ انتظامی دماغ میں نہ تھا۔ تلوّن کی شکایت تھی اور مخبری پر دار و مدار جس سے سارے اہل کاران ریاست ہر وقت اندیشہ ناک رہتے تھے۔ نواب صاحب کی ذات سے رئیسہ کی بیٹی اور داماد کے درمیان عداوت قلبی تھی۔ نقل ہے کہ اس حادثہ سے اہل کاران ریاست کم ملول ہوں۔

کشمیر

۲۵ جولائی سنہ ۱۸۹۲ ع :—آج پنڈت منوہر ناتھ خلف پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب سابق سب جج اضلاع اودھ ہمراہی راجہ کنمد نراندر بہادر صاحب تعلقہ‌دار میری ملاقات کو تشریف لائے اور اپنی مہذبانہ بات چیت سے مجھے خوش کیا۔ بالفعل پنڈت صاحب سٹی مجسٹریٹ شہر سری‌نگر کشمیر کے ہیں اور ۳۰۰ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ میری ان سے اس وقت کی ملاقات ہے جب‌کہ ان کے والد من ابتدا سنہ۷۳ ع لغایت سنہ ۷۶ ع تحصیلدار سندیلہ تھے۔ پنڈت صاحب کا بیان ہے کہ اس موسم میں جب‌کہ یہاں زمانہ بارش کا ہوتا ہے تو کشمیر کا موسم نہایت خوشگوار و پسندیدہ ہوتا ہے اور دور دور کے لوگ وہاں تفریحاً اسی زمانے میں جاتے ہیں۔

حیدرآباد

۲۶ مارچ سنہ ۱۸۹۳ ع :— بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ سے معلوم ہوا کہ جو مقدمہ توہین کا نواب مہدی حسن فتح نواز جنگ سابق ہوم سکریٹری ریاست حیدرآباد دکن ساکن ضلع نواب گنج اودھ نے دربارۂ اشاعت پمفلٹ

فضیحتی نسبت بدچلنی و بداطواری مسماۃ گرٹڈر ڈانڈلے (زوجہ مہدی حسن) کے مسٹر مترا بنگالی پر دائر کیا تھا اور جس کی تحقیقات مسٹر ویس کوبٹھ اسسٹنٹ رزیڈنٹ حیدرآباد مدت ایک سال سے کررہے تھے اسے ختم کرکے ۱۹ اپریل سنہ ۹۳ع کو اپنی تجویز مجمع عام میں سنائی کہ مترا ملزم اس بنیاد پر بری ہوا کہ اثبات جرم کے یہ ثابت کرنے میں ناکامی کہ مترا نے پمفلٹ شایع کیا تھا اور واجبیت کے بابتہ مجسٹریٹ صاحب نے فیصلہ قلمبند کرنے سے انکار کیا ہرچند کہ فریقین کی استدعا تھی۔

مقدمہ ھذا میں بہت بڑی خوالت و فضیحتی ہوئی جو ہندستان کی تواریخ میں قابل یادگار ہوگی۔ آغا مرزا ملقب بہ سرور جنگ برادر زادہ مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ اضلاع سیتاپور و ہردوئی ساکن دہلی حال سکریٹری صیغہ متفرقات ریاست نظام بانئی مقدمہ ہذا تھے اور انھیں کی مدد سے یہ مقدمہ اس قدر زمانہ تک چلا جس میں لکھوکھا روپیہ صرف ہوا۔ ان کے معین سر خورشید جاہ یکے از دولت‌مند اخوان ریاست ہیں اور مہدی حسن کے مددگار سر آسماں جاہ وزیر ریاست۔ پس انھیں دو صاحبوں کا روپیہ صرف ہوا ورنہ سرورجنگ و فتح نواز جنگ کچھ بالذات ایسی مقدرت نہ رکھتے تھے کہ چند ہزار روپیہ بھی اپنی جیب خاص سے صرف کرسکتے۔ آج کل سرورجنگ کا بہت بڑا زمانہ ہے۔ نظام حیدرآباد دن لی نا ک کے بال ہورہے ہیں اور مابین نظام و صاحب ریذیڈنٹ کے متوسط ہیں۔

یکم اگست سنہ ۱۸۹۳ ع۔ بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ کے واضح ہوا کہ مولوی مہدی علی خاں صاحب ملقب بہ نواب محسن‌الملک جو ہوم ڈیپارٹمنٹ ریاست حیدرآباد کے نامور وزیر تھے اور جن کی لیاقت و عالی دماغی کی بہت تعریف تھی اور ریاست موصوفہ کے سچے خیرخواہ تھے' مسٹر پلوڈل صاحب ریذیڈنٹ حیدرآباد کی پولٹیکل کارروائیوں سے علیحدہ ہوئے اور یکم محرم سنہ ۱۳۱۱ ھ مطابق ۱۵ جولائی سنہ الیہ کو ریاست موصوفہ سے اپنے وطن مالوفہ شہر اٹاوہ کو روانہ ہوئے جن کی مفارقت میں ہزارہا پارسی' دکھنی و ہندستانی بوقت رخصت اسٹیشن ریلوے پر چشم پرنم و گریاں تھے۔ سچ یہ ہے کہ یہ زمانہ خیرخواہ لوگوں کا دشمن ہے۔ یہ مسلمہ

امر ہے کہ جب کسی ریاست میں زوال آنے والا ہوتا ہے تو وہاں سے خیر طلب لوگ اول اسی طور سے علیحدہ ہوجاتے ہیں۔

قلات

۲۴ اگست سنہ ۱۸۹۳ء :- بمعائنہ اودھ اخبار کے واضح ہوا کہ خداداد خاں خان قلات بلوچستان بباعث قتل کرنے اپنے وزیر و وزیر زادہ کے معزول ہوئے اور بجائے ان کے محمود خاں ان کے بڑے بیٹے حسب منظوری گورنمنٹ ہند والی قلات مشتہر ہوئے۔

رامپور

۴ اپریل سنہ ۱۸۹۴ء :- آج صبح کو سر چارلس کراس ویٹ صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ نے نواب حامد علی خانصاحب والئی ریاست رامپور کو حسب ضابطہ مسند نشین کیا اور ایک ہزار اشرفی نواب صاحب نے بطور نذر کے پیش کی۔

حیدرآباد

۹ فروری سنہ ۱۸۹۷ء :- ۳ فروری سن الیہ کو آغا مرزا بلقب نواب سرور جنگ پیشی سکریٹری نظام حیدرآباد اپنے عہدہ سے علیحدہ کیے گئے اور بلدہ سے خارج۔ چار سال تک ان کا زمانہ بہت موافق رہا اور لاکھوں روپیہ کمایا۔ اور سر آسمان جاہ وزیراعظم و نواب محسن الملک مہدی علی خاں و نواب مہدی حسن انہیں کی کارروائیوں سے موقوف ہوئے تھے۔

بھوپال

۱۹ جون سنہ ۱۹۰۱ء :- خط برخوردار مجتبیٰ علی مورخہ ۲۹ صفر موصولہ بھوپال سے واضح ہوا کہ تاریخ ۱۶ جون سنہ ۱۹۰۱ء یوم یکشنبہ ساڑھے ۱۱ بجے دن کے سرکار عالیہ شاہجہان بیگم صاحبہ والی ریاست بھوپال نے بعمر ۶۵ سال مرض آکلا میں رحلت کی جس شکایت میں وہ ایک سال سے مبتلا تھیں۔ رئیسہ کے مزاج میں خیر خیرات بہت تھی اور پکی مسلمان تھیں۔ انھوں نے اپنا عقد ثانی مولوی صدیق حسن قنوجی سے کیا تھا جو شوہر ہونے کے بعد خطاب نواب سے ممتاز ہوئے جو گورنمنٹ نے عطا کیا تھا۔ اسے بارہ سال کا زمانہ ہوا کہ مولوی صاحب موصوف نے رحلت کی۔ مرحومہ بعد نماز مغرب باغ نشاط افزا میں دفن ہوئیں۔ پچیس ہزار سے زائد لوگ شریک نماز تھے۔ بعد وفات رئیسہ مرحومہ ان کی ولیعہدہ

بیٹی سلطان جہاں بیگم صاحبہ داخل تاج محل ہوئیں ۔ چونکہ رئیسہ مرحومہ ۱۶ سال سے ان سے ناراض تھیں اس وجہ سے صرف ایک مرتبہ بیٹی صاحبہ چند منٹ کے لیے اپنی والدہ کی عیادت کو آئیں تھیں اور اب بعد وفات آئیں ۔

۲۸ جون سنہ ۱۹۰۱ع :- آج برخوردار مجتبےٰ علی مع ہمشیرہ منجھلی خود وارد سندیلہ ہوئے جن کی زبانی معلوم ہوا کہ ۳ جولائی مطابق ۱۷ ربیع الاول سنہ رواں کو جناب سلطان جہاں بیگم رئیسہ بھوپال تخت نشیں ہوں گی ۔ لیکن انھوں نے انتظام ریاست ابھی سے شروع کردیا ہے اور ہر ایک کارخانہ میں تخفیف کا لگا لگا دیا ہے ۔ چنانچہ تعمیرات میں ۲۵ ہزار روپے ماہوار کا صرفہ تھا جو گھٹا کر صرف دو ہزار روپیہ کردیا گیا اور جس قدر بیگمات لکھنؤ وغیرہ کی محل سرا میں تھیں ان سب کو نکال دیا گیا اور منشی احتشام علی خلف منشی امتیاز علی صاحب مرحوم سابق وزیراعظم کو جو تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار ملتی تھی وہ موقوف کردی گئی ۔ غرض کہ ریاست میں ہر قسم کا عزل و نصب ہو رہا ہے اور سلطان جہاں بیگم اپنے شوہر احمد علی خاں بلقب سلطان دولھا کی رائے پر کام کرتی ہیں ۔

۲۹ جون سنہ ۱۹۰۱ع :- حالات مختصر جناب نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ رئیسہ بھوپال ۔ آپ ۶ جمادی الاول سنہ ۱۲۵۴ھ میں قلعہ اسلام نگر میں پیدا ہوئیں اور ۲۸ ذیقعدہ سنہ ۱۲۶۰ ہجری کو بیگم صاحبہ کے والد جہانگیر محمد خاں صاحب نے بعارضہ ضعف معدہ انتقال کیا ۔ ۱۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۱ ہجری کو بخشی باقی محمد خاں بلقب امراؤ دولھا صاحب سے آپ کی شادی ہوئی اور ۲۷ ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۴ ہجری کو نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ پیدا ہوئیں ۔ ۲۱ صفر سنہ ۱۲۸۴ ہجری کو امراؤالدولہ صاحب شوہر بیگم صاحبہ نے انتقال کیا اور ۱۴ رجب سنہ ۱۲۸۵ ہجری کو نواب سکندر بیگم صاحبہ والدہ ماجدہ نواب بیگم صاحبہ نے انتقال کیا ۔ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ یکم شعبان سنہ ۱۲۸۵ھ کو مسند نشیں ہوئیں اور موصوف الیہا نے سنہ ۱۲۸۸ ہجری میں مولوی صدیق حسن صاحب قنوجی سے عقد ثانی کر لیا ۔ شاہجہاں آباد کی آبادی میں قریباً ایک ہزار روپیہ صرف کیا جس کو آپ نے خود آباد کیا اور ۱۶ جون سنہ ۱۹۰۱ع

مطابق ۲۹ صفر سنہ ۱۳۱۹ ہجری یوم یکشنبہ کو انتقال کیا اور ۳ جولائی سنہ ۱۹۰۱ع مطابق ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۳۱۹ ہجری یوم پنجشنبہ کو نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ دختر بلند اختر شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ نے تخت شاہی پر جلوس فرمایا اور ان کے خلف اکبر نصراللہ خاں صاحب ولیعہد ریاست مقرر ہوئے ۔ اس وقت عمر رئیسہ حال کی ۴۵ سال ہے اور ان کے دو فرزند اور ایک شوہر نواب سلطان دولہا صاحب اس وقت موجود ہیں اور ان ہی کی رائے پر کام ریاست چل رہا ہے ۔

جودھپور

اس آج خط عزیز از جان سید اعجازالحسن مورخۂ ۱۶ جون سنہ رواں کے جو جودھپور سے موصول ہوا وہ لکھتے ہیں کہ اس ریاست کے سکریٹری پنڈت دینا ناتھ جی صاحب ہیں جن کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار اور پانچ سو کی ان کی جاگیر ہے ۔ پنڈت سکھدیو پرشاد صاحب منجھلے بھائی سکریٹری صاحب کے جوڈیشل سکریٹری ہیں اور انگریزی میں بی ۔ اے پاس ہیں اور خطاب راؤ بہادر گورنمنٹ سے ان کو ملا ہے ۔ تنخواہ ان کی بارہ سو ماہوار ہے ۔ اور پنڈت شیو پرشاد صاحب سکریٹری صاحب کے چھوٹے بھائی کی تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار ہے ۔ اور سر مہاراجہ پرتاب سنگھ وزیراعظم اور مہاراجہ سری دربار کی مشورت سے کام ریاست جودھپور کا سرانجام پاتا ہے اب چونکہ دونوں صاحب ریاست میں تشریف نہیں رکھتے ہیں اس وجہ سے سکریٹری صاحب باستصواب رائے جناب صاحب رزیڈنٹ بہادر امورات اہم ریاست کے انجام دیتے ہیں اور عدالتی کارروائی کونسل سے ہوتی ہے اور انتظامی مصارف بھی صاحب موصوف کے حکم سے ہوتے ہیں ۔ مگر سب امور سکریٹری صاحب ہی کی رائے سے طے ہوتے ہیں ۔

بھوپال

۶ جنوری سنہ ۱۹۰۲ع :- بمعائنہ اخبار انگریزی پانیر الہ آباد کے معلوم ہوا کہ نواب احمد علی خاں صاحب شوہر نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ رئیسہ بھوپال نے بتاریخ ۳ جنوری ۱۹۰۲ع یوم شنبہ بوقت ۳ بجے صبح کے دفعتاً انتقال کیا ۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ قلب پر فالج گرا ۔ نواب صاحب مرحوم کی عمر چالیس کے اندر تھی ۔ اپنے صاحبزادگان نصراللہ خاں و عبیداللہ خاں کی تقریب شادی

میں مصروف تھے جو ۷ شوال آمد کو ہونے والی تھی - سنا جاتا ہے کہ مرحوم سخت منتظم تھے - انھوں نے ہزارہا آدمی ڈیوڑھی خاص سرکار عالیہ شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ کو موقوف کردیا اور اب تخفیف عمال کے کاغذات پیشی میں تھے جن کے واسطے عنقریب حکم تخفیف کا صادر ہونے والا تھا - لیکن قبل اس کے کہ کاغذات ملاحظہ ہوکر کوئی حکم اس پر صادر ہو دفعتاً پیک اجل نے اپنے پنجہ میں ایسا لیا کہ پھر دمزدن کا موقع نہ ملا اور عموماً کل باشندگان اور خصوصاً ملازمت پیشہ کو مرحوم کے انتقال سے نہایت درجہ خوشی ہوئی - البتہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کو سخت صدمہ ہوا جو اپنے شوہر کی نہایت درجہ مطیع و فرماں بردار تھیں -

نانپارہ

۳ مئی سنہ ۱۹۰۲ء :- یکم مئی سنہ ۱۹۰۲ء کو سر راجہ جنگ بہادر تعلقدار نانپارہ نے بعوارض چند در چند بمقام بہرائچ قضا کی - عمر....سال تھی - آدمی نہایت مخیّر اور متمول تھے اور نہایت خشوع خضوع کے ساتھ گیارھویں حضرت پیراں پیر چار روز تک انجام دیتے تھے - اور جو لوگ بغرض شرکت وہاں جاتے تھے ان کو حسب حیثیت زر نقد دیا کرتے تھے مزاج میں انکسار بےحد تھا اور مثل ادنی آدمیوں کے اپنا طرز عمل رکھتے تھے -

حیدرآباد

٦ دسمبر سنہ ۱۹۰۷ء :- نظام حیدرآباد دکن نے ۱۹ نومبر سنہ ۱۹۰۲ء کو ایک دربار منعقد کیا جس میں صاحب ریذیڈنٹ حیدرآباد بھی شریک تھے اور مہاراجہ کشن پرشاد صاحب کو خلعت وزارت عطا فرمایا جو قیمتاً ایک لاکھ روپیہ کا تھا -

اندور

یکم فروری سنہ ۱۹۰۳ء :- کل مہاراجہ ھلکر اندور نے تخت سے کنارہ‌کشی کی - شاید لارڈ کرزن وایسرائے سے کچھ ناچاقی ہوگئی تھی - مہاراجہ موصوف سنہ ۱۸٦۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور سنہ ۱۸۸٦ء میں ریاست کی گدی پر متمکن ہوئے تھے - بعد کنارہ کشی اپنے اکلوتے بیٹے بالا صاحب کو تخت‌نشین کیا جس کی اب عمر بارہ برس کی ہے اور مہاراجہ صاحب کو منجانب ریاست چار لاکھ سالانہ کا گزارہ تجویز ہوا اور انھوں نے اپنی ریاست کا ایک مقام برورھار واسطے سکونت کے تجویز کیا جو دریائے نربدا کے کنارے واقع ہے اور اسی وقت اندور سے روانہ ہوگئے -

حیدرآباد

۸ اپریل سنہ ۱۹۰۳ ع:۔آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب وزیر اعظم حیدرآباد پر نواب سید سراج الحسن امیر یار جنگ بہادر نے بذریعہ قاضی کبیرالدین بیرسٹر ایٹ لا بمبئی و مسٹر مراد جی وکیل حسب منشا دفعہ ۳۶۱، ۳۶۳، ۴۹۳، ۴۹۶، ۱۰۹، تعزیرات ہند باجلاس کنٹونمنٹ مجسٹریٹ مقدمہ دایر کیا ہے کہ ان کی پوتی مسماۃ غوثیہ بیگم نابالغہ دختر سید نورالدین متوفی کو بلا اجازت نالشی عقد کرکے اپنے محل میں داخل کرلیا ہے۔چونکہ یہ جرم انگریزی عملداری میں وقوع پذیر ہوا ہے لہذا مدعاعلیہ پر سمن جاری ہونا چاہیے اور یہ نالش سکندرآباد کے مجسٹریٹ کے اجلاس میں رجوع ہوئی ہے اور بیرسٹر نے یہ بھی بیان کیا کہ حسب دفعہ ۱۸۱ ضمن ۴ ضابطہ فوجداری سے عدالت میں یہ مقدمہ دائر ہونا چاہیے۔

۹ مئی سنہ ۱۹۰۳ع:۔مسماۃ فیض النسا بیگم زوجہ مسٹر سید نورالدین متوفی نے اخبار مشیر دکن کو چٹھی بھیجی کہ عدالت کنٹونمنٹ مجسٹریٹ سکندرآباد میں سید سراج الحسن نے مہاراجہ کشن پرشاد صاحب وزیر اعظم پر جو نالش دائر کی تھی وہ خارج ہوئی اور بوجہ پردہ نشینی اس کی اطلاع مجھے دیر کو ہوئی لہذا اب میں سچے واقعات ظاہر کرتی ہوں کہ میری دختر غوثیہ بیگم پر جو الزام عداوتاً لگائے گئے ہیں ان کی تردید کروں۔ غوثیہ بیگم مسٹر سید نورالدین اور میری دختر ہے جو صغیرسنی سے اپنے والد متوفی اور میری حفاظت و نگرانی میں پرورش پاتی رہی۔ اب اس کی عمر ۲۱ برس کی ہے۔ اس کے بلوغ کو پانچ برس کا عرصہ ہوا۔ گو مسٹر سراج الحسن غوثیہ بیگم کے دادا ہیں لیکن کبھی وہ ان کی حفاظت اور نگرانی میں نہیں رہی۔ میں نے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے ساتھ اپنی خوشی اور اپنے لڑکے یعنی اس کے بھائی سید معین الدین کی رضامندی سے غوثیہ بیگم کی نسبت کردی۔ یہ گفتگو ایک سال سے ہورہی تھی جس سے سراج الحسن اور تمام اہل خاندان واقف تھے اور جن باتوں کا انھوں نے ذکر کیا وہ محض بے بنیاد ہیں۔ نہ میرے بیٹے سکندرآباد کو گئے اور نہ کسی عورت نے اسے بھکایا اور نہ کسی وقت مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے مذہب کے بارے میں مجھ سے غلط بیانی کی۔ تمام باتیں میری رضامندی سے ہوئیں۔

۲۳ مئی سنہ ۱۹۰۳ع:۔مہاراجہ کشن پرشاد صاحب وزیراعظم کے خاندان میں برابر یہ دستور چلا آتا ہے کہ منجملہ اور بیبیوں کے ایک مسلمان بی‌بی بھی تصرف میں آیا کرتی ہے چنانچہ مہاراجہ چندولال جو مہاراجہ حال کے پردادا تھے ان کی بھی ایک مسلمان بی‌بی تھی۔ علی‌ھذا ان کے بعد جو جو راجہ وزیر مقرر ہوئے ان کے بھی ایک زوجہ مسلمان ہوتی آئی۔ چنانچہ مہاراجہ صاحب حالی کے بھی مسلمان زوجہ سابق میں تھی جو فوت ہوگئی' اب مسماۃ غونیہ بیگم بنت فیض‌النسا بیگم زوجہ ثانیہ ہوئی ہیں۔

محمودآباد

۳۱ مئی سنہ ۱۹۰۳ع:۔سر راجہ محمدامیرحسن خان صاحب تعلقہ دارمحمودآباد تاریخ ۳۰ مئی سنہ ۱۹۰۲ع کو بوقت ۸ بجے صبح کے بعوارض چند در چند فوت ہوئے۔ مرحوم نہایت لائق و فائق تعلقہ‌دار تھے۔ سنہ ۱۸۶۲ع میں میں اور وہ ایک ساتھ مدرسہ سیتاپور میں انگریزی پڑھتے تھے۔ مزاج میں نہایت خلق و مروت تھی۔ مرحوم ۱۶ جون سنہ ۱۸۴۹ع کو پیدا ہوئے تھے۔ اس حساب سے ان کا سن تقریباً ۵٤ سال کے تھا۔ اولاد لایق چھوڑ گئے۔

کشمیر

۴ اگست سنہ ۱۹۰۳ع:۔یہاں پانی کی کمی ہے اور کشمیر میں ۲۹ جولائی کو اتنا پانی برسا کہ سیلاب آگیا جو سنہ ۱۸۹۳ع کے سیلاب سے دو فٹ بلند تھا۔ وہاں کے باشندے پہاڑوں پر چڑھ گئے اور کشتیوں پر جاکر پناہ لی۔ ریذیڈنسی و ہوٹل اور ہوٹلوں کے مکانات زیریں میں چھت تک پانی بھر گیا۔ خیریت ہوئی کہ سیلاب دن کو آیا؛ اگر رات کو آتا تو بہت سی جانیں تلف ہوجاتیں۔ آبادی میں دس سے پندرہ فٹ کی گہرائی میں پانی تھا۔ ایسا سیلاب وہاں کبھی نہیں آیا۔

۷ ستمبر سنہ ۱۹۰۳ع۔جو سیلاب ۲۴ جولائی سنہ ۱۹۰۳ع کو کشمیر میں آیا تھا اس سے سات ہزار مکان شہر کے منہدم ہوگئے اور تیس ہزار آدمی بےخانماں ہوئے۔

رامپور

۹ فروری سنہ ۱۹۰۴ع۔آج منشی میکولال صاحب شاعر لکھنؤ تخلص عشرت عزیز راجہ درگا پرشاد صاحب موضع کھجونہ سے میری ملاقات کو آئے اور کہا کہ میں آخیر ہفتہ دسمبر سنہ ۱۹۰۳ع میں مہمان راجہ کشن کمار صاحب رئیس

سوہر پور ضلع مرادآباد کو گئے جہاں ایک جلسہ بدیں غرض منعقد ہوا تھا کہ نواب حامد علی خاں صاحب والی ریاست رامپور قلعہ زیر تعمیر برج جنوبی کا بنیادی پتھر تاریخ ۲۸ دسمبر سنہ ۱۹۰۳ء وقت ۱۰ بجے دن کے رکھیں۔ چنانچہ نواب صاحب نے کنّی شرنی سے بنیاد رکھی۔ اور جلسہ رقص و سرود منعقد ہوا۔ اولاً ایک طوائف منّی نامی نے جو علیگڑھ سے ۴۰۰ روپیہ یومیہ پر آئی تھی رقص شروع کیا۔ ہنوز اس نے کچھ گایا نہیں تھا کہ حضرت نواب صاحب نے جو جلسہ کے محاذ ایک کمرہ میں مع اپنے مصاحبین کے تشریف فرما تھے، طوائف مذکور کو طلب کیا اور سر مجلس اس سے مذاق شروع کردیا جو ایک گھنٹہ تک کرتے رہے۔ اس کے بعد طوائف مذکورہ کو اپنے ہمراہ لیے چلے گئے۔ یہ امر خلاف تہذیب سب حاضرین کو ناپسند ہوا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ اکثر والیان ملک و رؤسا کو نگاہ وقعت سے نہیں دیکھتی ہے کہ طرز معاشرت ان کی نہایت خراب و خلاف تہذیب ہے۔

حیدرآباد

۱۹ اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ء: آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۲۷ ستمبر سنہ ۱۹۰۸ء کو شدت کی بارش حیدرآباد میں ہوئی اور سیلاب آئے اور تالاب [illegible] کا بند ٹوٹ جانے سے مفصلہ ذیل محلے تباہ و برباد ہوگئے۔ ریذیڈنسی۔ بازار شیری۔ مہراج گنج۔ افضل گنج۔ یہ محلے تو بالکل تباہ ہوگئے اور ریذیڈنسی کے مغربی جانب تھوڑے فاصلہ پر جو عمارات کی قطار واقع تھی وہ بالکل مسمار ہوگئی۔ چادرگھاٹ ہلماث یہ دونوں گاؤں بہہ گئے۔ پل اکورا اور کوٹھی جوڑا اور ڈاک خانہ بالکل منہدم ہوگئے۔ افضل گنج کے کنارے کنارے جو مکانات تھے ان میں کوئی باقی نہیں رہا۔ عابد کمپنی کا کارخانہ واقعہ چادرگھاٹ سے لے کر سرکاری باغات کی سڑک تک نوبت خانہ بازار کا ایک حصہ منہدم ہوگیا۔ جان بازار۔ مہراج گنج۔ ٹھنڈی بازار اور بیگم بازار بالکل مسمار و منہدم ہوگئے ہیں۔ شمالی جانب ایک پل سے دوسرے پل تک جس قدر گاؤں و بستیاں دریا کے کنارے واقع تھیں سب بہہ گئیں۔ شہر میں بارہ دری۔ پوسٹ آفس بازار مستعد کوچ۔ امین باغ۔ نیزہ گلی تک بہہ گئی۔ افضل گنج کا اسپتال جس کی تیاری میں دس بارہ لاکھ روپیہ صرف ہوا ہوگا اس کا ایک بڑا حصہ

مسمار ہوگیا۔ زنانہ اسپتال امین باغ جس کا بنیادی پتھر بیگم شہزادہ ویلس نے رکھا تھا اور جس کی تیاری میں چار لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا اس کا بہت بڑا حصہ گر گیا۔ نظام حیدرآباد کو اس واقعہ سے سخت صدمہ ہوا۔ لکھا ہے کہ ایک چہارم شہر حیدرآباد تباہ و برباد ہوگیا۔ دریائے موسٰی ان پہاڑوں سے نکلا جو شہر سے ۵۰ میل پر واقع ہیں۔ جاڑے اور گرمی کے موسم میں یہ بالکل ہی بےحقیقت نالہ معلوم ہوتا ہے اور برسات میں بھی اس دریا سے لوگ پایاب عبور کرتے ہیں۔ اس دریا میں اکثر طغیانی آتی ہے جس سے نقصان پہنچتا ہے خاص کر سنہ ۱۷۴۸ع اور سنہ ۱۸۷۱ع و اکتوبر سنہ ۱۹۰۳ع میں جو سیلاب اس دریا میں آئے ان سے بہت نقصان ہوئے اور بےشمار لوگ غرق ہوئے اور بہت سے مکانات مسمار ہوگئے۔

۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ع:—آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ سیلاب آنے سے جو تباہی و بربادی شہر حیدرآباد کی ہوئی اس کے واسطے اس وقت تک حسب ذیل چندہ ہوا ہے

لارڈ منٹو وایسرائے ہند	لیڈی منٹو	نظام حیدرآباد اپنی جیب خاص سے	
۱۵۰ پونڈ	۷۵ پونڈ	۴ لاکھ پچاس ہزار	
گورنمنٹ حیدرآباد	گورنر بمبئی	کریم بھائی ابراہیم	دوارکا داس وغیرہ
دو لاکھ	۲۵۰		

اور سرسوتی بورڈ؟ وغیرہ۔ منجانب ریاست حیدرآباد تیس ہزار آدمیوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ ایک لاکھ آدمی بےخانماں ہوگئے۔

۲۴ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع:—آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ حیدرآباد کے سیلاب سے ۵۲ وارڈ ویران ہوگئے اور ڈیڑھ کروڑ کی جائداد غیر منقولہ اور ایک کروڑ کی منقولہ جائداد کا نقصان ہوا۔ ایک لاکھ انتیس ہزار روپیہ مصیبت‌زدوں کی امداد کے لیے چندہ ہوا ہے اور یہ چندہ ۱۶ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع تک کا ہے۔ جو چندہ اب کے ہوا ہے اس کی تعداد آئندہ تحریر ہوگی۔ قریب ستر ہزار کے جانیں تلف ہوئیں۔ یہ امر حیدرآباد کے جلسے عام میں طے ہوا جس میں اعلٰی و ادنٰی ہر قسم کے لوگ شریک جلسہ تھے۔

یکم ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء:- آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ نواب میر محبوب علی خان بہادر نظام حیدرآباد دکن مورخہ ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۶ع کو پیدا ہوئے تھے اور ۲۹ اگست سنہ ۱۹۱۱ع کو عارضہ فالج میں وفات پائی۔ عمر ۴۵ سال تھی۔ مرحوم تعلیم یافتہ اور شکار دوست تھے۔ متوفی کی بجائے ان کے بیٹے میر عثمان علی خان مسند نشین ہوئے جن کی عمر اس وقت پچیس سال کی ہے۔

۲۱ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ع:- بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ واضح ہوا کہ ہز ہائی نس نواب میر عثمان علی خان جدید نظام دکن حیدرآباد تاریخ ۲۹ جمادی الثانی سنہ ۱۳۰۳ھ یوم سہ شنبہ وقت ۹ بجے رات کو پیدا ہوئے تھے۔

—o—

اب سمندر پار اور ہمالیہ پار کے حالات ملاحظہ ہوں زیادہ تر یہ حالات مختلف اخباروں مثلاً اودھ اخبار اور پاینر سے لیے گئے ہیں۔ اودھ اخبار خود منگاتے تھے اور دوپہر کو سونے کی بجائے اسی کا مطالعہ کرتے اور اس میں سے اہم خبروں اور دلچسپ معلومات کا خلاصہ درج روزنامچہ کرتے۔ ذیل میں بعض چند درج کی جاتی ہیں۔ بہت سی معلومات مثلاً مدت عمر جانوران، گزارہ سالانہ خاندان شاہی انگلستان، دنیا کے دس بڑے دولت مندوں کے نام و تعداد روپیہ، جارج اسٹیفن کی ایجاد انجن، ملکہ وکٹوریا کی زندگی اور ان کی اولاد کا حال، فہرست آمدنی سلطنت‌ہائے روئے زمین، شرائط صلح‌نامہ مابین روس و جاپان وغیرہ وغیرہ بخوف طوالت نظرانداز کیے گئے۔

۲۹ مارچ سنہ ۱۸۷۸ع | جو لڑائی سلطان روم و روسیوں سے ہو رہی تھی اس میں سلطان کو شکست ہوئی اور بحالت مجبوری صلح کرنے کو مجبور ہوئے۔ شرائط صلح ابھی دریافت نہیں ہوئے ہیں: مگر اس بات کا ضرور اندیشہ ہے کہ روسی ایک نہ ایک روز ضرور قسطنطنیہ دارالخلافت روم کو اپنے قبضہ میں لے‌آویں کے کیونکہ سامان جنگ روسیوں کا بمقابلہ سلطان کے بکثرت ہے اور سلطنت روم کو روز بروز زوال نظر آتا ہے۔

۸ مئی سنہ ۱۸۷۸ع | درمیان گورنمنٹ انگلستان و روس بباعث مزاحمت نہر باسفرس فی‌الجملہ صورت رنجش کی پیدا ہے اسی وجہ سے فوج انگریزی

ہندستان سے براہ بمبئی بجانب ٹاپو مالٹا بھیجی گئی ہے عجب نہیں کہ جنگ ہو۔

۲۵ اکتوبر سنہ ۱۸۷۸ع | منجانب انگلش گورنمنٹ بافسری چمرلین صاحب کابل کو سفارت جاتی تھی۔ بمقام علی‌مسجد فیض‌محمد خاں گورنر علی‌مسجد نے حسب اشارت امیر شیر علی خاں والیٔ کابل سفارت کو آگے جانے سے روکا لہذا سرکار نے حکم فراہمی فوج بندھنے لام کا بمقام پیشاور دیا ہے۔ غالباً تھوڑے زمانہ میں لڑائی ہو۔

۲۳ نومبر سنہ ۱۸۷۸ع | سرکار اور امیر شیرعلی خاں والی کابل سے لڑائی شروع ہوگئی ہے۔ ۲۱ نومبر سنہ ۱۸۷۸ع کو اس کا آغاز ہوا تھا۔ ۲۲ ماہ حال کو قلعہ علی‌مسجد فتح ہوگیا اور سرکار انگریزی کے قبضہ میں آیا۔

۲۵ مارچ سنہ ۱۸۷۹ع | جنگ کابل ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ ایک فوج کابلی مع سامان کثیر واسطے مقابلہ انگریزوں کے کابل سے جلال‌آباد کو بھیجی گئی۔

۹ ستمبر سنہ ۱۸۷۹ع | معائنہ اودھ اخبار سے دریافت ہوا کہ میجر کوگنارل صاحب ریذیڈنٹ و دیگر حکام انگلش بمقام کابل بالاحصار قتل ہوئے۔ کوئی شخص فوج انگریزی کا باقی نہیں رہا جس کا سبب بہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ فوج کابلی امیر صاحب غدر کرکے باعث اس قتل‌عام کی ہوئی ہے اور امیر یعقوب خاں بھی بحالت محصوری ہیں۔ لہذا فوج انگریزی قندھار سے واسطے تادیب فوج باغی کے کابل بھیجی گئی ہے۔

۸ اپریل سنہ ۱۸۸۵ع | کل بمقام راولپنڈی عبدالرحمان خاں صاحب امیر کابل و لارڈ ڈفرن صاحب گورنر جنرل کشور ہند سے ملاقات ہوئی اور بہت تحایف امیر کابل کو منجانب سرکار دیے گئے۔ بہت بڑے بڑے رئیس اس دربار میں شریک تھے۔

۱۳ اپریل سنہ ۱۸۸۵ع | ۳۰ مارچ سن‌الیہ کو بمقام پنجدہ متعلقہ کابل افغانان اور روسیوں سے لڑائی ہوئی۔ پانچ سو فوج امیر کابل کی قتل ہوئی۔ جنرل کمروف فوج روسیہ کا افسر تھا۔

بکم جون سنہ ۱۸۸۵ء | معائنہ پرچہ جریدہ روزگار مدراس نمبری ۲۱۵ محررہ ۲۶ مئی سنہ ۱۸۸۸ء سے واضح ہوا کہ ممالک ذیل کی آبادی حسب صراحت تحت ہے :-

چین	۴۰ کرور	
سلطنت برطانیہ	۳۶	"
روس	۱۰	"
فرانس	۷	"
ممالک متحدہ امریکہ	۵ ½	"
جرمنی	۵	"

۱۹ جون سنہ ۱۸۸۸ء | بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ کے واضح ہوا کہ ۱۵ جون سنہ ۱۸۸۸ء کو یوم جمعہ ساڑھے بارہ بجے دن کے شہنشاہ فریڈرک جرمن نے تین مہینے ۶ یوم سلطنت کے بعد بعمر ۴۷ سال عارضہ خناق میں قضا کی ۔ متوفی ملکہ وکٹوریا انگلینڈ کے بڑے داماد تھے ۔

۳۰ جون سنہ ۱۸۸۸ء | معائنہ اودھ اخبار مورخہ ۲۷ جون سنہ ۱۸۸۸ء نمبری ۱۳۸ سے واضح ہوا کہ مردم شماری سلطنت‌ہائے ذیل میں حسب مندرجہ تحت ہے :-

لندن	دارالسلطنت	انگلستان	۳۶۵۵۸۱۹
پیرس	"	فرانس	۲۲۶۹۰۲۳
برلن	"	پروشیا	۱۱۲۲۳۳۰
سینٹ پیٹرس برگ	"	روس	۶۶۶۶۶۳
کلکتہ	"	ہندستان	۶۶۲۹۸
وائنا	"	آسٹریا	۲۰۱۰۵
قسطنطنیہ	"	ٹرکی	۰۰۰۰۰
میڈرڈ	"	اسپین	۵۰۰۹۰۰

۴ اپریل سنہ ۱۸۸۹ء | ممالک یورپ مندرجہ ذیل میں اشخاص ناخواندہ یعنی جاہل حسب ذیل ہیں جس کی شہادت اخبار سررشتہ تعلیم

اودھ یکم اپریل سنہ ۱۸۸۹ع سے کاحقہ ہوتی ہے :-

نام ملک	تعداد فی صدی	نام ملک	تعداد فی صدی
روس و سرویا و رومیلہ	۸۰	فرانس و بلجیم	۱۵
اسپین	۶۳	انگلستان	۱۲
اٹلی	۴۸	اضلاع امریکہ	۸
ھنگری	۴۱	اسکاٹ لینڈ	۷
آسٹریا	۳۹	جرمنی	۱
سوئٹزرلینڈ	۲۵	ڈنمارک - بویریا	۰
آئرلینڈ	۲۱	ھندستان	۸۳ یعنی

ھندستان میں سو میں صرف ۱۷ آدمی لکھے پڑھے ہوتے ہیں - مقام غور ہے کہ ھندستان کے باشندے روسیوں سے بھی جو جاہل قوم مشہور ہے' تہذیب و شائستگی میں پیچھے رہ گئے -

۳۶ ستمبر سنہ ۱۸۹۰ع

سچ ہے دنیا میں تہذیب و شایستگی کی روزافزوں ترقی ہے علی الخصوص یورپ کو اگر مخزن تہذیب کہیں تو گنجائش ہے - ایک ادنیٰ سی بات یہ ہے کہ اودھ اخبار محررہ امروزہ مترجمہ انگریزی ٹائمس سے معلوم ہوا کہ بالفعل تخمیناً اڑتالیس ہزار اخبار تمام دنیا میں شایع ہوتے ہیں ان میں چوبیس ہزار یورپ میں ہیں - حسب ذیل :-

جرمنی ۵۵۰۳' فرانس ۴۱۰۰' انگلستان ۴۰۰۰' آسٹریا ھنگری ۳۵۰۰' اٹلی ۲۴۰۰' اسپین ۸۵۰' روس ۸۰۰' سوئٹزرلینڈ ۴۵۰' ھالی لینڈ ۳۰۰' امریکہ ۱۲۵۰۰' کنیڈا ۷۰۰' آسٹریلیا ۷۰۰' ایشیا ۳۰۰' جاپان ۱۰۰' افریقہ ۲۰۰ -

۴ ستمبر سنہ ۹۱ع

بمعاینہ اودھ اخبار امروزہ بحوالہ ملٹری گزٹ مطبوعہ ۲۸ اگست سن الیہ سے واضح ہوا کہ مکہ معظمہ میں حفظان صحت کا عمدہ بندوبست نہیں ہے اس وجہ سے ہر سال شکایت ہیضہ وبائی بکثرت ہوتی ہے اور ایک ایک تاریخ میں چار چار پانچ پانچ سو آدمی مبتلائے عارضہ مہلکہ ہوکر ضایع ہوتے ہیں - نقشہ سرکاری چھے سال گزشتہ سے واضح ہوتا ہے کہ جس قدر

حاجی بمبئی سے گئے ان میں سے دو ثلث سے زیادہ ہندستان واپس نہیں آئے ۔

حاجیوں کا شمار

سنہ	روانگی	مراجعت	ضایع
سنہ ۱۸۸۵ء	۸۴۳۶	۵۰۴۵	۳۳۹۱
سنہ ۸۶ء	۸۶۰۶	۶۱۵۰	۲۴۵۶
سنہ ۸۷ء	۹۴۶۶	۵۷۲۶	۳۷۴۰
سنہ ۸۸ء	۱۲۹۷۰	۶۶۰۵	۷۴۶۵
سنہ ۸۹ء	۱۲۳۹۵	۱۱۱۰۱	۱۲۹۴
سنہ ۹۰ء	۱۱۶۶۵	۸۶۶۲	۳۰۰۲
میزان	۶۳۶۲۸	۴۲۱۸۹	۲۱۴۴۹

۲۰ نومبر سنہ ۹۲ء | چند اقوال میں تجربہ کار عاقلوں کے درج ذیل کرتا ہوں جو قابل یاد رکھنے کے ہیں :-

ملٹن — سچ کی کسی ظاہری برائی سے قدر کم نہیں ہوسکتی جیسا کہ سورج کی کرنوں کو کوئی ہاتھ لگاکر میلا نہیں کرسکتا ۔

کوپر — خالی بیٹھا رہنا آرام نہیں ہے؛ جو دل کہ کسی شغل سے خالی ہے وہ غم سے بھرا ہوا ہے ۔

— جو کسی کی برائی کرتا ہے خود اسی کے خیالات اسے رنج و دکھ میں رکھتے ہیں ۔

سعدی — دو شخصوں کے درمیان ایسی بات کہنا چاہیے کہ اگر وہ دوست ہوجاویں تو ان سے شرمندہ ہونا نہ پڑے ۔

سعدی — جو کوئی شخص بروں میں بیٹھے اگرچہ ان کی عادات اس میں اثر نہ کریں لیکن بروں کے فعل کی تہمت اس پر بھی لگے گی ۔

سعدی — بےوقوف کے لیے خاموشی سے بہتر کوئی بات نہیں ہے لیکن اگر وہ امر مصلحت کو جانتا تو بےوقوف نہ ہوتا ۔

سعدی — جو اپنی امیری کی حالت میں بھلائی نہیں کرتا وہ غریبی کی حالت میں تکلیف اٹھاتا ہے ۔

۲ جولائی سنہ ۹۳ء | بمعائنہ اودھ اخبار لکھنؤ مطبوعہ دیروزہ سے معلوم ہوا کہ (۱) تمام روئے زمین پر اہل اسلام کی آبادی ساڑھے سترہ کروڑ ہے (۲) شہر لندن کی ۷۰۰ مربع میل میں آبادی ہے (۳) تمام دنیا میں ایک ارب ۷۲ کروڑ پچاس لاکھ من گیہوں پیدا ہوتا ہے ۔ واقعی اس زمانہ میں شہر لندن سے کوئی دوسرا بڑا شہر بلحاظ طول و آبادی روئے زمین پر نہیں ہے ۔

۲۱ ستمبر ۹۳ء | مسٹر ڈیورنڈ کا کمیشن بغرض صلاح و مشورہ عبدالرحمان خاں امیر کابل ۱۵ ستمبر سن الیہ کو پشاور سے روانہ جمرود ہوا۔ یہ کمیشن لارڈ لینس ڈاؤن صاحب گورنر جنرل کشور ہند کی ہدایت سے بدیں غرض بھیجا گیا ہے کہ مراتب ضروریہ سرحدی کے بعد یہ بھی امیر سے طے کرے کہ وہ قندھار تک ریل بنانے کی اجازت عطا کریں ۔

۱۸ نومبر سنہ ۹۳ء | لارڈ سالسبری سابق وزیر اعظم انگلستان کا وزن جسمانی ۳ من ٦ سیر اور حال کے وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹن کا کا دو من ۴ سیر ہے ۔ ایک ڈاکٹر کا قول ہے :— سر ٹھنڈا رکھو، پاؤں گرم اور عادات باقاعدہ، پھر تم کو طبیب اور ڈاکٹر کی ضرورت نہ ہوگی ۔

۲۳ نومبر سنہ ۹۳ء | سفارت مسٹر ڈیورنڈ کامیابی کے ساتھ کابل سے واپس ہوئی ۔ امیر عبدالرحمان خاں صاحب نے ہر طرح سے اس کی خاطرداری کی اور جملہ عہد و مواثیق مابین گورنمنٹ اور امیر کابل بسہولت طے ہوگئے اور برٹش گورنمنٹ نے بعوض بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اب اٹھارہ لاکھ روپیہ سالانہ کا گزارہ امیر کابل کا مقرر کردیا یعنی ڈیڑھ لاکھ روپیہ ماہوار ان کو ملا کریں گے اور جس قسم کے آلات حرب وغیرہ امیر کابل چاہیں انگلستان سے منگالیں ۔

۹ مارچ سنہ ۹۴ء | ۳ مارچ سن رواں کو مسٹر گلیڈسٹن وزیر اعظم انگلستان نے اپنی ملازمت سے بحضور ملکہ معظمہ استعفا داخل کیا اور لارڈ روز بیری صاحب کو یہ اعزاز بخشا گیا ۔ مسٹر گلیڈسٹن نے بوجہ ضعف بصارت

و نہ منظور ہوئے بلکہ ہوم رول آئرلینڈ کے استعفا داخل کیا۔ اب ان کی عمر ۸۳ سال ہے۔

۵ نومبر سنہ ۹۴ع | معائنہ اخبار پائنیر انگریزی الہ آباد و مطبوعہ ۲ نومبر سے واضح ہوا کہ زار روس (الکزنڈر سوئم شہنشاہ روس) نے پھپھوڑے کے عارضہ میں مقام لیوادیا تاریخ یکم نومبر پنجشنبہ سوا دو بجے شام کو انتقال کیا۔ یہ بادشاہ بہت صلح پسند تھا۔

۹ جنوری سنہ ۹۵ع | معائنہ ملٹری گزٹ لاہور مطبوعہ یکم دسمبر سے واضح ہوا کہ سلطنت ہائے ذیل میں مفصلہ تحت فوج بحالت صلح و جنگ پائی جاتی ہے:-

نام سلطنت	تعداد افواہ صلح	تعداد افواہ جنگ	توپوں کی تعداد
روس	۱۰۲۰۰۰۰	۳۵۰۰۰۰۰۷	۳۳۶۰
جرمنی	۵۵۷۰۰۰	۴۳۰۰۰۰۰	۲۹۹۴
فرانس	۵۷۲۰۰۰	۴۰۰۰۰۰۰	۲۸۸۰
اٹلی	۲۲۰۰۰۰	۲۹۸۰۰۰۰	۱۶۲۰
آسٹریا	۲۹۰۰۰۰	۱۴۲۷۰۰۰	۱۹۱۲
ٹرکی	۱۷۰۰۰۰	۱۱۰۰۰۰۰	۲۵۰۰
اسپین	۱۰۰۰۰۰	۷۰۰۰۰۰	۸۰۰
برطانیہ اعظم	۲۱۱۰۰۰	۶۲۴۰۰۰	۶۰۰

۲۵ فروری سنہ ۹۵ع | دنیا میں سب سے بڑا بلند قد آدمی حسن علی مصری ہے جس کی عمر اس وقت ۱۶ برس اور قد سات فٹ ۹ انچ ہے اور ہنوز نشو و نما جاری ہے اور صرف اپنی طویل القدی کے بدولت نمائش برلن دارالسلطنت جرمن میں پیش ہوا۔

۲۰ جولائی سنہ ۹۵ع | سردار نصراللہ خاں خلف دوئم امیر عبدالرحمان خاں کا جو حسب خواہش گورنمنٹ ملکہ وکٹوریہ آج

انگلستان کے شہروں کی سیر کرد ہے ہیں ' کل صرفہ ان کی سیاحت کا گورنمنٹ موصوفہ برداشت کررہی ہے۔ چنانچہ ملک معظم نے حکم دیا ہے کہ تمام شاہزادگان انگلستان پر سوائے شہزادہ ویلس بہادر اور ڈیوک آف کوبرگ کے ان کو سبقت دی جائے۔ یہ بہت بڑا اعزاز خلف دویم امیر کابل کا ہوا۔ اس کی تصدیق انگریزی اخبارات سے ہوئی۔

۸ اکتوبر سنہ ۹۵ء | ملک الشعرا انگلستان ملٹن کا قول ہے کہ جن دلوں میں مہلک نفرت نے گہرے زخم کردیے ہوں ان میں مصالحت نہیں ہوسکتی۔ بمعائنہ اخبار ایوننگ حیدرآباد مطبوعہ ۲۵ ستمبر سن الیہ سے واضح ہوا کہ جان ڈی راک فیلر امریکہ میں سب سے زیادہ دولتمند ہیں ان کے پاس ۱۴ کروڑ ۵ لاکھ ڈالر ہیں اور ایک ڈالر تقریباً ۲ روپیے ۵ آنہ کا ہوتا ہے۔ سال ختم ہونے کے قبل ان کی دولت ۱۵ کروڑ ہو جائےگی۔ بیان ہے کہ اس کی دولت ایک کروڑ ۵ لاکھ سالانہ کے حساب سے بڑھتی ہے۔

۶ جنوری سنہ ۹۶ء | آج کل قسطنطنیہ کی حالت نازک ہورہی ہے۔ کل سلاطین یورپ آرمینیا کی حسن انتظامی کے سلطان عبدالحمید سے خواہاں ہیں اور وہ بوجوہ لیت و لعل کررہے ہیں۔ لہذا روس' فرانس' انگلینڈ' اٹلی اور امریکہ کے جنگی جہازات آبنائے ڈارڈی نیلیز میں داخل ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سلطان کو خوف دلاکر کارروائی کریں اور قسطنطنیہ کو سلطان سے انتزاع کرکے باہم تقسیم کرلیں جس سے سلطان از بس پریشان ہیں۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ آج کل اخباروں میں بجز اس حال کے اور باتوں کا کم تر تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ پیچیدگیاں چند ماہ گزشتہ سے برابر قایم چلی آتی ہیں۔

۵ فروری سنہ ۹۶ء | چونکہ بسازش انگلستان پانچ دیگر سلطنت‌ہاے یورپ نے اپنے جنگی جہازات بحیرہ ڈارڈ نیلیز متعلقہ ٹرکی میں قایم کیے تھے کہ سلطان عبدالحمید خاں سے بزور حسن انتظام صوبۂ آرمینیا کرادیں لیکن بتدریج وہ جہاز تو واپس گئے اور یکم فروری کے تاربرقی اودھ اخبار

مطبوعہ ۵ فروری میں لارڈ سالسبری وزیر اعظم انگلستان کی اسپیچ کا یہ مضمون ہے کہ انگلستان ترکی سے آرمینیا لوگوں کی طرف سے جنگ نہیں کرسکتا اور مہلت دینا چاہیے تاکہ عمدہ انتظام عمل میں لایا جاوے۔ میں یقین نہیں کرتا کہ سلطان نے اس جور و ظلم کا حکم دیا ہے جو آرمینیا میں ہوئے گو ان کی گورنمنٹ کمزور و نالایق ہے اور کچھ نہیں کرسکتی۔ سلاطین یورپ عمدہ انتظام کے نگراں رہیں گے لیکن آگے بڑھکر کوئی کارروائی نہ کریں گے۔ یہ نتیجہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ انگلستان کو چند سخت جدید جھگڑے امریکہ و جرمن وغیرہ سے پیش ہوگئے۔ سچ یہ ہے کہ مشیت ایزدی میں ابھی قسطنطنیہ کا خاتمہ مقدر نہیں ہے ورنہ یوروپین سلطنتوں کی تو یہ خواہش ہے کہ اس کے حصہ بانٹ کرلیویں جیسا کہ اخباروں سے معلوم ہورہا ہے۔

۵ مئی سنہ ۹۶ء یکم مئی کو مرزا محمد رضا ایک مذہبی متعصب نے ناصرالدین شاہ بادشاہ فارس کے دل میں گولی ماردی جب کہ وہ ایک زیارت متصل طہران کے اندر جارہے تھے اس کے صدمے سے چار بجے شام کو شاہ نے قضا کی اور بجائے متوفی ان کے دوسرے بیٹے جو اصلی بیگم کے بطن سے تھے تیسری مئی کو مقام تبریز تخت نشیں ہوئے۔ اس خبر کی تصدیق پانیر الہ آباد مطبوعہ ۳ مئی سے ہوئی۔ عمر شاہ متوفی ۶۷ سال تھی۔ سنہ ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور بڑی مقبول بادشاہت کی۔ مزاج میں تعصب نہ تھا۔

۳۰ مئی سنہ ۹۶ء معائنہ اخبارات سے واضح ہوا کہ شہنشاہ روس کا جشن تاجپوشی ۲۶ مئی کو ختم ہوا اور شہنشاہ نے بر وقت تاجپوشی ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے تمام باقیات ٹیکس معاف کردیے اور دس برس کے لیے محصول اراضی نصف کردیا اور خفیف مجرموں کے جرایم معاف کیے اور دیگر سزاؤں میں تخفیف کردی اور پولیٹیکل جلاوطنوں کی نسبت حکم دیا کہ جہاں کہیں مناسب سمجھیں تخفیف سزا کردیں۔ مگر یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ جب لوگ کھانا کھانے اور انعام لینے چلے تو لکھوکھا آدمی کے اژدحام کے باعث

۲۷۰۰ آدمی کچل کر مرگئے جو ایسے موقع پر افسوسناک ہے۔ یہ یادگار کبھی فراموش نہیں ہوسکتی۔

۹ جولائی سنہ ۹۱ع | معائنہ اخبارات انگریزی سے معلوم ہوا کہ شاہزادہ نصراللہ خاں خلف دویم امیر عبدالرحمان خان والی کابل کی سیاحت انگلستان میں ۲۵۸۰۸ پونڈ خرچ ہوے جو چند روز ہوے تشریف لے گیے تھے۔ یہ روپیہ خزانہ ہندستان سے خرچ میں پڑے گا۔

۲۸ ستمبر سنہ ۹۶ع | دیکھنے اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ شاہنشاہ ہندستان و انگلستان ۲۴ مئی ۱۸۱۹ع کو پیدا ہوئی تھیں اور ۲۰ سنہ ۱۸۳۸ع کو بیسویں سال تاج شاہی زیب سر کیا۔ اس حساب سے ۲۰ ستمبر سنہ ۹۶ع تک جناب ممدوح نے اپنے دادا جارج سویم کے مساوی ۵۹ سال ۹۷ یوم زمانہ حکمرانی ختم کیا اور ۲۳ ستمبر سن الیہ سے آپ کو اپنے دادا کی سلطنت سے سبقت شروع ہوئی۔ اس قدر مدت تک سلطنت کسی بادشاہ انگلینڈ نے سلف سے اس وقت تک نہیں کی۔

۸ مئی سنہ ۹۷ع | جو جنگ مابین سلطان روم اور یونانیوں کے ہوتی تھی اس میں سلطان کو کامل کامیابی حاصل ہوئی اور یونانیوں کو ہزیمت حاصل ہوئی اور شہر تھیسلی پر سلطان کا قبضہ ہوگیا۔ اس فوج کے ترکی کے کمان بر اور افسر اعلیٰ ادھم پاشا تھے جن کی عموماً تعریف ہورہی ہے۔ سلطان کی اس کامیابی سے تمام یورپ حیرت میں آگیا اور جو خیالات فاسد و حقارت آمیز جنگی کارروائی ترکوں کے نسبت دول یورپ کو تھے وہ اس ظفریابی سے بالکل بدل گئے اور سمجھنے لگے کہ یہ بھی ایک معتدبہ سلطان یورپ میں ہے۔

۲۲ مئی سنہ ۹۸ع | ۱۹ مئی کو گلیڈاسٹون سابق وزیر اعظم نے بعمر ۸۹ سال قضا کی جو ۲۹ دسمبر ۱۸۰۹ کو پیدا ہوے تھے۔ یہ بہت بڑا لایق شخص تھا اور جب اسپیچ کہنے کھڑا ہوتا تھا تو ایسا خوش بیان تھا کہ گھنٹوں میں ایک بحث ختم ہوتی تھی۔ سخت متعصب شخص تھا۔ ترکوں سے اسے عداوت قلبی تھی۔

۲۶ اگست سنہ ۹۸ء | بابت جزیرہ کیوبا مابین اسپین اور امریکا اس عرصہ میں سخت سخت لڑائیاں ہوئیں ۔ اسپین کو شکست اور امریکا کو کامیابی حاصل ہوئی ۔ سلاطین یورپ نے باہم صلح کرادی اور جزیرہ کیوبا اور فلی پائن کو اسپین سے امریکہ کو دلوادیا ۔

۱۵ ستمبر سنہ ۹۸ء | آج ہمدم اودھ اخبار بحوالہ اخبار انگریزی اکسپریس معلوم ہوا کہ ممالک ذیل میں شادی لڑکوں اور لڑکیوں کی کس عمر میں ہوتی ہے :۔

نام ملک	عمر لڑکا	عمر لڑکی
اسٹریا	۱۴ سال	۱۴ سال
جرمنی	۱۸ سال	۱۸ سال
فرانس و بلجیم	۱۶ سال	۱۵ سال
اسپین	۱۴ سال	۱۲ سال
روس و سیکسنی	۱۴ سال	۱۶ سال
یونان	۱۴ سال	۱۲ سال
سوئٹزرلینڈ	۱۴ سال	۱۲ سال

قسطنطنیہ میں شادیاں اس وقت ہی ہوجاتی ہیں جب لڑکے لڑکیاں چل پھر سکتے ہیں اور ضروری مذہبی احکام تمام کو سمجھ سکتے ہیں ۔

۲۴ اکتوبر سنہ ۹۹ء | آج کل مابین ڈچ کاشتکاران ٹرانسوال واقعہ افریقہ و انگریزوں کے جنگ ہورہی ہے اور بمقام کانکو بہت بڑی جنگ ہوئی جس میں ۲۲ افسر انگریزوں کے مع جنرل سمنز قتل ہوئے ۔

۲۰ دسمبر سنہ ۹۹ء | دیکھنے اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ جو لڑائی افریقہ میں مابین ڈچ کاشتکاران ٹرانسوال اور انگریزوں کے ہورہی ہے وہ بہت سخت مقابلہ ہے ۔ ہر لڑائی میں بہت سی فوج انگریزوں کی مقتول و مجروح ہوئی ہے ۔ ڈچ ایسے نشانہ باز ہیں کہ افسروں کو چن چن کر مارتے ہیں اور سامان حرب

بمقابلہ انگریزوں کے ان کا نہایت عمدہ ہے۔ پانچ ہزار گز کے فاصلہ پر ان کی توپوں کے گولے بہت عمدہ کام دیتے ہیں اور انگریزوں کی توپیں دو ہزار گز کے فاصلے کی ہیں۔ جناب ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کو اپنی فوج کے ضایع ہونے کا سخت ملال ہے حتٰی کہ ان کا قصد تھا کہ بعد بڑے دن کے لندن کے دوسرے مقامات کو جاویں لیکن وفور رنج و غم سے انھوں نے فسخ عزیمت کی۔

۲۸ جنوری سنہ ۱۹۰۰ع | ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۹۹ع میں جنگ ٹرانسوال واقعہ افریقہ مابین بویر و برٹش گورنمنٹ کے شروع ہے۔ سرکار کے بہت سے افسر و فوجی لوگ ضایع ہوئے۔ لارڈ ڈفرن کے خلف اکبر اور لارڈ رابنسن کے اکلوتے بیٹے اور لفٹنٹ گورنر برھما کے صاحبزادے اور بڑے بڑے باقی افسر قتل ہوئے۔

۳۱ مئی سنہ ۱۹۰۰ع | بمعاینہ اودھ اخبار واضح ہوا کہ ۵۷ لاکھ تیس ہزار آدمی رفع تکالیف کام قحط میں آج کل متعلق ہیں۔ ۳۰ مئی سے دارالخلافت فاتین جنوبی افریقہ کیپ‌ٹون میں شامل کیا گیا اور اس کی آرنج فری اسٹیٹ کا نام آئندہ آرنج اورکالونی ہوگا کیوں‌کہ اب وہ مستقل طور پر انگریزوں کے قبضہ میں آگیا ہے۔ اب جہاں تک اخبارات دیکھے جاتے ہیں انگریزوں کی برابر فتح معلوم ہوتی جاتی ہے اور بور لوگ پس پا ہورہے ہیں۔ وہ جوھانس‌برگ میں پہنچ گئے ہیں۔

۵ اگست سنہ ۱۹۰۰ع | آج کل ملک چین پر پانچ سلطنتیں چڑھائی کر رہی ہیں جن کی فوجیں برابر بذریعہ جہازات اپنی اپنی دارالسلطنتوں سے بھیجی جارہی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ جرمن، فرانس، روس، اٹلی، جاپان اور چھٹا برٹش گورنمنٹ۔ سبب اس لڑائی کا اخباروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم بکسر باشندگان چین کی پیشوا ہے۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ غیر ملک کے لوگ چینیوں کو عیسائی کیے ڈالتے ہیں تو انھوں نے غدر کردیا اور جس‌قدر عیسائی لوگ بہم پہنچے ان کو قتل کرڈالا۔ چونکہ ان کی جماعت کثیر ہے اور اہل چین بھی ان کو اپنا پیشوا مانتے ہیں اسی وجہ سے وہ لوگ بھی بکسروں کی شریک ہوگئی اور چینی فوج بھی ان

معاون ہے اس وجہ سے اس کی بہت بڑی جمعیت ہوگئی ہے - اور ان سلطنتوں سے مقابلہ کے لیے وہ تیار ہیں - دیکھنا چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے - بظاہر سخت کشت و خون ہوتا ہوا نظر آرہا ہے اور عجب نہیں بعد ظفر پانے سلطنت ملک چین کو باہم تقسیم کرلیں - یہ سلطنت بہت پرانی ہے اور کسی نے اس وقت تک اس پر دست‌درازی نہیں کی تھی لیکن اس انجام بخیر نظر نہیں آتا -

۲۳ جنوری سنہ ۱۹۰۱ع | آج کے اردو اخبار میں یہ خبر غمگین مندرج دیکھی گئی کہ جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصرہ ہند نے اس جہان فانی سے بمقام لندن رحلت کی - وقت ۶ بجے ۳۰ منٹ شام کا تھا اور تاریخ ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۰۱ع - کوئی شک نہیں کہ قیصرہ ہند نہایت ہی خوش اقبال تھیں اور جس تاریخ سے وہ تخت سلطنت انگلستان پر بیٹھیں برابر فتوحات بے پایاں حاصل ہوتے رہیں اور اولاد کی جانب سے بھی وہ نہایت خوش نصیب تھیں کہ جن کے نواسے قیصر ولیم شہنشاہ جرمن ہیں - اس وقت ملکہ معظمہ کے قبضہ میں کل دنیا کا ایک چہارم حصہ ہے اور کبھی آفتاب ان کی عملداری میں غروب نہیں ہوتا - اب ذیل میں ان کی مختصر سوانح‌عمری حوالہ قلم کرتا ہوں جس سے ان کی عمر و تخت نشینی کا حال مفصل معلوم ہوگا:-

جناب ملکہ معظمہ قیصر ہند ۲۴ جنوری سنہ ۱۸۱۹ع کو پیدا ہوئی تھیں - ۲۰ جون سنہ ۱۸۲۷ع کو تخت نشین ہوئیں اور ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۰۱ع کو رحلت کی - اس وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی دو مرتبہ مرحومہ کی پنجاہ سالہ و شصت سالہ جوبلی ہوئی اور ایسی خوش اقبال تھیں کہ ایک چہارم دنیا اس وقت ان کے قبضہ میں تھی -

۲۹ جولائی سنہ ۱۹۰۱ع | جنگ ٹرانسوال واقعہ جنوبی افریقہ ہنوز ختم نہیں ہوئی ہے - بوبر اور انگریزوں سے برابر لڑائی جاری ہے - بالفعل انگریزی فوج بہ تعداد دو لاکھ ترپن ہزار جنگ‌گاہ میں موجود ہیں - یہ لڑائی ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۹۹ع کو شروع ہوئی تھی - انگریزی فوج کے سر سالار حال لارڈ کچنر ہیں -

۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۰۱ء	مسٹرمکینلے پریسیڈنٹ امریکہ کو تاریخ ۱۴ ستمبرسنہ ۱۹۰۱ء جب کہ وہ بفلو نمائش‌گاہ کی سیر کررہے تھے، سنی‌زول‌بورڈ نے

دو گولیاں ماریں جس سے انھوں نے انتقال کیا اور روزولٹ ان کی جگہ پر پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔

۹ اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء	امیر عبدالرحمان خاں امیر کابل نے ۳ اکتوبر سنہ الیہ کو انتقال کیا اور بجائے ان کے حبیب‌اللہ خاں تخت کابل

پر جانشین ہوئے اور انھیں کی بابت خان مرحوم جانشینی تجویز کرتے تھے۔ حبیب‌اللہ خاں خلف اکبر ہوش‌مند آدمی معلوم ہوتے ہیں جن کی جانشینی گورنمنٹ آف انڈیا نے بھی منظور کی۔ عبدالرحمان مرحوم نہایت لایق و دانشمند شخص تھے جنھوں نے افاغنہ پر بہت رعب داب کے ساتھ سلطنت کی جن کو انگریزی گورنمنٹ بھی مانتی تھی اور دو لاکھ روپیہ ماہوار ان کو گزارہ دیتی تھی اس غرض سے کہ روسی گورنمنٹ سے کہیں وہ مل نہ جائیں جو عرصہ سے براہ کابل ہندستان کا قصد رکھتے ہیں۔ امیر صاحب نے اپنی فوج بھی قواعدداں تیار کی تھی۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۰۱ء	جنگ ٹرانس‌وال جنوبی افریقہ اب تک مابین برٹش‌گورنمنٹ اور بوروں کے قائم ہے جس کا آغاز ۱۱ اکتوبر سنہ ۹۹ء

کو ہوا تھا۔ اگرچہ بوير بوجہ کمی فوج کے برابر دو تین روز تک جنگ نہیں کرسکتے ہیں تاہم سرکار کی ایک بڑی فوج سے جس کی تعداد دو لاکھ تربن ہزار ہے، برابر مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔

۲۹ مارچ سنہ ۱۹۰۲ء	جنوبی افریقہ میں ٹرانسوال کے بویرز نے جو برٹش گورنمنٹ سے ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۹۹ء کو لڑائی شروع

کی تھی وہ ابھی تک بدستور جاری ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ لوگ نہایت جری ہیں۔ باوجودیکہ ان کی فوج بہت ہی قلیل ہے اور انگریزوں کی ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہے لیکن وہ برابر مقابلہ کر رہے ہیں اور اکثر مقاموں پر انگریزوں کو فاش زک دی۔ اگرچہ ایک روز یہ شدنی ہے کہ وہ مغلوب ہوکر اطاعت قبول کرلیں گے مگر ابھی تک ان کے دم خم وہی ہیں۔

۷ جون سنہ ۱۹۰۲ع

آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ جنگ جنوبی افریقہ میں جو بوئیر لوگوں کے ساتھ سرکار انگریزی سے ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۹۹ع کو شروع ہوئی تھی اور ۳۱ مئی سنہ ۱۹۰۲ع کو بذریعہ صلح ختم ہوئی اس میں سرکار انگریزی کا ۱۶۰ ملین پونڈ جو مساوی چوبیس سو ملین روپیہ کے ہے، صرف ہوا۔ اس صرف میں معمولی فوجی صرفہ جو تاوان بہت زیادہ ہوگیا ہے داخل نہیں ہے اور نہ وہ روپیہ شامل ہے جو گورنمنٹ کو اختتام جنگ کے بعد صرف کرنا ہوگا جس کی تعداد دس ملین پونڈ ہوگی۔ شرایط صلح میں جو مابین ڈچ کاشتکاروں اور گورنمنٹ انگریزی ہوئی ہے اس کی شرط پنجم یہ بھی ہے کہ ڈچ کاشتکار اپنی حفاظت جان و مال کے خیال سے اپنی رائفل و بندوقیں اپنے پاس رکھیں گے اور چھٹی شرط یہ ہے کہ مصارف جنگ کے متعلق جنوبی افریقہ کے ٹرانسوال والوں سے کچھ نہیں لیا جائیگا۔

جشن تاجپوشی شاہنشاہ انگلینڈ و ہندستان میں جو ۲۶ جون سنہ ۱۹۰۲ع کو بمقام لندن ہوگا اس میں بہت سے ہندستانی والیان ملک جیسے مہاراجا گوالیار، مہاراجا جیپور، مہاراجا اندور، مہاراجا گنگا سنگھ بیکانیر اور بہت سے رؤسا اعظم ہندستان سے جا رہے ہیں مگر مہاراجہ جیپور نے یہ قبل یادگار بات کی کہ اپنے دھرم و کرم کو قائم رکھنے کے لیے اپنے دیوتا بھی ولایت کو ساتھ لے گئے ہیں حتٰی کہ ہاتھ پاک کرنے کی مٹی بھی جہاز پر رکھ لی گئی ہے۔ بمقابلہ اور والیان ملک کے مہاراجا نے نہایت پابندی مذہب کے ساتھ لندن کا سفر اختیار کیا۔ اودھ سے راجا پرتاب بہادر سنگھ پرتاب گڑھ بھی گئے ہیں۔ غرض کہ احاطہ کلکتہ، بمبئی، مدراس اور لاہور وغیرہ سے خاص خاص رؤسا شرکت جشن تاجپوشی کے لیے جا رہے ہیں اور بہت بڑا صرف اپنے اوپر گوارا کیا ہے۔ دیکھا چاہیے کہ بتقریب تاجپوشی ان کے واسطے کیا سلوک ہوتا ہے۔

۱۶ جولائی سنہ ۱۹۰۲ع

۱۳ جولائی سنہ ۱۹۰۲ع کو لارڈ سالسبری وزیراعظم انگلستان نے اپنی ملازمت سے استعفا دے دیا جس کو

شاہنشاہ انگلینڈ و ہندستان نے منظور فرمایا۔ بجائے ان کے مسٹر بالفور وزیراعظم مقرر ہوئے۔

۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۰۲ع | آج کے اودھ اخبار میں درج ہے کہ ایک عورت متصل شہر نیپلز علاقہ ملک اٹلی میں رہتی تھی۔ اس کی شادی کو ۱۹ سال ہوئے ہیں۔ اس مدت میں اس کے ۶۲ بچے پیدا ہوئے۔ ۵۹ لڑکے اور تین لڑکیاں نو برس کے عرصہ میں گیارہ توام لڑکے پیدا ہوئے اور پانچ مرتبہ چار چار اور تین مرتبہ تین تین اور ایک مرتبہ چار بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی اور کچھ زمانے میں صرف ایک ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اب اس کی عمر ۵۷ برس کی ہے اور ضعیف و ناتواں ہوگئی ہے۔ کچھ کام اس سے نہیں ہوتا لہذا اٹلی کے بادشاہ کو ایک عرضداشت بھیجی گئی ہے کہ اس کا کچھ گزارہ مقرر کر دیویں۔

۱۹ جون سنہ ۱۹۰۳ع | ۱۲ جون سنہ ۱۹۰۳ع کے تار برقی میں درج ہے کہ الیگزنڈر شاہ سرویہ مع ملکہ ڈریگا کے اپنے ایوان میں قتل کر دیے گئے اور ان کے ساتھ میں وزیراعظم سرویہ اور جنرل فوج بھی مقتول ہوئے۔ خود ان کی فوج نے انھیں قتل کیا۔ وجہ قتل یہ معلوم ہوئی کہ کل رعایا شاہ سے ناراض تھی۔ ۱۴ اگست سنہ ۱۸۷۹ع کو شاہ سرویہ پیدا ہوئے۔ ۱۳ اپریل سنہ ۹۳ع کو تخت نشین ہوئے تھے اور ۲۱ جولائی سنہ ۱۹۰۰ع کو شاہ سرویہ نے اپنی نسبت میڈم ڈریگا سے کی اور ۵ اگست سنہ ۱۹۰۰ع کو شادی ہوگئی۔ ڈریگا بادشاہ کی والدہ کی پیش خدمت تھی جس کی عمر اس وقت ۳۰ سال کی تھی یعنی بادشاہ سے عمر میں بڑی تھی۔ اس کا شوہر مرچکا تھا مگر بوجہ حسین ہونے کے بادشاہ نے اس کے ساتھ عقد کرلیا۔

۲۶ اگست سنہ ۱۹۰۳ع | ۲۲ اگست سنہ الیہ کو لارڈ سالسبری سابق وزیر اعظم انگلستان نے بمقام لندن قضا کی۔

سرحد بلغاریا پر پہلی بغاوت ہوئی لہذا فوج سلطان ٹرکی واسطے تادیب کے بھیجی گئی اور سلونیکا کے قریب کل جماعت باغیوں کی گولہ اندازی افواج ٹرکی سے مقتول ہوئی۔

۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۰۲ء ممالک مقدونیا و بلگیریا و سلونیکا کی بغاوت سے آج کل بڑی بدنظمی سلطان ترکی کی عملداری میں ہے اور افواج ترکی باغیوں کو گوشمالی واجب دے رہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کا کشت و خون ہو رہا ہے۔ سلاطین یورپ سلطان کو اِک دھمکی دے رہے ہیں کہ بدنظمی جلد دور کی جائے۔

۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۰۳ء انگلستان میں جو طوفان ابر و باد کا آیا تھا اس سے ۶۳ جہاز تباہ ہوگئے اور ان میں کا کوئی آدمی نہیں بچا۔ آج کل یورپ میں تمام سلاطین میں انواع اقسام کے نزاعات پیدا ہیں اور عموماً سلطان ترکی کو کل سلاطین دبا رہے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ وہ بتیس دانتوں میں ایک زبان ہے

۱۴ فروری سنہ ۱۹۰۴ء ۱۲ فروری سنہ الیہ کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۹ فروری سنہ ۱۹۰۴ء کو بوقت ۱۰ بجے دن مابین جاپان و روس لڑائی شروع ہوگئی اور جاپانی تارپیدو کشتیوں نے بمقام پورٹ آرتھر روسی جہازوں پر حملہ کیا۔ یہ لڑائی دو بڑی زبردست سلطنتوں میں شروع ہوئی ہے دیکھا چاہیے کیا انجام ہوتا ہے۔

۱۴ مارچ سنہ ۱۹۰۴ء دنیا بھر میں سب سے سن دراز و معمر شخص شہر ماسکو (روس) کا ذاردوستے ہے۔ اس کی عمر ۱۳۶ برس کی ہے اور اس کی بصارت علی‌حال بھی قائم ہے۔ اس کا باپ ۱۲۰ برس کا ہوکر فوت ہوا تھا۔

۳۰ اپریل سنہ ۱۹۰۴ء آج کے اخبار میں میں نے پڑھا کہ جاپان کے مرد و عورت دونوں اپنی بہبودی ملک کے عاشق ہیں جس کی تصدیق مضامین ذیل سے ہوتی ہے۔ ایک سپاہی لڑائی پر جاتا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست سے جو اسے پہنچانے آیا تھا بیان کیا کہ مجھے ایک دن مرنا ہے پس بہتر ہے کہ ہم اپنے ملک کے لیے مریں۔ اگر میں بستر مرگ پر مروں‌گا تو کیا خاک میری ماں کو تسلی ہوگی۔ ایک عورت نے اپنے بیٹے سے جب وہ لڑائی پر جاتا تھا کہا کہ تم لڑائی پر

جاتے ہو، پھر گھر کو واپس نہ آنا۔ اگر تم واپس ہوئے تو میں معاف نہ کروں گی۔ قصبہ تکاس کی ایک عورت کو جب معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا اس بنا پر جنگی خدمت سے معاف کردیا گیا کہ وہ اکیلا اپنی ماں کا پرورش کرنے والا تھا تو اس نے فوراً خودکشی کرلی اور اس نے ایک خط میں بیان کیا کہ میں نے اس وجہ سے خودکشی کی کہ میرا بیٹا اپنے ملک کے لیے روسیوں سے آزادی کے ساتھ لڑسکے۔ دم توڑنے کے وقت اس نے وہ خنجر جس سے خودکشی کی تھی اپنے بیٹے کو دے دیا کہ وہ اس کو دشمن کے خلاف کام میں لائے۔ لڑکے نے خنجر کو کمر سے باندھ لیا اور فوراً جنگ میں شریک ہونے کی درخواست پیش کردی۔ واہ رے ملکی ہمدردی! جب کہ ایسی ہم قومی و ملک کی ہمدردی ہو تو کیوں نہ اس ملک کے بادشاہ کو پوری کامیابی حاصل ہو سکے۔

یکم جون سنہ ۱۹۰۴ع مابین جاپان و روسیوں کے ہنوز جنگ جاری ہے۔ دو مقاموں پر سخت لڑائیاں ہوئیں۔ ایک دریا بالوبر پر ۶ مئی کو دوسری نان‌شان پر ۱۵ مئی کو اور ان دونوں جنگوں میں جاپانیوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ و نیز پورٹ آرتھر میں۔ نان‌شان کی جنگ میں جاپانیوں کو ۳۷ توپیں کلدار باقی میدانی اور بندوقیں و گولے بارود حاصل ہوئی ارو بہت سے روسی گرفتار ہوئے۔

۲۱ جون سنہ ۱۹۰۴ع فرانس کے ایک پروفیسر کے پاس کل روے زمین کی اقوام کے آدمیوں کے سر موجود ہیں۔ ان کی تعداد ۹۲۰ ہے۔ اس سے صاف ہویدا ہے کہ تمام دنیا میں ۹۲۰ قومیں آباد ہیں۔

یکم جولائی سنہ ۱۹۰۴ع اب تک جس قدر لڑائیاں مابین جاپان و روس ہوئیں ان سب میں جاپانی فتح یاب ہوئے اور ۲۸ جون کی جنگ میں انھوں نے کئی مقامات منچوریا کے روسیوں کے مقابلہ میں فتح کرلیے۔

۶ ستمبر سنہ ۱۹۰۴ع آج کل خوب گھمسان لڑائی مابین جاپان اور روسیوں کے بمقام لیونگ متعلقہ منچوریا (چین) ہو رہی ہے۔

ڈھائی ڈھائی لاکھ فوج و تیرہ سو توپیں دونوں جانب ہیں اور ہزاروں آدمی دونوں طرف مقتول و مجروح ہو رہے ہیں۔ ۲۴ و ۲۸ اگست سن الیہ کے مابین سخت لڑائیاں ہوئیں اور تیسری ستمبر سن الیہ بوقت ۹ بجے صبح کے جاپانیوں نے روسیوں سے لیوتنگ چھین لیا اور اپنا قبضہ و دخل کیا۔ جنرل کروپٹن روسیوں کی طرف سے افسر اعلیٰ ہیں اور جنرل کروکیے اور جنرل اوکو جاپانیوں کی جانب سے۔

۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۰۴ع اصطباغ ولیعہد روس۔ اودھ اخبار محررہ امروزہ سے واضح ہوا کہ شہنشاہ روس نے بعد اصطباغ اپنے بیٹے شہنشاہ زادہ کی پیدائش کی یادگار میں اپنے دست مبارک کا لکھا ہوا حکم مشعر بدیں خلاصہ نافذ کیا۔ ۱۔ فوج بحری و بری کو جو مکرر ارتکاب جرم پر سزائے جسمانی دی جاتی تھی وہ نہ دی جاوے گی۔ ۲۔ بقایا مالگزاری، ٹکس و محصول معاف کیا گیا۔ ۳۔ پیداوار زمانہ قحط کی تقاوی کاشتکاروں کو معاف ہوئی۔ ۴۔ بہت سے جرمانے معاف ہوئے۔ ۵۔ قیدیوں کی سزا میں جو پولیٹیکل قیدی اپنے زمانہ قید میں نیک کردار رہے ان کی سزا ختم ہونے پر انہیں سول اختیارات دیے جائیں۔ ۶۔ جن لوگوں نے قبل پندرہ سال پولیٹیکل جرائم کیے ہیں اور ان کا پتہ نہیں ہے اب ان پر جرم عاید نہ ہوگا۔ ۷۔ جو پولیٹیکل مجرم روس سے بیرونجات کو بھاگ گئے ہیں اگر وہ پھر اعادہ چاہیں تو وزیر داخلہ سے درخواست کریں۔ ۸۔ فن لینڈ کی باقیات مالگزاری و ٹکس بابت سنہ ۱۹۰۴ع جو شہنشاہ زادہ کی پیدائش تک ادا نہیں کیے گئے وہ سب معاف کیے گئے اور وہاں کے کاشتکاروں کو جو نقد روپیہ یا غلہ دیا گیا ہے اس میں سے ایک چوتھائی معاف ہوگا۔ ۹۔ موضعوں اور قصبوں پر اپنی طرف سے لوگ منتخب نہ کرنے کی علت میں جو جرمانہ کیا گیا تھا وہ بھی معاف کردیا گیا۔ ۱۰۔ جو لوگ بغیر منظوری فن لینڈ سے چلے گئے تھے ان کو ایک سال کے اندر واپس آنے کی اجازت دی گئی۔ ۱۱۔ ان میں سے جو لوگ ملازم فوج تھے وہ فوراً واپس آکر حکام فوجی کو رپورٹ کریں ان کو سزا نہ دی جائے گی۔ ۱۲۔ فوجی کاموں سے گریز کرنے کے جرم میں خاندان یہود پر جو جرمانہ ہوا تھا وہ بھی معاف کیا گیا۔

۲۱ ستمبر سنہ ۱۹۰۴ع	برٹش گورنمنٹ اور تبت کے مابین حسب ذیل عہد نامہ ہوا ۔ ۱۔ تبت پابند ہوگا کہ مقامات بٹنگ، گیانسٹی اور

کٹوک میں بازار قایم کرے ۔ ۲۔ تبت نصف ملین اسٹرلنگ تاوان جنگ ادا کرے ۔ اس کی سالانہ تین اقساط ہوں گی ۔ ۳۔ برٹش فوج وادی چمبی پر اس وقت تک رہے گی جب تک کہ تاوان جنگ ادا نہ ہو۔ ۴۔ برٹش گورنمنٹ کی رضامندی کے بغیر کوئی غیر سلطنت تبت کے کسی علاقہ پر قبضہ نہ کرے گی نہ کسی سلطنت کو اس کا پٹہ دیا جائےگا ۔ ۵۔ کوئی غیر سلطنت معاملات تبت میں دست اندازی نہ کرےگی نہ کوئی سڑک یا ریلوے یا تار برقی قائم کرے گی اور نہ کوئی کان کھدوائے گی ۔

۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ع	پیراھیم نے سنہ ۱۵۴۰ع میں گھڑی ایجاد کی تھی جس کی یادگار مقام ٹورم برگ میں قائم ہونے والی ہے۔

۲۵ دسمبر سنہ ۱۹۰۴ع	سردار عنایت‌اللہ خاں خلف اکبر امیر حبیب‌اللہ خاں والی کابل براہ لاہور الہ‌آباد روانہ کلکتہ ہوئے جہاں لارڈ کرزن

صاحب وایسرائے ہند سے ۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۰۴ع کو ملاقات کریں‌گے ۔ سردار صاحب کی عمر ۱۶ سال ہے اور پانچ سو افغان ان کے ہمراہ ہیں اور کل خرچہ ان کی آمد و شد کا گورنمنٹ ہند برداشت کرے گی ۔

یکم جنوری سنہ ۱۹۰۵ع	راتشچائلڈ انگلستان میں ایک مشہور مہاجن ہے۔ اس کے تمول کو بعض سلطنتیں بھی نہیں پہنچ سکتیں ۔ اس کی

منٹوں کی آمدنی لاکھوں شمار کی گئی ہے ۔ جو نصائح اس نے اپنے خاندان کو کیے ہیں وہ غور کے قابل ہیں (۱) اپنے کاروبار کے ہر جزو پر نہایت احتیاط کے ساتھ غور کرو (۲) ہر کام کو بمستعدی انجام دو (۳) ہر ایک معاملہ کا بعد غور کامل فیصلہ ناطق کرو (۴) اس قسم کی کوششیں کرتے رہو جو باعث ترقی ہوں (۵) جو مصائب و تکالیف پیش آویں ان کو صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرو (۶) تا قیام زندگی ہر ایک کام میں کوشش و سعی بلیغ کرتے رہو (۷) راست بازی کو مقدم سمجھو (۸) کاروباری معاملہ میں ہرگز جھوٹ نہ بولو (۹) لوگوں سے فضول ملاقات نہ کرو

(۱۰) اپنا فرض بمستعدی ادا کرو (۱۱) اپنے اوقات عمدہ کاموں میں صرف کرو (۱۲) جو امور اتفاقی پیش آئیں ان کا زیادہ مت خیال کرو (۱۳) اپنے متعلقہ کاموں کو نہایت محنت و مستعدی کے ساتھ انجام دو۔

۱۸ فروری سنہ ۱۹۰۵ع جاپانی روس کو منچوریا میں برابر شکست پر شکست دے رہے ہیں۔ پورٹ آرتھر اس سے چھین لیا اور مکڈن میں بھی شکستیں دے رہا ہے۔ ادھر سینٹ پیٹرس برگ دارالخلافت روس و وارسا و طفلس وغیرہ میں لاکھوں آدمی بلوہ کر رہے ہیں۔ حضرت شہنشاہ روس محل میں چھپے ہیں۔ فوجیں بلوائیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں جس کی وجہ سے زاید فوجیں واسطے مقابلہ جاپان کے منچوریا نہیں جاسکتی ہیں۔ ۸ فروری سنہ ۱۹۰۴ع کو جنگ شروع ہوئی تھی اور ہنوز برابر قائم ہے۔ جنرل اسٹوسل پورٹ آرتھر سے اس شرط کے ساتھ رہا ہوئے کہ وہ آئندہ کسی جنگ میں جاپانیوں کے مقابلہ میں نہ آویں گے اور جنرل کروپٹکن موکڈن میں شکستیں کھا رہے ہیں جو گورنمنٹ روس سے وعدہ کرکے آئے تھے کہ جاپانیوں کو سمندر میں ڈبو دوں گا۔

۱۶ مارچ سنہ ۱۹۰۵ع جاپانیوں نے موکڈن واقع منچوریا کو روسیوں سے چھین لیا۔ اس لڑائی میں دو لاکھ روسی فوج قتل ہوئی اور چالیس ہزار مقید اور پانچ سو توپیں علاوہ بہت سے سامان رسد وغیرہ کے جاپانیوں کے ہاتھ آئیں۔ جنرل کروپٹکن جو جاپانیوں کو شکست دینے کے واسطے روس سے آئے تھے انھوں نے شہنشاہ روس کو درخواست دی ہے کہ ان کی جگہ پر کوئی دوسرا جنرل بھیجا جاوے، اب ان کے آرام کرنے کے دن ہیں۔

۴ اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ع آلپین بنانے کا سب سے بڑا کارخانہ برمنگھم واقع انگلستان میں ہے جہاں ہر روز تعطیل وغیرہ کا زمانہ چھوڑ کر ۳ کروڑ ۷۰ لاکھ آلپینیں تیار کی جاتی ہیں۔ نیوزیلینڈ کے جنوب میں جزائر کا ایک مجمع جو سات بہنیں کہلاتا ہے اس میں ہمیشہ بارش ہوا کرتی ہے۔

سمندر کا پانی نہایت ہی مقوی جگر، معدہ و گردہ ہوتا ہے۔

۱۸ دسمبر سنہ ۱۹۰۷ء

روسی سلطنت کے ہر صوبہ میں غدر و فساد تو ہو ہی رہا تھا اب فوج بحری و بری نے بھی بغاوت شروع کردی ہے۔ چنانچہ اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ روسی فوج ہاربن نے بھی غدر کردیا اور شہر مذکور کو لوٹ و جلا کر خاکستر کردیا۔ یہ بد اقبالی نکولس دویم شہنشاہ روس کی ہے۔

۵ جون سنہ ۱۹۰۶ء

۳۱ مئی سنہ ۱۹۰۶ء کو شاہ الفانسو اسپین کی شاہزادی اپنا انگلستان سے شادی ہوئی۔ جب جلوس گرجا گھر سے ایوان خاص کو چلا تو کسی بدمعاش نے ایک گولہ چمکدار فولاد کا پھینکا جو شاہ کے گھوڑوں کے نیچے گر کر پھٹا۔ گاڑی شاہی کے پہیوں کو سخت نقصان پہنچا۔ گھوڑے ہلاک ہوگئے۔ تین افسر و سات سپاہی اور پانچ تماشائی ہلاک ہوئے اور ایک سو آدمی سخت مجروح ہوئے۔ تحقیقات ہو رہی ہے۔ شاہ اور ان کی بیگم محفوظ رہیں۔

۶ نومبر سنہ ۱۹۰۶ء

اسپین میں شہد کی مکھیوں کے چھتے سولہ لاکھ نوے ہزار ہیں۔ ان میں سے ۱۹ ہزار ٹن شہد نکلتا ہے اور مقام سویل واقع جرمنی میں ۲۰ لاکھ چھتے شہد کی مکھیوں کے ہیں اور ۲۰ ہزار ٹن ان میں سے شہد نکلتا ہے (از اودھ اخبار مورخہ امروزہ)۔

۶ جنوری سنہ ۱۹۰۷ء

امیر حبیب‌اللہ خاں والی کابل بعزم سیاحت ہندستانی ۲ جنوری سنہ ۱۹۰۷ ع کو لنڈی کوتل سرحد ہندستان میں داخل ہوئے۔ ان کے ہمراہ گیارہ سو آدمی سوار و پیدل ہیں۔ امیر کی بہت خاطر و مدارات ہو رہی ہے اور جب وہ ۳ جنوری سن الیہ کو داخل پشاور ہوئے تو ان کے قدموں کے پاس اکیس ہزار کی گیارہ تھیلیاں منجانب گورنمنٹ بطور نذرانہ رکھی گئیں۔ امیر نے قبول کیا۔

۱۱ جنوری سنہ ۱۹۰۷ء

۸ جنوری سنہ ۱۹۰۷ء کو وقت ۱۱ بجے رات کو مظفرالدین شاہ بادشاہ ایران نے قضا کی۔

۱۳ جنوری سنہ ۱۹۰۷ء

امیر حبیب‌اللہ خاں صاحب والی کابل اب بادشاہ قرار دیے گئے ہیں اور ہمارے شاہنشاہ ایڈورڈ نے ان کو خطاب ہز مجسٹی کا عطا کیا ہے جس کے معنی بادشاہ کے ہیں اور اسی مضمون کا

انھوں نے تار بھی بمقام لندن کونسل دیا تھا جس میں لقب ہز مجسٹی درج تھا۔ امیر کابل قبل تشریف آوری آگرہ کے اول ۸ جنوری کو بمقام سرہند علاقہ پٹیالہ کو اس غرض سے تشریف لے گئے کہ حضرت امام ربانی یعنی مجدد الف ثانی کے مزار پر فاتحہ پڑھیں جو بمقام سرہند سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک کابلی بزرگ ہیں جو شاہنشاہ اکبر کے عہد سلطنت میں ہندستان تشریف لائے تھے۔ اولاً ان کی شاہنشاہ نے بہت قدر و منزلت کی لیکن وہ مذہب شاہ پر معترض ہوئے تو ان کی وقعت فی الجملہ گھٹ گئی۔ بعد انتقال شاہنشاہ اکبر جب جہانگیر شاہ کا زمانہ آیا تو اراکین سلطنت کی شکایتوں پر پیر صاحب قلعہ گوالیار میں چند سال کے واسطے قید کردیے گئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب سلطنت میں کچھ بیقراری پیدا ہوگئی تو جہانگیر نے نہایت اعزاز کے ساتھ حضرت کو قید سے رہائی دے کر اپنے پاس بلالیا اور خود بھی مرید ہوئے اور تقریباً تیرہ ہزار آدمی اراکین سلطنت وغیرہ سے جو مخالف تھے وہ سب کے سب پیر صاحب کے مرید ہوگئے اور ہر ایک حکم ان کا بطیب خاطر بجا لایا گیا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اسی زمانے میں پیشین گوئی کی تھی کہ آئندہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب کہ درانی قوم کے افغان تخت کابل پر مسلط ہوں گے۔ چونکہ امیر حبیب اللہ خاں درانی نسل سے ہیں لہذا جب وہ ہندستان کو تشریف لائے تو انھوں نے حضرت صاحب کے مزار پر جاکر نہایت عقیدت کے ساتھ فاتحہ خوانی فرمائی۔

۱۰ جنوری سنہ ۱۹۰۷ء اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں امیر کابل جو ہندستان تشریف لائے ہیں منجانب برٹش گورنمنٹ ان کی بہت بڑی خاطرداری اور اعزاز ہو رہا ہے جیسا کہ گورنمنٹ نے کسی اور ان کے ماسبق کا نہیں کیا۔ بمقام آگرہ لفٹنٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ و لارڈ منٹو گورنر جنرل وائسرائے ہند نے بڑی بڑی دعوتیں کیں جس سے امیر بہت خوش ہوئے اور ایک موٹرکار گاڑی قیمتی تیس ہزار ان کی نذر کی گئی اور لارڈ منٹو نے امیر کو ہاتھ کا معزز تمغہ پہنایا۔

۱۹ جنوری سنہ ۱۹۰۷ء امیر حبیب اللہ خاں کا یادگار حکم :۔چونکہ نماز عیدالضحیٰ امیر صاحب دہلی کی جامع مسجد میں پڑھیں گے لہذا دہلی

کے مسلمانوں نے چاہا کہ ایک سو گائیں قربانی کریں۔ جب امیر صاحب کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انھوں نے حکم دیا کہ ہم ہندستان کو بنا بر سیر و تفریح آئے ہیں نہ کہ کسی فریق کے دل دکھانے کو۔ ہم یہ نئی بات جس پر اہل اسلام و ہنود کے اکثر جھگڑے ہوتے ہیں ناپسند کرتے ہیں اور بجائے اس کے اگر مسلمان بکرے ذبح کریں گے تو باعث ہماری خوشی کا ہوگا۔ چنانچہ اب یہ ہی ہونے والا ہے۔ اہل ہنود اس بات سے بہت خوش ہوئے اور جابجا کومیٹیاں کرکے اظہار خوشی کے تار امیر صاحب کی خدمت میں بھیج رہے ہیں۔

۲۲ جنوری سنہ ۱۹۰۷ع | ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۰۷ع کو امیر حبیب اللہ خاں امیر کابل علیگڑھ میں تشریف لائے اور کالج علیگڑھ کو غور و خوض کے ساتھ دیکھ کر نسبت تعلیم مذہبی کے واقفیت حاصل کی اور خوش ہوئے اور مبلغ بیس ہزار روپے بنا بر اعانت کالج مرحمت فرمائے اور چھے ہزار روپیہ سالانہ امداد دینے کا وعدہ کیا۔

۲۰ فروری سنہ ۱۹۰۸ع | شاہ مظفرالدین متوفی ایران کی بجائے محمد علی مرزا تخت نشین ہوئے۔

۱۹ مارچ سنہ ۱۹۰۷ع | امیر حبیب اللہ خاں امیر کابل کے ہندستان میں تشریف لانے سے افغانستان کے متعصب فرقے بہت ناراض ہو رہے ہیں اور جن خاص امور پر اعتراض ہے وہ یہ ہیں کہ امیر نے انگریزی افسروں کے ساتھ کھانا کھایا۔ ان سے بہت اظہار دوستی کا کیا۔ یوروپین لباس اختیار کیا اور بہت سی انگریزی چیزیں مول لیں۔ ایک بل کا تمام سامان خرید کیا۔ کلکتہ میں امیر فرامشن ہوگئے۔ جلال آباد کے قریب ضلع لاغمان میں ملاؤں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا اور اشتعال طبع دلوانے والی تقریریں کی گئیں اور یہ الزام لگایا گیا کہ امیر نے فرامشن ہوکر اپنا مذہب بدل دیا۔ بعض غالی ملاؤں نے یہ بھی کہا کہ اب وہ ہم پر قابل حکمرانی نہیں۔ اس جلسہ کو سردار عنایت اللہ خلف اکبر امیر حبیب اللہ نے منتشر کردیا۔

۳۰ مارچ سنہ ۱۹۰۷ع | محمد علی شاہ بادشاہ ایران مظفرالدین شاہ مرحوم کے خلف اکبر ہیں جن کی عمر ۳۴ سال ہے۔ سنہ ۱۸۷۲ع

میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی شادی ملکہ جہاں خاتون وزیرجنگ کی بیٹی سے ہوئی۔

۲ فروری سنہ ۱۹۰۸ء آج کے روز اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ شاہ کارلوس پرتگیز اور ان کے بیٹے ولیعہد اور ملکہ پرتگیز جب گاڑی پر سوار جا رہے تھے اور ان کا چھوٹا بیٹا مینول گاڑی پر سوار تھا تو تین شخصوں نے گاڑی پر چڑھ کر ریوالور طمنچہ سے شاہ اور ولیعہد کو گولیوں سے مار ڈالا۔ صرف ملکہ اور ان کا چھوٹا بیٹا محفوظ رہا۔ قاتل گرفتار ہوکر قتل کیے گئے۔

۲۶ اگست سنہ ۱۹۰۸ء سلطان عبدالحمید خاں نے قسطنطنیہ میں اپنی گورنمنٹ قائم کی۔ اگرچہ بعض وزرا وغیرہ اس کے خلاف تھے لیکن سلطان نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور ان کو موقوف کرکے جدید وزرا مقرر کیے۔ لیکن عموماً سلطان کی کل رعایا نے اظہار خوشی کا کیا اور یوروپین بادشاہ بھی پارلیمنٹ قائم ہونے سے مظاہر رضامندی و خوش ہیں۔

۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۰۸ء اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت ایران میں بہت غدر ہو رہا ہے۔ بادشاہ ایران آئینی حکومت کو پسند نہیں کرتے اور رعایا اسی کی خواستگار ہے۔ لہذا رعایا و بادشاہ میں بمقام تبریز سخت لڑائی ہوئی اور برابر خوں‌ریزی ہو رہی ہے۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

۱۸ نومبر سنہ ۱۹۰۸ء آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۱۴ نومبر کو شاہنشاہ چین نے اور ۱۵ نومبر کو بیوہ شاہنشاہ چین نے انتقال کیا۔

۲۱ دسمبر سنہ ۱۹۰۸ء سلطان ترکی نے ۱۷ دسمبر سنہ ۹۰۸ ع کو پارلیمنٹ کا افتتاح کیا اور دستوری انتظام کے آغاز سے اپنی مسرت ظاہر کی۔

یکم مئی سنہ ۱۹۰۹ء آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۲۷ اپریل سنہ ۱۹۰۹ء کو عبدالحمید خان سلطان روم حسب فتویٰ شیخ‌الاسلام تخت سے اتار دیے گئے کہ انھوں نے احکام شرع شریف کے خلاف کیا اور بےگناہوں کا خون بہایا اور رشید آفندی ان کے چھوٹے بھائی کو جن کی عمر ۶۵ سال کی ہے

بہ لقب محمد پنجم تخت نشین کیا۔ سلطان عبدالحمید کی عمر ۶۸ سال تھی۔ انہوں نے ۳۳ برس حکومت کی۔ ان کا منشا یہ تھا کہ پارلیمنٹ بھی قائم ہو اور میرا بھی اختیار رہے۔ اس وجہ سے بڑا کشت و خون ہوا۔ سلطان عبدالحمید خاں مع گیارہ بیگمات و دو چھوٹے بیٹوں کے سلونیکا کو منتقل ہوئے اور بحالت جلاوطنی وہیں سکونت گزیں ہوں گے۔ ۲۹ اپریل سنہ ۱۹۰۹ع کو سلونیکا بھیجے گئے۔

یکم جون سنہ ۱۹۰۹ع | سلطان عبدالحمید خاں کی ذاتی دولت پانچ کروڑ پونڈ ہے جو معرض ضبطی میں آوے گی اور مصارف سلطنت میں صرف ہوگی۔

۲۱ جولائی سنہ ۱۹۰۹ع | ۱۷ جولائی سنہ ۱۹۰۹ع کو شاہزادہ ولیعہد سلطان احمد مرزا فرزند دویم شاہ ایران مشتہر ہوئے اور فرقہ نیشنلسٹ کے خوف سے جس کے سرگروہ اسد خاں ہیں محمد علی شاہ ایران نے روسی سفارت خانہ میں پناہ لی۔

۲۹ جولائی سنہ ۱۹۰۹ع | سلطنت قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ نے چودہ ہزار تین سو پچھتر روپیہ ماہوار مشاہرہ سلطان معزول عبدالحمید خاں کا مقرر کیا۔

اب کچھ مقامی حالات و واقعات دلچسپ ملاحظہ ہوں یعنی سندیلہ، لکھنؤ اور صوبہ یوپی کے۔ عموماً وہی واقعات منتخب کیے گئے ہیں جن سے اس زمانہ کے رسم و رواج، معتقدات، معاشی و تاریخی واقعات، لوگوں کے طریقہ تفکر و خیالات پر روشنی پڑتی ہے یا واقعہ بجائے خود حیرت انگیز ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ع و سنہ ۱۹۱۱ع کے حالات بہت سے چھوٹ گئے ہیں کیونکہ یہ جلدیں خط شکست میں لکھی ہوئی ہیں اس لیے پڑھی نہیں گئیں۔ اس کے علاوہ چند ایسے دلچسپ واقعات بھی چھوڑ دیے گئے ہیں جن کے کرنے والے ابھی حیات ہیں اور یقینی ان کے افعال کو یوں منظر عام پر آتے ہوئے دیکھ کر سخت ان کی کبیدگی خاطر کا باعث ہوتا۔

۱۹ اگست سنہ ۱۸۶۹ع | آج ہری ہر شاہ فقیر شاہ اندرابن نے حامد حسین کو طلب کیا اور شاہ اندرابن کی قبر کے سامنے ان کو کھڑا کیا۔ کھڑے ہونے کے ساتھ ہی حامد حسن نے غل و شور مچایا اور کہا کہ میں حسن علی شاہ

گویا منو کا ہوں۔ حامد حسین کے سر کے بالوں پر عاشق ہوکر ۱۷ دن سے ان کے ساتھ رہتا ہوں لیکن اب چھوڑتا ہوں ہرگز نہ آؤں گا۔ غرض کہ ہری ہرشاہ نے حامد حسن کے چہرہ پر کچھ پڑھ کر پھونک ڈالی اور حسن علی شاہ چلے گئے اور حامد حسن صحیح و سالم ہوگئے۔ یہ کیفیت میری چشم دید ہے۔ معلوم نہیں کہ کیا اسرار تھا۔

۱۹ مئی سنہ ۱۸۷۴ع دریافت ہوا کہ راجا کوالبار اپنی طوائف چندر بھاگا کے لینے کے واسطے لکھنؤ آئے تھے جس نے منشی محمد حسین وکیل سے عقد کرلیا ہے۔ رات کے وقت وکیل کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ وکیل صاحب تو بھاگ گئے تھے مگر چندر بھاگا کو گوشمالی معقول دی۔

۱۴ اگست سنہ ۱۸۷۴ع دنباس صاحب انجنیر کا لوری اکثر کانپور میں بجلسہ نازنیناں رہا کرتے ہیں۔ شاید عنقریب کسی مس کو پسند کرکے شادی کریں گے جس کی وجہ سے اکثر کاغذات بلا دستخطی رہتے ہیں اور کوئی کام اجرا نہیں ہوتا۔

۱۹ نومبر سنہ ۱۸۷۵ع یعقوب خاں سابق کمیدان عہد شاہی رئیس مرزا گنج نے قضا کی۔ ان کا عہد شاہی میں بہت دور دورہ تھا۔ (میاں کی سر کی قسم) ان کا تکیہ کلام تھا۔ جاہل محض تھے۔ لیکن آدمی خوش نصیب تھے بعمر ۶۵ سال قضا کی۔

۶ و ۷ جنوری سنہ ۱۸۷۶ع آج میں لکھنؤ گیا۔ قیصر باغ میں مقیم ہوا۔ شام کو سواری شاہزادہ ویلز بہادر ولی عہد ملکہ وکٹوریہ معائنہ کی۔ شاہزادہ صاحب ہاتھی چواسیہ پر سوار تھے۔ ہزارہا خلقت تماشائی تھی۔ عمر تخمیناً ۳۵ سال ہوگی۔

۷ جنوری سنہ ۱۸۷۶ع آج شاہزادہ ویلز قیصر باغ میں ۹ بجے رات کو تشریف لائے۔ منجانب تعلقداران اودھ دعوت بارہ دری قیصر باغ میں ہوئی۔ روشنی و آتش بازی عمدہ تھی۔ ایک تاج مرصع و بکس نقری وغیرہ قیمتی ۳۰ ہزار روپیہ منجانب تعلقداران پیش ہوا جس کو شاہزادہ صاحب نے منظور و قبول فرمایا۔

۲۷ فروری سنہ ۱۸۷۶ع	آج کل ہر گلی و کوچہ میں تذکرہ مسماۃ ؟م النساء زوجہ محمد اجمل کا ہوتا ہے اور کمال درجہ فضیحتی ہورہی

ہے۔ یہ مقام کمال عبرت کا ہے کہ جس شخص کا باپ عہدہ صدر اعلیٰ پر بمشاہرہ مبلغ ۸۰۰ روپیہ ماہواری ممتاز ہو اس کی لڑکی بمقابلہ اپنے شوہر کے عدالت میں روبکاری کرتی پھرے۔

۲ اگست سنہ ۱۸۷۷ع	جس مقام پر طوائفان سندیلہ علم لیکر کربلا میں مقیم ہوتی تھیں اور دعا باران رحمت کی کرتی تھیں شب کو کسی

شخص نے بھیٹ کربلا میں آگ لگادی اور چند بھیٹیں جو ایک دوسرے سے پیوستہ تھیں سوخت ہوگئیں۔ بیچاری طوائفیں بباعث خوف بحالت سراسیمگی بھاگ کر اپنے اپنے گھر آئیں اور امیدواری بارش میں یہ سوختگی نصیب ہوئی۔

۱۲ مئی سنہ ۱۸۸۰ع	احمد رضا خاں تھانہ دار ہوشنگ آباد ساکن رامپور واسطے ملاقات مولوی فضل الرحمٰن صاحب مرادآبادی فائز سندیلہ

ہوئے اور مکان منشی فضل حسین پر قیام کیا اور مزاحاً یہ بات کہی کہ اگر مکان منشی صاحب کو بہشت قرار دوں تو ہوسکتا ہے کیوں کہ مثل بہشت کے اس مکان میں پاخانہ نہیں ہے۔

۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۸۰ع	۱۸ ستمبر سنہ رواں کو نینی تال پہاڑ پر ایسا سیلاب آیا کہ ایک ٹکڑا پہاڑی کا پھٹ کر گرا جس سے بہت انگریز

ہلاک ہوئے اور نینی تال والوں کو بہت بڑی مصیبت کا سامنا ہوا۔

۱۰ مارچ سنہ ۱۸۸۱ع	شام کو دریائے گومتی کے دونوں جانب اور کشتیوں پر نہایت عمدہ روشنی کی گئی اور آتشبازی چھوٹی۔ یہ

دونوں چیزیں قابل دید تھیں جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ اہتمام اس کا چودھری خصلت حسین صاحب تعلقدار سندیلہ و سکریٹری انجمن ہند کے متعلق تھا اور چودھری نصرت علی اسسٹنٹ سکریٹری کو بحسن کارگزاری کام متعلقہ نمائش اجناس گورنمنٹ سے

حسب ذیل خلوت عطا ہوا۔ دوشالہ یک رومال شالی یک دوپٹہ بنارسی یک چوغہ پشمینہ یک جملہ ۵ روپیہ اور یقین ہے کہ ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہو۔

۲۰ اگست سنہ ۱۸۸۱ع آج کل ایک مقدمہ چوری تیترہ کا اجلاس منشی فضل حسین صاحب میں چالانی پولیس دائر ہے کہ جس میں مسمی سرفراز علی رئیس زادہ شاہ آباد بھی ماخوذ ہیں اور اکثر رئیس قصبہ مذکور مقدمہ مسطورہ کی پیروی کر رہے ہیں۔

۲۷ ستمبر سنہ ۱۸۸۱ع بہمراہی سید فضل حسین کارخانہ کاغذ سازی جو متصل دریائے گومتی لکھنؤ کے ہے آج جاکر معائنہ کیا۔ واقعی بہت بڑا کارخانہ ہے جس میں صدہا آدمی ملازم ہیں اور دو انگریز بھی نوکر ہیں۔ کام بہت عجلت سے جاری ہے۔ بالفعل چھوٹی کل سے کاغذ بنتا ہے اور بڑی کل مرتب ہو رہی ہے۔

۲۵ ستمبر سنہ ۱۸۸۳ع تحقیق و دریافت ہوا کہ حسب ایما چودھری محمد عظیم صاحب کہ جن کو منشی فضل حسین صاحب سے لطف ہیں ہے مرزا محمد تقی بیگ تعلقدار اورنگ آباد و بہادر بھارت سنگھ تعلقدار ہتورہ و راجا رندھیر سنگھ تعلقدار بھراون مجمع کثیر سے شرکت شادی الطاف رسول خلف منشی فضل حسین میں کو بیرکے تاکہ اگر اچھے طور سے انتظام مہمانداری کا نہ ہو تو منشی فضل حسین کی بدنامی ہمچشموں میں ہو۔

۱۲ مارچ سنہ ۱۸۸۴ع کل بخانہ ملک مصطفےٰ حسین دوپہر کو فرزند نرینہ پیدا ہوا۔ چونکہ لڑکا بعد تین لڑکیوں کے پیدا ہوا ہے اس وجہ سے عورتیں اس کو تیترا نامزد کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ایسا لڑکا ناقص ہوتا ہے' باپ اس کو نہ دیکھے۔ اس وجہ سے ملک صاحب سخت متردد ہیں اور اپنے گھر نہیں جاتے۔

۲۸ مئی سنہ ۱۸۸۸ع شب کو دختر لالہ دولت رام جس نے اپنے شوہر منسارام کے غم مفارقت دائمی میں کھانا پینا بالکل ترک کر دیا تھا

اور یاد شوہر میں کیفیت جنون کی پیدا ہوگئی تھی ۱۱ بجے رات کو بعمر ۱۷ سال فوت ہوئی۔ واقعی اس کو عشق حقیقی تھا اور زمانہ سابق میں ایسی ہی عورتیں ستی ہوجاتی تھیں۔

۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۸۸ع — آج کل عجب نیرنگیاں سندیلہ میں وقوع پذیر ہیں کہ جن کا اظہار اس موقع پر بےمحل نہ ہوگا۔ منشی فضل‌حسین کی عادت ہے کہ بلاوجہ لوگوں کو ستانے و دق کرنے کو اکثر خطوط گمنام ان کے نام بھیجا کرتے ہیں۔ بلکہ اکثر اپنے دست و قلم سے لکھا کرتے ہیں جس کا جواب اسی طریقہ سے ان کو وصول ہوا کرتا ہے۔ بقول شخصے چاہ کندہ را چاہ درپیش۔ چنانچہ کئی روز ہوئے کہ ایک خط منجانب جناب منشی فضل رسول صاحب مرحوم از مقام جہنم بنام سید فضل حسین صاحب اس مضمون کا موصول ہوا کہ انورخاں میرے پاس داخل جہنم ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تم لوگوں سے خوش‌برتاؤ نہیں کرتے اور کل اہل قصبہ کو اپنا دشمن کرلیا ہے جس سے ابن‌جانب کو سخت ملال و تاسف ہے۔ قصد تھا کہ قبر توڑ کر نکل آؤں اور تم کو گوشمالی مناسب دوں لیکن یہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ اس وجہ سے مجبور رہا۔ اگر تم اپنا طریق و عمل و طرز معاشرت درست نہ کروگے تو دوسرے نہج سے تمہاری تنبیہ و سرکوبی ہوگی یہ خط بدل ان تحریرات کا ہے جو وہ دوسروں کے دل دکھانے کے واسطے بھیجتے ہیں ورنہ اور رئیس بھی سندیلہ میں ہیں ان کے نام کیوں نہیں ایسے خطوط آتے۔ افسوس ہے کہ فضل‌حسین نے اپنے وقار اور حرمت کو ایسا بگاڑا ہے کہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو ان کے نام تحریرات، ہزل و تمسخر بھیجنے کی جرأت ہوتی ہے۔ خدا ان کو رائے صائب عطا کرے۔

۷ دسمبر سنہ ۱۸۸۸ع — آج ۹ بجے رات کو عقد شرعی دختران وصی‌علی شاہ صاحب درگاہ کا فرزندان حامد علی و مشرف علی سے ہوا۔ میں بھی شریک رہا۔ محمد ادریس خلف حامد علی کا عقد مسماۃ کنیز فاطمہ اور نبی محمد عرف مسیح‌اللہ خلف مشرف‌علی کا مسماۃ اللہ‌بخشی سے ہوا۔ ایک ایک ہزار اور ایک ایک روپیہ

مہر قرار پایا۔ دس بجے رات کو فراغت ہوگئی۔ بعد فراغت نکاح شاہ صاحب اپنے سر پر چلنی کے پل رکھ کر اور لڑکیوں کو پا پیادہ لے کر ان کی سسرال پہنچا آئے۔ لڑکیاں سات سات پیوند کی چادریں اوڑھے تھیں اور پیجاموں میں بھی پیوند لگے تھے۔ ایسے شرعی طریقہ سے عقد سندیلہ میں کبھی کسی کا نہیں ہوا۔ ہر وقت رخصتی دولہن ایک کہرام عظیم تھا۔ کل حاضرین کو رقت تھی۔

۱۱ جون سنہ ۱۸۹۰ء — آج مسماۃ مہرانی طوائف سندیلہ کی ناک مسمی رگھوبر زرگر لکھنؤ نے جڑ سے کاٹ ڈالی۔ عشق بازی کا یہی ثمرہ ہے۔

۱۶ نومبر سنہ ۱۸۹۰ء — آج مسماۃ لاڈو طوائف دختر ممولا طوائف جس نے ایک مسجد بازار دروازہ امانی گنج میں تعمیر کی ہے، میری عیادت کو آئی۔ اس کا عہد شاہی میں بہت بڑا دور دورہ تھا۔ بوجہ مصاحبت نواب علی‌نقی خاں وزیر اعظم کل چکلہ دار اس کے مطیع تھے۔ یہ ایک نقل مشہور ہے کہ اس نے اپنی تقریب مٹی میں اہل ہنود سے گھونٹیاں چھلوائی تھیں۔ اب بھی وہ خوش‌حال ہے۔ اس کے پاس ایک موضع موسومہ لاڈو کھیڑہ ضلع اناؤ میں معافی ہے جس کی حاصل حال ۵۰۰ روپیہ سالانہ سے کم نہیں ہے۔

۲۹ اکتوبر سنہ ۱۸۹۲ء — آج ۲ بجے شام کو سر آکلینڈ کالون صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ کا دربار ہوا۔ مسٹر ولیم صاحب قائم مقام کمشنر اضلاع لکھنؤ وغیرہ ہمراہ تھے۔ میری کرسی کا نمبر ۲۲ تھا۔ درباریوں میں جملہ تعلقہ‌داران و رؤسا و معزز ممبران میونسپل بورڈ و ڈسٹرکٹ بورڈ شریک تھے۔ منجانب باشندگان ضلع ہردوئی چودھری محمدعظیم صاحب تعلقہ‌دار و رئیس سندیلہ نے ایڈریس اردو میں پڑھا جس کا جواب لارڈ صاحب نے اسی زبان میں دیا۔ جملہ درباری حسب ہدایت کرنیل کوئن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی عمامہ باندھے تھے سوائے چند درباریوں کے جنھوں نے اپنے پرانے طریقہ کو قائم رکھنے کا عذر کیا تھا۔

۱۵ نومبر سنہ ۱۸۹۲ع | آج قریب نصف شب بوقت ایک بجے مولوی لطف علی صاحب برادر کوچک شیخ مومن علی صدراعلیٰ کا انتقال ہوا۔ آپ کو کیمیا کا بےحد شوق تھا۔ بعد ترک روزگار ایسے عارضہ میں تا بہ زیست مبتلا رہے۔ لیکن کبھی کامیاب نہ ہوسکے حتٰی کہ دھونکتے دھونکتے اور پھونکتے پھونکتے بصارت بھی جاتی رہی۔ اب بعمر ۶۰ سال فوت ہوئے۔ ایک بیٹا محمد اجمل یادگار چھوڑا جو ریاست بھوپال میں تھانہ‌دار ہے۔

۲۹ مئی سنہ ۱۸۹۳ع | بباعث شدت گرمی کے سرد پانی کی زیادہ خواہش رہتی ہے۔ لہذا میں نے دو من شورہ خرید کیا جس سے پانی سرد کرکے پیتا ہوں جو معین ہضم بھی ہے۔

۱۵ نومبر سنہ ۱۸۹۳ع | پوسٹ کارڈ نورچشم سید مجتبیٰ علی محررہ ۱۲ نومبر سن الیہ بدیں مضمون سروے اسکول کانپور سے موصول ہوا کہ اکثر طلبا نے حسب خواہش مدرس اول مدرسہ مذکورہ کے یہ تدبیر کی ہے کہ فی طالب‌علم پچیس پچیس روپیہ کسی مہاجن معتبر کے پاس اس غرض سے جمع کردیے کہ طالب‌علم کامیاب سے مدرس مذکور رقم مجتمع بذریعہ مہاجن وصول کرلیں اور اس طریق میں اپنی توجہ خاص کو صرف کریں گے۔ بتائید اس امر کے ان کے ساتھیوں نے فراہمی روپیہ کی تجویزیں کی ہیں۔ پس میں نے بھی برخوردار مذکور کو ہدایت کی کہ اپنے ساتھیوں کی روش کی پابندی کریں۔ میں بوقت ضرورت روپیہ بھیج دوں‌گا۔

۲۰ ستمبر سنہ ۱۸۹۴ع | آج کلو ولد فہم‌اللّٰہ ڈنڈھا نے کاو خلف روح‌الدین کی ناک دانت سے کاٹ لی جو علیحدہ ہوگئی۔ یہ دونوں اشراف محلہ میں رہتے ہیں۔ کچھ معاملہ عاشقی معشوقی کا تھا۔ کلو کچھ ایسا حسین و خوبصورت لڑکا نہ تھا۔ لیکن طبیعت۔

۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۹۴ع | آج میں ایک واقعہ افسوس ناک حوالہ قلم کرتا ہوں جو باعث عبرت ناظرین ہوگا۔ مجھے آج صبح کو اسسٹنٹ سرجن

سندیلہ نے ایک خط بھیج کر اپنے شفاخانہ میں طلب کیا کہ میں ایک ملازم کا بہ حیثیت مجسٹریٹ معائنہ کروں جو جاں بلب ہے اور شفاخانہ میں زیر علاج۔ مسماۃ پاربتی زوجہ خوشحال چمار جندپور مزرعہ بھروہرہ تھانہ سندیلہ نے بوقت استفسار بیان کیا کہ وہ بیوہ ہے اور اس کی چار خورد سال لڑکیاں تھیں پانچ روز سے کچھ کھانے کو میسر نہیں آیا اور وہ بھوک سے تڑپتے تھے۔ تب وہ اپنے لڑکوں کی ایسی حالت برداشت نہ کر سکی اور مرنے کو زندگی پر ترجیح دی سب سے اول اس نے چاروں لڑکوں کا گلا استرے سے کاٹا اور پھر اپنے گلے پر استرا پھیرا جس سے نیم جان ہے۔ سانس پیٹ کی کچھ بذریعہ زخم اور کچھ منہ کے نکلتی ہے۔ چند ساعت کے بعد لڑکا تو مرگیا تینوں لڑکیاں زندہ ہیں جن کی صراحت عمر وغیرہ درج ذیل ہے:—

مسماۃ مہرنیا عمر ۱۰ سال
مسماۃ مکوئی عمر ۶ سال
مسماۃ دلاری عمر ۳ سال
مسمے کھاسی پسر متوفی ۵ سال

تینوں لڑکیاں غالباً بچ جاویں مگر ماں کی خیریت نہیں ہے جس کی عمر ۴۰ سال ہے۔ یہ فعال محض مجبوری سے ہوا۔ ورنہ اولاد سے دلاری دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔

۱۸ جنوری سنہ ۱۸۹۵ء | آج رات سے منشی فضل رسول صاحب کا عرس شروع ہوا اور مشائخ لکھنؤ واسطے زینت محفل کے آرہے ہیں۔ اگر نعش منشی صاحب اس مصنوعی حال قال کے مجلس موقوف کرکے دو چار ہزار بخش کھانا محتاجوں کو تقسیم کراتے تو شاید روح جناب مغفور کو زیادہ ثواب پہنچتا۔ اس مجلس کا صرف یہ ہی نتیجہ نکلا کرتا ہے کہ شہر کے اوگ حالیوں کا تماشا دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہیں اور ان کی شورش سے لطف گانے کا بھی مفقود ہوجاتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایسے افعال اور حرکات سے مرحوم کی روح کو صدمہ ہوتا ہو۔

۱۰ اپریل سنہ ۱۸۹۵ء | بارہ دری قیصر باغ میں جلسہ ندوۃالعلما منعقد ہوا ہے جس میں مشہور و نامی علما تمامی ہندستان کے شریک ہیں۔ مقاصد جلسہ یہ ہیں کہ اہل اسلام کو ترقی علوم دینی و دنیوی میں توجہ و ترغیب

ہو جو اور قوموں سے پیچھے رہ جاتے ہیں ۔ دونوں وقت صبح شام وعظ ہوتا ہے اور اس تمامی خرچ کے کفیل حضرت وکیل صاحب ہیں ۔ خدا ان کو اپنی کوشش میں کامیاب کرے ۔

۱۲ ستمبر سنہ ۱۸۹۵ء آج صبح کو چودھری نصرت‌علی صاحب خان بہادر رئیس متھوانہ کے مکان پر محفل میلاد شریف منعقد تھی ۔ اول پانچ پانچ لڈو جو اسی غرض سے تیار ہوئے تھے تقسیم ہوئے اور جب وہ باعث مجمع کثیر کافی نہ ہوسکے تو مٹھائی بازار سے منگاکر تقسیم ہوئی اور جب وہ بھی غیر کافی ٹھیری تو سو روپیہ کے پیسے فی کس دو آنہ کے حساب سے بانٹے گئے اور جب وہ بھی حساب نہ چل سکا تو ایک آنہ بعد ۶ پائی فی کس دیے گئے ۔ سنا گیا کہ ۱۶۵۰ روپے اس تقریب میں صرف ہوئے ۔ اب سندیلہ میں مجلس کرنا بہت مشکل ہوگیا، نیکی تو درکنار برائی پیش قدمی کو تیار ۔ اس وجہ سے متوسط لوگوں نے ایسا کرنا موقوف کردیا ہے ۔ کروں صد عیب نہ کروں یک عیب ۔

یکم اکتوبر سنہ ۱۸۹۵ء آج برخوردار منظم‌حسین کا دُر طلائی داھنے کان سے اتارا گیا اور اس کا زر ثمن اور مبلغ ۶ روپے اور شامل کرکے ۱۳ سیر پلاؤ پُخت ہوا اور بعد نیاز پیران پیر دستگیر اس کی تقسیم عمل میں آئی ۔ یہ ہمارے خاندان میں رسم ہے کہ بعد پیدائش فرزند پہلی گیارھویں پر پیر دستگیر کے نام سے داھنے کان کی کوچیا میں در پہنایا جاتا ہے اور جب لڑکا گیارہ برس کا ہوتا ہے اور دُر فروخت کرکے اور کچھ اپنے پاس سے شامل کرکے پلاؤ پکتا ہے اور بعد نیاز اس کی تقسیم ہوتی ہے ۔

۹ اگست سنہ ۱۸۹۶ء آج منشی رحمت‌اللہ تحصیلدار سندیلہ نے بوقت ملاقات مجھ سے بیان کیا کہ د منشی تعلقہ‌دار کی وجہ ناراضگی میرے ساتھ یہ ہے کہ انھوں نے دو شکایتیں مجھ سے کیں کہ میں ان کا انسداد کرادوں ۔ لیکن وہ ایسے امور تھے کہ میں ان کی تعمیل میں قاصر رہا اول یہ کہ چودھری علی‌جان خلف دویم چودھری محمدعظیم صاحب تعلقہ‌دار جہاں کہیں ملتے ہیں تو مجھے انڈا

دکھلاتے ہیں اور قیں کردیتے ہیں اور جب میں بازار میں نکلتا ہوں تو بازاری لڑکے مجھے منہ چڑھاتے ہیں اور ایذا دکھلاتے ہیں۔ آپ ان کو گوشمالی واجب دیں۔ دوسرے میری آشنا شہریں کے یہاں رات کو ڈھیلے آتے ہیں اور نصف جلی ہوئی کنڈی اور میری کوٹھی و محلسرا میں اینٹیں آتی ہیں تو میری بی‌بی کو اس موسم گرما میں صحن میں لیٹنا دشوار ہوگیا ہے اس کا انسداد کردیں۔ میں نے کہا کہ دونوں باتیں مجھ سے نہیں ہوسکتی ہیں آپ خود اس کا بحیثیت تعلقہ‌دار اور اپنی دولت‌مندی کے باعث بندوبست کرسکتے ہیں۔

۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۹۶ء | آج کل تمامی ہندستان میں بباعث امساک باران و عدم پیداوار فصل نوبت قحط کی پہنچ گئی ہے۔ صدہا آدمی فاقہ سے مررہے ہیں۔ فقیروں کی یہ کثرت ہے کہ تمام دن ۱۱ بجے رات تک ان کے سوالوں سے چھٹی نہیں ملتی حالانکہ میں نے اپنے گھر کا یہ بندوبست کرلیا ہے کہ کچھ غلہ بنی نکاہ کے سامنے رکھوالیا ہے اور ملازموں پر تاکید ہے کہ جو سائل آوے وہ خالی نہ پھیرا جاوے۔ ایسا نہیں تک دیا جاوے۔ بعض وقت نوکر بھی تنگ آکر جواب دینا جائز رکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں تین قسم کی صعوبتیں ہوئی ہیں۔ اول حاکم ظالم دوسرے ہیضہ وبائی کی شدت تیسرے قحط کی صعوبت جس سے خلق اللہ کو سخت سخت پریشانیوں کا سامنا ہوا تھا۔ آج کل میں جہاں تک خیال کرتا ہوں تو وہی کیفیت تمام ہندستان کی ہورہی ہے اور جابجا لوٹ مار ڈاکہ‌زنی شروع ہوگئی ہے۔ آج کی تاریخ میں نرخ غلہ بازار سندیلہ کا حسب ذیل ہے:-

گندم	نخود	بجھڑا	جو	مکائی
ساڑھے آٹھ سیر	ساڑھے گیارہ سیر	پونے گیارہ سیر	گیارہ سیر	سوا بارہ سیر

کاکن	منڈوئی	دھان	ماش
چودہ سیر	ساڑھے تیرہ سیر	دس سیر	دس سیر

یہ گرانی سنہ ۱۸۷۷ء سے بڑی بڑھ کر ہے جب کہ گیہوں کا نرخ ۱۰ سیر کا تھا۔

۳ اکتوبر سنہ ۱۸۹۶ع — چونکہ بخانہ الطاف رسول خلف الصدق منشی سید فضل حسین صاحب امید ولادت فرزند اولین ہے اور اب ساتواں مہینہ ختم ہورہا ہے لہذا حسب رواج خاندانی آج تقریب ''ستوانے'' دوپٹہ ڈالنے کے بفراہمی مستورات برادری گانے بجانے کے ساتھ ادا ہورہی ہے۔ خدا کرے فرزند صاحب اقبال پیدا ہو۔

۵ ستمبر سنہ ۱۸۹۷ع — ......مرتضی علی کی بارات لکھنؤ میں آوے اور عقد شرعی ہوگا اور ۲۷ ربیع الثانی کو رخصتی ہوگی اور ۲۸ کو دونوں کی سندیلہ سے واپسی کیوں کہ ۲۶ کو بعد شام کے ۲۷ تاریخ لگ جاوے گی جو طاق ہوگی اور اس قسم کی تاریخ میں رواجاً عقد نہیں ہوتا ہے۔

۲۱ مئی سنہ ۱۸۹۸ع — برخوردار سید حافظ علی مرحوم نے جو اپنی بیٹی کا عقد محمد عزیز کے ساتھ کیا۔ اس میں کسی کا نیوتہ نہیں لیا اور نہ کوئی رسم ادا ہونے دی۔ حتٰی کہ کسی قسم کا کھانا بھی سمدھیانے نہیں بھیجا۔ صرف کچھ زیور معمولی اور ایک جوڑا لڑکی کو دے کر رخصت کردیا۔ جب انھوں نے نیوتہ نہیں لیا ہے تو آیندہ کسی کو نہیں دیویں گے۔ یہ طریقہ انھوں نے جدید اختراع کیا جس کا رواج اس محلہ و قصبہ میں نہیں ہے۔

۲۹ مارچ سنہ ۱۸۹۹ع — آج میں نے بوقت صبح راجا درگاہ پرشاد صاحب تعلقہ دار سے ملاقات کی جو بحالت تخلیہ ہر قسم کی مجھ سے بات چیت کرتے رہے اور جب میں رخصت ہوا تو دروازہ بیرونی تک مجھے پہنچانے آئے۔ اس کے بعد میں کنور نراندر بہادر صاحب سے ملا۔ مجھے اپنی کوٹھی جدید کا معاینہ کرایا اور بہت لطف محبت سے پیش آئے اور ایک گھنٹہ تک مجھے مسٹر ایڈیسن صاحب امریکہ کا ایجاد کیا ہوا باجا سنایا جو جدید ایجاد ہوا ہے اور جس میں ہرایک شخص کی آواز کا فوٹو فوراً اتر جاتا ہے۔ جس قسم کی وہ بات چیت کرے اور جو گانا گاوے۔ فوراً اس کی آواز پیالہ میں اتر جاتی ہے اور جس وقت اس کو ٹوکیے فوراً اسی قسم کا گانا جیسا گویے نے گایا تھا اسی تال سر سے ہونے لگتا ہے۔ کنور صاحب نے اس باجہ کو بقیمت مبلغ ۳۰۰ خرید کیا ہے۔

۸ اپریل سنه ۱۹۹۹ع
آج شب کو ایک تھیٹر لکھنو کا جلسه احاطه تقی میاں مرحوم میں شروع ہوا۔ ٹکٹ ۲ روپیے سے لے کر ۱۲ روپیے تک تھا۔

۵ مئی سنه ۱۹۹۹ع
آج کل ایک مہینه سے اس قدر کثرت شادی بیاهوں کی قصبه هذا میں هے که اوسط روزانه ۱۲ سے ۱۵ تک کا هے اور یہی کیفیت دیہات میں هے۔ یه دیکھ کر مجھے غدر کے بعد سنه ۱۸۵۸ع کی کیفیت یاد آرهی هے که جس زمانے میں یه هی کثرت تھی۔

۲۱ دسمبر ۱۹۹۹ع
آج شام کو مسمی رحم واد مرج ڈھاری گوالیار کا منشی سید فضل حسین صاحب کے مکان پر ناچ ہوا اور به اصرار منشی صاحب میں بھی شریک جلسه ہوا۔ وہ اولاً تلواروں کی باڑه پر بلا تکلف پیروں کی ٹھپکی دے کر ناچا اور کوئی اثر تلوار کی باڑه کا اس کے پیروں اور تلووں پر نہیں پہنچا۔ دوسرے وه چھوٹی بتاشوں کو بچھا کر ناچا اور ایک بھی بتاشه نہیں ٹوٹا۔ تیسرے وه گھونگرو پیروں میں نہیں باندھے تھا لیکن وه منه سے ایسے صاف گھونگرو بجاتا تھا گویا وه پیروں کی ٹھپکی دے کر بجاتا هے۔ بظاهر اس کی عمر ۲۵ سال کے اندر هے۔ منشی صاحب نے مبلغ ۱۰ روپیه اس کو انعام دیا۔

۲۴ دسمبر سنه ۱۹۹۹ع
آج کمیٹی امداد ورثا مقتولین و مجروحین جنگ ٹرانسوال میونسپل هال میں منعقد ہوئی که جو انگریزی فوج بمقابله ڈچ باشندگان ٹرانسوال کی قتل ہوئی هیں ان کی بیواؤں و خورد سال لڑکوں کو چنده سے اعانت دی جائے۔

۶ فروری سنه ۱۹۰۱ع
بمعاینه اوده اخبار امروزه واضح ہوا که اصحاب ذیل نے واقعه ۲ فروری سنه ۱۹۰۱ع کو به یوم تجہیز و تکفین جناب ملکه معظمه قیصرهٔ هند انگریزی گرجا گھر لکھنؤ میں جاکر نماز مغفرت پڑھی۔ راجا تصدق رسول خان صاحب تعلقه‌دار جہانگیرآباد وائس پریسیڈنٹ انجمن هند لکھنؤ نے از جانب طبقه تعلقه‌داران اوده اور حاجی سید شعبان علی خان صاحب

تعلقہ دار از جانب اہل شیعہ و خان بہادر چودھری نصرت علی صاحب سندیلوی منجانب اہل تسنن ۔ مسلمانوں کو مسجد میں دعائے مغفرت مانگنی چاہیے تھی ۔

۲۳ فروری سنہ ۱۹۰۱ع | آج صبح کی ڈاک گاڑی میں لکھنؤ گیا اور گیارہ بجے سفید بارہ دری قیصر باغ میں شریک جلسہ تعزیت وفات ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند ہوا جہاں اضلاع مغربی شمالی و اودھ کے تمام معزز اشخاص جمع تھے حتّٰی کہ نواب حامد علی خان صاحب رامپور بھی تشریف لائے تھے۔ ٹھیک بارہ بجے دن کو جناب سر مکڈانل صاحب لفٹنٹ گورنر اضلاع مغربی شمالی رونق بخش ہوئے اور بصدارت خود اول اسپیچ اندوہناک پڑھی ۔ اس کے بعد تجویز فرمایا کہ کوئی قومی یادگار جناب قیصرۂ ہند کی کے تجویز کی جائے اور اس کے واسطے چندہ ہونے کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ اس وقت صرف چار آدمیوں نے تجویز ظاہر کی ہے ۔

نواب رامپور	مہاراجہ بھگوتی سنگھ صاحب بلرامپور
ایک لاکھ	پچاس ہزار

مہاراجہ صاحب بنارس	راجہ صاحب تانپارہ	جملہ
پچیس ہزار	دس ہزار	ایک لاکھ پچیسی ہزار

اسی وقت چندہ ہوا اور ما بقیہ چندہ ضلعوار فراہم ہوگا ۔ بعد اس کارروائی کے دربار برخاست ہوا اور شام کی ریل میں سندیلہ واپس آیا ۔

۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ع | آج فاتحہ چہلم نورچشمی جمیلاً کا ہوا جس میں ہر قسم کا کھانا زردہ پلاؤ وغیرہ پخت ہوا اور جس میں مبلغ ۳۲ روپے خرچ ہوئے ۔ ہم لوگوں میں عجب رسم ہے' اول تو آدمی مر جائے دوسرے اوپر خرچ مزید ہو جس سے سخت رنج اور وزیر باری متصور ہے مگر کیا کیا جاوے رسم سے چارہ نہیں ۔

۳ جنوری سنہ ۱۹۰۲ع | آج بعد ختم سیوم ہمشیرہ منشی کرامت حسین صاحب حسب تجویز مولوی احمدعلی صاحب امور ذیل اتفاق یک دگر طے قرار پایے ۔ ۱۔ کسی شخص کی وفات پر گھر والے و نیز اہل برادری جو شریک

غم ہوں منہ ڈھانک کر نہ روئیں اور نہ متوفی کے حالات بیان کریں۔ ۲۔ بجز رشتہ داروں کے اور کوئی اہل برادری متوفی کے گھر میں اہل درجہ تین روز سے زاید قیام نہ کرے۔ ۳۔ قریب کے رشتہ دار کھانا تقریب بخانہ متوفی بھیجیں لیکن اس کی مقدار اسی قدر ہو جو متوفی کے گھر والوں اور اقرب رشتہ داران مقیم کے واسطے کافی ہو۔ ۴۔ کھانا مذکور جو دیا بھیجا جاوے۔ کھچڑی مع دہی و گھی۔ دال و چاول۔ قلیہ روٹی۔ ۵۔ جب کسی کے گھر میں واقعہ وفات وقوع میں آئے تو اس کے افسر خاندان کو لازم ہے کہ اطلاع وفات اپنے اعزہ و خاص احباب کو بذریعہ حجام کرا دیوے تاکہ کسی شخص کو عدم اطلاع کا عذر نہ ہو۔

۹ مارچ سنہ ۱۹۰۹ع | محمد عربی بیرسٹر نے باعلان اس بات کو ظاہر کیا کہ اپنی بی بی کو بے پردہ رکھنا نامناسب نہیں سمجھتا ہوں چنانچہ میں اکثر گھاری گاڑی میں اپنے ساتھ ان کو بغرض تفریح لیجاتا ہوں اور جب ۷ مارچ کو میں اپنی بی بی لکھنؤ سے سندیلہ سیکنڈ کلاس میں لارہا تھا تو اس درجہ میں ایک انگریز بھی بیٹھا تھا لیکن میں نے کوئی پروا اس کی نہیں کی اور اپنی بی بی کو لے کر اسی درجہ میں بیٹھ گیا اور جب سندیلہ اسٹیشن کو پہنچا ہوں بلا انتظار اس کے کہ کوئی پردہ واسطے اترنے کے کیا جاوے وہ فوراً اتر کے پالکی پر سوار ہوگئیں اور میں اپنے ملازمان ذکور سے بھی چنداں پردہ کرانا پسند نہیں کرتا ہوں۔ ابھی کچھ خفیف حجاب سا ہے، بعد چندے وہ بھی ترک کرادوں گا۔ میں اس پردہ کو بالکل ناپسند کرتا ہوں۔ نوکر چاکر مثل جنگلی درختوں کے ہیں، ان سے پردہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

۱۴ مارچ سنہ ۱۹۰۲ع | مسٹر محمد عربی بیرسٹر ڈاڑھی تو منڈواتے ہی تھے اور اب انھوں نے مونچھیں بھی مونڈوا ڈالیں ان کی صورت بدنما معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک نئی وضع ایجاد ہوئی ہے۔

۲۴ اگست سنہ ۱۹۰۲ع | سر لاٹوس صاحب گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ نے ۱۳ اگست سنہ ۱۹۰۲ع کے جلسہ میں یہ طے کردیا کہ

چودھری محمد جان صاحب تعلقہ‌دار ککرالی کو اس وجہ سے اجازت شرکت کی نہیں دی کہ ان کی نسبت چودھری محمد عظیم اپنے باپ کو زہر دینے کی بدگمانی ہے اور راجا جنگ بہادر صاحب مرحوم ناپارہ کے بیٹے بدیں وجہ شرکت دربار سے ممنوع کیئے گئے کہ ان کی نسبت لفٹنٹ گورنر کو مخبری ہوئی کہ انھوں نے اپنے باپ کو جوتوں سے مارا کہ جس کے رنج سے وہ بیمار ہوگئے۔ آخرش مقام بھرائچ میں انھوں نے قضا کی۔ اب کے سال یہ وارداتیں ایسی ہوگئیں کہ ہلاکت خود اپنے بیٹوں کے ہاتھ سے مسموع ہورہی ہے۔ سچ یہ ہے کہ جائداد دنیا میں ایسی شے ہورہی ہے جس کی وجہ سے بھائی بھائی کی جان کا دشمن ہوجاتا ہے اور بیٹا باپ کو نگاہ دشمن سے دیکھتا رہتا ہے۔

۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۰۲ ع ....درین ولا ایک میلادشریف بمقام نینی‌تال گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوئی اور سرلاٹوس صاحب لفٹنٹ گورنر اضلاع مغربی شمالی اودھ نے مع اپنے مصاحبوں کے اس میں شرکت کی اور ۲۰ منٹ تک شریک جلسہ میلاد رہے۔ یہ ایک نئی بات لاٹ صاحب نے کی۔

۲۶ اگست سنہ ۱۹۰۳ ع آج ایک قلم انگریزی اعلیٰ درجہ کا جس کے اندر روشنائی بھر کر ہر ایک شخص گھنٹوں لکھ سکتا ہے اور برخوردار مصطفےٰ علی بقیمت مبلغ ۲ روپیہ ولایت لندن سے لائے تھے اور التفات رسول کو دینا تجویز ہوا تھا، آج میں نے ان کو بھیج دیا؛ بہت خوش ہوئے۔

۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۰۳ ع آج سید حسن احمد اشراف ڈوله سے واضح ہوا کہ مہینہ ستمبر گزشتہ میں سید کرامت حسین پنشنر ڈپٹی کلکٹر نے اپنا عقد چہارم لکھنؤ اپنی منجھلی سالی سے کیا۔ یہ تین بہن تھیں بڑی کا عقد رائےبریلی میں ہوا اور چھوٹی کا ڈپٹی صاحب سے جو یکم فروری سنہ ۱۹۰۲ ع کو فوت ہوئیں اور منجھلی سے چوتھا عقد کیا۔ عمر ڈپٹی صاحب اکسٹھ سال ہے۔ چہرہ پر جھریاں پڑگئی ہیں۔ بازوؤں کی کھال لٹکتی ہے۔ کمر خمیدہ ہے۔ غذا بہت قلیل ہوتی ہے، دبلے و ضعیف ازحد ہیں۔ تند ہوا کے جھونکے سے اڑ جاسکتے

ہیں - حرارت غریزی کم پائی جاتی ہے - بظاہر یہ عقد ایام زندگی گھٹانے والا اور گویا مقام اچن ہے - خدا مبارک کرے -

۹ جنوری سنہ ۱۹۰۳ ع

کل مسمی گنیش ولد منشی کلوار موضع مہسونہ طاعون سے فوت ہوا - وہاں کے باشندوں نے اس کی لاش متوفی کے مکان پر بھیج دی - لاش پہنچنے پر اس کے چچا منو نے ممانعت کی کہ گھر کے اندر نہ ڈالی جائے جو تمام شب چبوترہ پر پڑی رہی - جب آج صبح کو مولوی ضامن علی محرر رجسٹری و دیگر ہمسایہ مسلمانوں کو اطلاع ہوئی تو وہ لوگ موقع پر گئے اور مالک متوفی سے استدعا کی کہ اگر وہ اجازت دیوے تو وہ لوگ قبر کھدواکر لاش کو دفن کرائیں - بوجہ اس کے کہ متوفی کے اعزا و اقارب کوئی شریک تجہیز و تکفین نہیں ہوئے تھے، آخرش بحالت مجبوری تین ہندو دو جوشی اور ایک امیر لاش اٹھانے کو بہم پہنچے - تب مادر متوفی نے چوتھا پایا خود اٹھایا اور جو قبر مسلمانوں نے کھدوائی تھی اس میں جاکر دفن کردیا - یہ مقام عبرت کا ہے کہ عزیز شریک نہ ہوں اور ماں اپنے بیٹے متوفی کی خود لاش لے جاکر دفن کرے اور جلوانے کا کوئی سوبیتہ نہ ہوسکے - اس بیماری کی نسبت جہاں تک غور کیا گیا، نوجوان خواہ مرد ہو یا عورت و لڑکے لڑکیاں زاید مریں اور مرتے ہیں -

۱۱ جنوری سنہ ۱۹۰۳ ع

آج آٹھ بجے صبح کو ہمارے محلہ کے چاروں طرف سورۂ یسین اس طور پر گشت کرکے پڑھی گئی کہ چوراہے ٹاؤن ہاؤس سے لوگوں نے پڑھنا شروع کیا اور جس مقام پر 'مبین' آیا وہاں سب نمازیوں نے سات سات اذانیں کہیں ـــــــ اور اس طور پر سات روز تک گشت ہوگا - خدا کرے کہ اس سورۂ یسین کی برکت سے طاعون سارے قصبہ ہذا سے دفع ہوجائے -

۱۶ جنوری سنہ ۱۹۰۳ ع

مکا بری کی لاش بذریعہ میونسپل کروادی گئی - اس کے اعزا نے متوفی کی مدد نہیں کی جو طاعون میں مرا تھا - یہ زمانہ ایسا ہے کہ عزیز قریب بھی طاعون کے ڈر سے لاش کے قریب آنا پسند نہیں کرتے -

۸ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ع | شب گزشتہ کو ایک لڑکا محلہ کسانوں میں عجیب الخلقت بخانہ فجو ولد جُمن کسان پیدا ہوا جس کا منہ لانبا، تھتھنی لٹکی ہوئی ہے۔ بجائے آنکھ کان کے کنتھی لگی ہوئی ہے۔ ٹھڈی و ناک نہیں۔ ہاتھ پیروں کی انگلیاں ندارد۔ پاؤں کے کٹوں میں ناخن نکلے ہیں اور چار دانت اوپر کے نمایاں ہیں۔ زبان نکلی ہوئی ہے۔ بدن مثل مچھلی کے سفنوں کے چٹخا ہوا ہے۔ جسم موٹا ہے جس کے مقابلے میں ہاتھ پیر پتلے ہیں۔ بکری کا دودھ اس کو پلایا جاتا ہے۔ تمام دن وہ زندہ رہا اور آٹھ بجے رات کو مرگیا۔

۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ع | سید سالار مسعود غازی رض ۱۷ شعبان سنہ ۴۲۲ھ مطابق سنہ ۱۰۲۳ع کو بھرائچ میں داخل ہوئے اور ۱۸ رجب سنہ ۴۲۴ھ مطابق سنہ ۱۰۳۴ع کو میردیو نے ان کو مع ان کی تمامی فوج کے قتل کیا اور سید سالار بھرائچ کے تالاب کے قریب جس پر سورج کا مندر تھا اور جس کو سالار اپنی آرام گاہ کے لیے بہت پسند کرتے تھے مدفون ہوئے۔ سید سالار ساہو کے بیٹے اور سلطان محمود کے بھانجے تھے۔

(باقی آیندہ)

سید شاہ کمال الدین

اس عنوان سے ایک مضمون «اردو» کے اپریل نمبر میں چھپا تھا۔ افسوس ہے اس میں طباعت کی کچھ غلطیاں رہ گئیں۔ صاحب مضمون نے اس میں حسب ذیل تصحیح و ترمیم فرمائی ہے۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ اس مضمون کو درست فرمالیں۔

صفحہ نمبر	سطر	
۲۶۳	(۱)	سید جمال الدین کے بعد ابن کمال الدین بخاری بڑھایا جائے۔
۲۶۵	(۱۸)	نبی انور کی بجائے نبی الوریٰ۔
۲۶۶		کی آخر سطر میں خلیل کی بجائے ضلیل بمعنی گمراہ۔
۲۶۸	(۱۹)	بجائے ۴ مرثیے کے ۸ مرثیے۔
۲۷۴	(۸)	بجائے دن کے «شب»۔
۲۷۵	(۴)	رباعی کا پہلا شعر یہ ہونا چاہیے:-

اے درد سبھوں سے برملا کہتا ہوں
توحید نہ میں چھپا چھپا کہتا ہوں

"	(۶)	بجائے «میں» کے «نا»۔
۲۷۶	(۸)	«سنگ شکر» کی بجائے «تنگ شکر»۔
"	(۲۱)	بجائے ۴ کے ۸ بنایا جائے۔
۲۷۷	"	بجائے «نہیں» کے «نین ہے»۔
۲۷۹	(۱)	بجائے «کیا» کے «نین بمعنی نہیں»۔
۲۸۰		اے عاشقاں سے ناحق رزم و قتال والی غزل کے تحت حاشیہ میں نشان بنا کر یہ لکھا جائے «یہ غزل قلمی نسخہ میں ہے مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے»۔

صفحہ نمبر	سطر	
۲۸۴	(۴)	«آسمان» کی بجائے «اسمان» بغیر مد کے ہونا چاہیے۔
"	"	حاشیہ میں نمبر ۱۰ کے تحت «ڈال کر» کی بجائے «بہا کر»۔
۲۸۶		کے حاشیہ میں نمبر ۱۲ کے تحت «لاان» کے معنی «معشوق» کے میں سابقہ معنی حذف کردیے جائیں۔
۲۸۷		کے حاشیہ میں نمبر ۱۲ کے تحت «کی روشنی» حذف کی جائے۔
"	"	اور نمبر ۱۴ کے تحت «دھن» کے بعد «معشوق خوش قسمت» حذف کرکے «دوست» لکھا جائے۔

(سخاوت مرزا)

تبصرے

تبصرے

ادب

محبت کا فسانہ

از لطیف الدین احمد۔ صفحات ۲۴۲۔ مجلّد قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ عظیم اطہر، محلہ منٹولہ۔ آگرہ

آج کل ادب لطیف اور رومان بےطرح بپھر رہا ہے۔ مگر محبت کا فسانہ اپنی خاص وضع کا ہے۔ دو بالغ اور خود مختار شخص اپنے تئیں اپنی پسند سے رشتہ ازدواج میں وابستہ کرتے ہیں۔ ان کی ذہنیتیں مختلف ہیں اور یہ ہونا ہی تھا کیوں کہ خصوصی طور پر تاہل کے متعلقات میں مرد اور عورت کا نقطۂ نظر ایک نہیں ہوسکتا۔ نیز یہ کی صورت تعلیم یافتہ اور اقتصاداً مختار شخصیتوں میں کم پیدا ہوا کرتی ہے۔ ان میں باوجود محبت کے سوال فتح اور شکست کا ہوا کرتا ہے اور یہی سوال مسٹر جمالی اور بیگم جمالی کے درمیان اٹھا۔ اس میں قصور کسی کا نہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ مسٹر جمالی عورت نہیں اور بیگم جمالی مرد نہیں۔ میاں بیوی کبوتر کا جوڑا۔ افہام و تفہیم ہو تو کس طرح۔ سمجھوتا کرائے تو کون؟ روح پر مادہ کا غلبہ۔ آخر مادّے ہی نے اصلاح کی صورت نکالی۔ ایک خوفناک حادثہ نے دونوں کے ذہنوں پر سے پردے اٹھادیے اور پھر دونوں عمر بھر کے لیے عاشق معشوق اور معشوق عاشق بن گئے۔ یہ ہے لب لباب اس کہانی کا۔

آج کل خود پسند بیاہوں کا میلان بہت ہے ۔ ہر بالغ مرد اور عورت کو اس کتاب کا مطالعہ اور اس سے سبق لینا چاہیے تاکہ تاہل کی زندگی میں غلط فہمیوں کا شکار ہونے سے بچیں ۔ خود گوئی یا متکلم تخیل اس ناول میں کئی جگہ ہے ۔ اور ہوتا ہی کیوں نہ یہ کوئی ناٹک تو ہے نہیں ۔ لیکن اس کی طوالت کہیں کہیں اکتانے والی ہے ۔

منظر کشی پر اختصار سے کام لیا گیا ہے اور یہ اچھا ہے ۔ اکثر افسانہ لکھنے والے اس کا لحاظ نہیں رکھتے ۔ مناظر کا اثر انسان کے ذہن پر ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے نفسیاتی حدود بھی ہیں اور جغرافی حدود بھی ۔ بعض کلمے اور مرکبات لطیف صاحب نے اختراع بھی کیے ہیں ۔ ان میں اکثر نہایت مناسب اور معقول ہیں جیسے 'خیال انداز' نظر انداز کے قیاس پر ۔ بعض کو ذوق سلیم قبول نہیں کرسکتا جیسے 'میکانکی طریق' (مصنوعی) ۔ 'نراجی' (ایذارکی) ۔ 'معاشری فوضویت' ۔ 'خرم لباس' ۔ 'معرفی کرانا' ۔ 'مسترحم لہجہ' ۔ 'کونر نواز پیار' ۔ بعض غریب الفاظ بھی ملتے ہیں جیسے سر کھدکنا ۔ پنبچل ۔ وغیرہ ۔ تذکیر و تانیث کے بارے میں بھی بیگم جمالی کی آزادہ روی کے نشان ملتے ہیں ۔ مثلاً 'نوالہ' اور 'تصنع' کی تانیث اور 'نم' کی تذکیر ۔

ان فرو گزاشتوں یا کاتبانہ اصلاحوں سے قطع نظر محبت کا فسانہ واقعی اسم بامسمےٰ ہے اور اپنے موضوع پر کئی پہلوؤں سے حقیقی روشنی ڈالتا ہے ۔ پلاٹ مکمل ہے کیوں کہ فاضل مصنف جو دنیائے صحافت کے دل ۔ احمد' ہیں ایک تجربہ‌کار افسانہ نویس ہیں ۔ قصہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے ۔

(ک)

روح غالب

(مرتبہ ڈاکٹر سید محی‌الدین صاحب زور' پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۔ صفحات ۲۴۰ ۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے)

یہ مرزا غالب مرحوم کے مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے ۔ مگر اس میں ان مکاتیب یا عبارات کو حذف کردیا گیا ہے جن میں علمی و فنی مباحث یا شخصی حوائج

کا ذکر تھا ۔ شروع میں مرزا صاحب اور ان کے کلام کی جو کتابیں شایع ہوئی ہیں، ان کا اجمالی تذکرہ اور مرحوم کے حالات زندگی درج ہیں ۔ چار احباب اور دو شاگردوں کا مختصر حال بھی داخل کردیا گیا ہے ۔ لیکن ان اجزا کی بجائے ہمارے خیال میں بہتر ہوتا کہ ان سب اشخاص کے مختصر حالات لکھ دیے جاتے جن کے نام کے خطوط اس مجموعہ میں شامل ہیں ۔ کتاب ادارہ ادبیات، حیدرآباد کی طرف سے اچھے کاغذ پر صاف ستھری چھپی ہے مگر کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں ۔

یہ کتاب محض تالیف یا انتخاب کی حیثیت رکھتی ہے جس میں کسی تحقیقات یا علمی تفحص سے کام نہیں لیا گیا ۔ لیکن زبان کے ایک مایۂ ناز ادیب کے حالات نیز کتاب کا دیباچہ لکھنے میں بھی، فاضل مولف نے صحت و فصاحت تحریر کا ایسا لحاظ نہیں رکھا جس کی ایک ادبی ادارے کی تالیف سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی ۔ امید ہے کہ کتاب کے مکرر چھپنے کی نوبت آئی تو ان اشارات پر توجہ فرمائی جائےگی ۔

(ہ)

مدراس میں اردو

(سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات ۔ مولفہ نصیرالدین ہاشمی صاحب
مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

اس کتاب میں اردو کے ان قدیم اور جدید شاعروں اور نثر نگاروں کا ذکر ہے جو مدراس میں پیدا ہوئے یا وہاں کے باشندے تھے یا مدراس میں آ کر بس گئے تھے ۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اردو ہندی کی طرح مدراس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اس کا رواج اور شوق قدیم سے چلا آرہا ہے اور اس خطے سے بڑے بڑے قابل شاعر اور ادیب پیدا ہوئے ہیں ۔ کتاب کے ایک باب میں وہاں کے رسالوں اور اخباروں اور انجمنوں کا بھی ذکر ہے ۔ آخری باب میں "میسور میں اردو" کا بیان ہے ۔ سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہد میں اردو نے جو ترقی کی اس کا مختصر ذکر ہے ۔ اہل مدراس و میسور کے لیے خاص کر یہ کتاب بہت بصیرت افروز ہوگی اور

اس کے پڑھنے کے بعد انھیں معلوم ہوگا کہ اردو زبان ان کے بزرگوں کی مقدس میراث ہے جس کی اشاعت و ترقی ان کا فرض ہے۔ (۱)

مطبوعات کتب خانہ علم و ادب، دهلی

۱. پھول والوں کی سیر

یہ وہ مشہور اور دلچسپ مضمون ہے جو مرزا فرحت‌اللہ بیگ صاحب نے رسالہ اردو کے لیے لکھا تھا۔ اب اس ادارے نے کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔

۲. تھوڑی تارا مانھے چاند

یہ پرانی رسم کی بہت دلچسپ کہانی ہے۔ اسے اشرف صبوحی صاحب نے بڑے سلیقے سے اچھی زبان میں لکھا ہے۔ قیمت دو آنے۔

۳. صبر بادشاہ زادہ

اس میں ایک تو صبر بادشاہ زادہ کا قصہ ہے اور دوسرا "چالاک بالشتیا" کا۔ یہ کتاب صبوحی صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔ قصے پرانے ہیں مگر نئے طرز سے لکھے گئے ہیں۔ قیمت دو آنے۔

۴. لعل شہزادہ

یہ لعل شہزادہ کا قصہ ہے اور آخر میں "چوھا اور مینڈک" کی کہانی ہے۔ صبوحی صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔ قیمت دو آنے۔

ان سب کہانیوں کی زبان ٹکسالی اور طرز بیان بہت دلچسپ ہے۔

تمثیلی مشاعرہ

(مرتبۂ جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب دہلوی، قیمت مجلد ایک روپیہ)

حضرت کیفی نے ایک خیالی مشاعرہ قائم کیا ہے اور یہ تمثیلی مشاعرہ گورنمنٹ کالج لائلپور میں منعقد ہوا۔ اس میں سودا، میر درد، میر تقی، جرات، مصحفی، انشا، آتش، نسیم، ناسخ، ذوق، مومن، غالب شریک تھے۔ بظاہر یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ سودا، درد اور میر تقی کے مشاعرے میں ذوق اور غالب شریک ہوں۔ لیکن کیفی صاحب انھیں عالم بالا سے کھینچ لائے ہیں۔ تعجب ہے کہ یہ بزرگ ان کے کہنے سے کیسے رضامند ہوگئے۔ تمثیل میں ان بزرگوں کے لباس اور وضع قطع کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ ہر شاعر اپنی اپنی غزل پڑھتا ہے لیکن اس میں بڑا کمال مصنف نے یہ کیا ہے کہ اشعار پر جو داد دی گئی ہے اس سے ہر استاد کا رنگ طبیعت نمایاں ہوتا ہے۔ کہیں کہیں کسی استاد نے اصلاح بھی دی ہے، پھر اس اصلاح پر جو تنقید کی گئی ہے وہ بہت ہی پُر لطف ہے اور اس تنقید کے ادبی نکات نے اس لطف کو اور بڑھا دیا ہے۔ انتخاب کلام بھی بہت اچھا کیا ہے۔ جو اصحاب ذوق ادب رکھتے ہیں ان کے پڑھنے کے قابل ہے۔

کلیات بحری

(مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید ایم-اے، پی ایچ-ڈی، ڈی لٹ۔
الہ آباد یونیورسٹی۔ قیمت تین روپے)

بحری بارھویں صدی کے دکنی شاعر ہیں۔ یہ اورنگ زیب کا عہد تھا۔ یہ کوگی کے رہنے والے تھے جو اس وقت سرکار نظام کے علاقہ میں ہے۔ ان کا شمار اس زمانے کا صوفیا میں ہے اور کوگی میں اب تک ان کا عرس ہوتا ہے۔

بحری کا کلام اب تک بالکل نایاب تھا۔ ڈاکٹر سید محمد حفیظ صاحب نے اب بڑی محنت اور کاوش سے مرتب کرکے طبع کرایا ہے۔ دیوان مختصر ہے یعنے

اس میں کل ایک سو تیرہ غزلیں ہیں۔ ان کے علاوہ چند چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں اور ایک بنگ نامہ ہے۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے ۱۲۱ صفحے کا دیباچہ لکھا ہے جس میں بہت سی غیر ضروری بحثیں آگئی ہیں اور پھر ان کو بھی ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے مثلاً بحری کے ہم عصر شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے انتخاب کی مطلق ضرورت نہ تھی کیونکہ اس پر مستقل کتابیں موجود ہیں اور یہ حالات بھی انھیں سے نقل کیے گئے ہیں۔ دیباچے کے باب پنجم میں کلام بحری کی چند خفی اور اسانی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ یہ خصوصیات بحری ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام دکنی شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں یا مثلاً کتاب من لگن کے تمام عنوانات کی تصریح اور پھر ان کے مضامین کی تفصیل میں تقریباً تیس صفحے رنگے گئے ہیں جس کی اس موقع پر مطلق ضرورت نہ تھی۔

دیباچے کے باب دوم میں شعرا کے تذکروں کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ نکات الشعرا کو تو انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے لیکن فتح علی گردیزی اب تک طبع نہیں ہوا۔ یہ صحیح نہیں ہے تذکرہ گردیزی کو طبع ہوئے تقریباً چھ سال ہوتے ہیں اور یہ بھی انجمن ہی نے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ جن تذکروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی انجمن شائع کرچکی ہے۔ یعنے مخزن نکات، چمنستان شعرا، گلزار ابراھیم وغیرہ۔

بحری کی اصلی کتاب جو بہت زیادہ مقبول ہوئی اور جو بارہا چھپ چکی ہے (اور بعض اڈیشن فرہنگ کے ساتھ چھپے ہیں) وہ من لگن ہے۔ ان کی غزلیات کو یہ قبولیت حاصل نہیں ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ من لگن کے مقابلے میں ان کا دیوان بہت پست ہے۔ غزلیات میں انھوں نے حد سے زیادہ لفظی رعایت، تجنیس اور ایہام وغیرہ کا خیال رکھا ہے اور اس لیے یہ کلام تصنع اور تکلف سے بھرا ہوا ہے اور یہی وجہ اس کے مقبول نہ ہونے کی ہے۔

فاضل مرتب نے دیوان کے صحیح پڑھنے اور مرتب کرنے میں بہت محنت کی ہے۔ جو جو اشعار مشکل ہیں (اور ایسے بہت ہیں) ان کے معنی حاشیہ میں لکھ

دیے ہیں اور کتاب کے آخر میں الفاظ کے معانی کی ایک فرہنگ بھی شامل کردی ہے لیکن باوجود اس کے اکثر اشعار کے صحیح پڑھنے اور معانی و مطلب بیان کرنے میں غلطیاں ہوگئی ہیں۔ سر سری طور پر مطالعہ کرنے میں جو غلطیاں نظر آئیں وہ بھی کچھ کم نہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ پہلی ہی غزل میں دوسرا شعر ہے (صفحہ ۱۲۳)

جیو کوں ماٹی میں سٹ اس من کون نیچاپا سو تونچہ
آد مورت پرورش پانے کوں من معدن ہوا

پہلے مصرع میں لفظ "نیچاپا" صحیح نہیں ہے بلکہ "نپچاپا" ہے جس کے معنے کے خلق کرنے یا پیدا کرنے کے ہیں۔ یہ جو کتاب میں معنے بیان کیے گئے ہیں کہ "روح کو مٹی میں پھینک کر اسے نیچے لایا" مہمل ہیں۔ "نپچایا" کے معنے بالکل صاف اور صحیح ہوجاتے ہیں، یعنے مٹی سے پیدا کیا۔ کاتب نے یا پڑھنے والے نے اسے غلطی سے "نیچاپا" سمجھا۔ نپچانا قدیم دکنی اردو میں عام لفظ ہے۔

راس بن آیا تو مل بیٹھے ہس پوچھیں کے سو کیا
یاں کے بھٹ شکر کوں سٹ گڑ مانگتے ہیں فال کیا (۱۳۱)

دوسرے مصرع کے معنے یہ لکھے ہیں۔ "یہاں کے بھٹ برھمن (جوتشی) فال نکالتے وقت شکر کی جگہ گڑ مانگتے ہیں"۔ یہ کیا بات ہوئی؟ اس غزل میں ایک دوسرا شعر ہے۔

جیو لے گُڑ دے کہے تو لب شکر یوں بولتے
نسٹ کر کیوں دیوں میں یو مال ہے بقال کیا

قابل مرتب کی تشریح کے مطابق پہلے مصرع کے معنے یہ ہوں گے کہ "دل لے کر گُڑ دے" جو بالکل مہمل ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ قدیم دکنی اردو میں گڑ دینا کے معنے بوسہ دینے کے ہیں۔ اور اس سے معنے ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ بحری کو رعایت لفظی اور ایہام کا خبط ہے، اس لیے وہ گڑ، لب شکر، بقال، مال وغیرہ کے لفظ لایا ہے۔ ورنہ دل لے کے گُڑ دینا مضحکہ خیز بات ہوگی۔

مُہن کے من کی سختی کا جو مضموں بولنے منگتا (۱۳۲)

"بولنے منگتا" کے معنے "کوئی مجھ سے پوچھتا" لکھے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کے دل کی سختی کا جو مضمون میں بولنا چاہتا۔ منگنا کے معنے چاہنا کے ہیں۔ انگریز اب تک یوں ہی بولتا ہے۔ "ویل تم کا منگتا ہے"

کدا نا جان تر تارا نیں کوں

تو کھینچے منج یہ سو کے کا کٹارا

دوسرے مصرع کے معنے حاشیہ میں لکھے ہیں "تو نے مجھے زہرہ (سوک) کے کٹارا کھینچ مارا" زہرہ کا اس شعر سے کوئی تعلق نہیں۔ "سوکا" دکن میں ایک قسم کا سنگار ہوتا تھا۔ وہ سرمے کا ایک خط ہوتا تھا جو آنکھ سے زلف تک کھینچ دیا جاتا تھا۔ یہاں یہ اسی خط سے مراد ہے اور اسے کٹار سے تشبیہ دی ہے۔

مس جنوں عزا ہے عزت دے نکو، رکھ سر پہ لات

لات بھی لائق نہیں ہے بن مکھی ہور لات کچھ

پہلے مصرع میں "عزا" کو غلطی سے عزّا پڑھ لیا گیا ہے اور اس کے معنے غرور کیے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ بحری کو جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، رعایت لفظی اور ابہام کا خاص شوق ہے۔ اسی لیے وہ اس شعر میں لات اور عزا دونوں لایا ہے۔

تجھ کچھ کی صفت میں سکی بھی کچھ تو کہوں کیا

نارنگ تے کھٹ ہے نپٹ انار تے نازک

یہ شعر سینے یعنی پستان کی تعریف میں ہے۔ "نارنگ تے کھٹ" کے جو یہ معنے لکھے گئے ہیں کہ "وہ نارنگی سے کم ہے"۔ صحیح نہیں۔ کھٹ کے معنے دکنی میں پکے مضبوط اور سخت کے ہیں۔ اب معنے صاف ہوجاتے ہیں یعنے نارنگی سے سخت اور انار سے نازک۔

اس مان آسمان دیا جن جو نیں کیا

ہر رنج کو سراپ، ہر آرام کو سلام

اس شعر میں "اس مان" کے معنے "اُس طرح" لکھے ہیں۔ اس لیے شعر کا مطلب بالکل خبط ہوجاتا ہے بلکہ کچھ معنے ہی نہیں بنتے۔ یہاں مان کے معنے عزت و وقار کے ہیں۔

هزار رنگ و لیکن او یک ہے درویشی
جہ فرق ہے تو یہی ہر یکس کے باتاں میں

دوسرے شعر کا مطلب یوں بیان کیا گیا ہے "اگر کوئی فرق ہے بھی تو ہر شخص کی بانوں (باتاں) میں ہوتا ہے اور بس"۔ اول تو یہ لفظ باتاں نہیں بلکہ باناں ہے جیسا کہ متن لکھا ہے اور یہ بانا کی جمع ہے جس کے معنے واضع کے ہیں۔

پر کٹ بُرا مانے کپٹ بل گے سو کو وہ کون تھے

اس مصرع کے معنے یہ لکھے ہیں "وہ اسے برملا سُن کر برا مان گئے اور چال باز (کپٹ) جو جل بھن گئے۔ یہ بتا وہ کون تھے"۔ اول تو "کپٹ" کے معنے چال باز نہیں۔ "کپٹ" اسم ہے صفت نہیں۔ دوسرے قرینہ اور بحری کا انداز بیان اس کے خلاف ہے۔ یہ لفظ کپٹ نہیں بلکہ کپت ہے جس کے معنے پوشیدہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو برا مان گئے لیکن باطن میں جل بھن گئے۔

فقیر او جو طمع طوق ہے سو کاڑ سٹے
اپس گلے سوں نہ کنتھا گلے میں پھاڑ سٹے

اس کے معنے یہ لکھے ہیں "فقیر وہ ہے جو اپنے گلے میں سے حرص و طمع کا طوق نکال کے پھینک دے اور اپنے گلے کے ڈورے (کنتھا) کو گلے ہی میں پھاڑ کے پھینک دے"

قابل مرتب نے دوسرے مصرع میں حرف نفی "نہ" کا خیال نہیں کیا جس سے معنے الٹے ہوگئے۔ مطلب یہ ہے کہ فقیر وہ ہیں جو اپنے گلے سے طمع کا طوق نکال پھینکے نہ وہ جو گلے میں کا کنتھا توڑ کے پھینک دے۔

ایک پل منے بُھٹ مغز ہوا دانا دانا
یک ہات جو اس جسد کے سر پر چھوڑے

یہ مسلسل غزل کا شعر ہے اور اس میں ایک بزرگ سید محمد وارث کی وفات کا ذکر ہے۔ فاضل مرتب نے اس کے یہ معنے لکھے ہیں "جب آں جناب نے کوڑ مغز سر پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ بھی دانا ہو گیا"۔ یہ بالکل مہمل ہے۔ اس کے ساتھ کا دوسرا شعر جو قطعہ بند ہے یہ ہے۔

یعنی اپے اپس جزو نے تیں کل میں ڈبائے
اپنے اپے او بڑا سمد میں پھوڑے

اس شعر میں پہلے شعر کی تصریح کی ہے۔ اب ان معنوں کو جو بیان کیے گئے ہیں اس سے ملائیے تو کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ اصل یہ ہے کہ "دانہ دانہ" کے معنے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ اس کے معنے دانا کے نہیں بلکہ دانہ دانہ ہو جانے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جو ہاتھ جسم پر ڈالا تو مغز پھوٹ کر دانہ دانہ (ریزہ ریزہ) ہو گیا۔ یعنے اپنے جز کو کل میں ملا دیا اور اپنے بلبلے کو سمندر میں جا پھوڑا۔

چولے لوں خرابات کے چہلا میں چتر کر (۲۲۷)

مرتب صاحب نے چولے کے معنے چہلے لکھے ہیں۔ میری رائے میں یہ صحیح نہیں۔ "چولے" کے معنے لباس کے ہیں۔ ورنہ چولے کو میکدہ کی شراب میں رنگنے سے کیا مطلب؟۔ اسی سے چولا بدلنا اردو کا محاورہ ہے۔

پانی نیر نین کا ہور قوت دم ہوا (۲۳۱)

اس کے معنے یہ بیان کیے گئے ہیں "بجائے پانی کے آنکھ کا پانی (نیر) دم کی غذا بن گیا ہے۔"

میری رائے میں یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ اس کا پہلا مصرع یہ ہے:۔

"اس دکھ ہر بشر کوں نہ پانی نہ کھان ہے"

اس میں پانی اور غذا دونوں کا ذکر ہے اور ان دونوں کی تصریح شاعر نے دوسرے مصرع میں کی ہے۔ یعنے پانی تو آنکھ کا نیر یعنے آنسو ہے اور غذا خون ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر بشر کے لیے پانی اور غذا بغیر دکھ کے نہیں ہے۔ پانی تو آنسو ہے اور خون غذا ہے۔

بعض جگہ جہاں مطلب سمجھ میں نہیں آیا تو فاضل مرتب نے صاف لکھ دیا ہے کہ سمجھ میں نہیں آیا۔ ایسے مقامات میں سے صرف ایک کا ذکر کرتا ہوں جو بہت دلچسپ ہے۔ بحری نے ایک پھل کی چیستان لکھی ہے ' اس پھل کے تمام صفات اور اتے پتے تفصیل سے لکھے ہیں لیکن نام نہیں بتایا۔ نام کو دو شعر میں ایک معمے کی صورت میں لکھا ہے۔ وہ شعر یہ ہیں:-

اگر پوچھے جو اس پھل کا ہے کیا ناٗنوں
نہ مرغا بل کچپک لکڑی میں ہے چھاٗنوں
پڑیے گا پیش کی جاگے زبرنوں
تو پاگا ناٗنوں اس کا سربسرنوں

مرتب ڈاکٹر صاحب نے حاشیہ میں لکھا ہے "کہ ان دونوں شعروں میں نام کا کچھ حل بتایا ہے مگر پہلے شعر کا دوسرا مصرع ہی حل ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے"۔

اس میں کچھ مشکل نہیں، صرف ذرا غور کرنے کی بات ہے۔ اس مصرع میں لفظ "لکڑی" نہیں بلکہ "ککڑی" ہے یا تو کاتب کی غلطی ہے یا پڑھنے میں سہو ہوا ہے۔ اب حل دیکھیے۔ وہ کہتا ہے کہ لفظ کو بجائے کاف کے پیش کے کاف کے زبر سے پڑھیے تو وہ ککڑی ہوا اور یہی وہ پھل ہے جس کی اس نے چیستان لکھی ہے۔ لیکن سوال یہ ہوگا کہ اس مصرع میں یہ "مرغا" کیسا۔ یہ بحری کا وہی خبط ہے جو دیوان میں شروع سے آخر تک پایا جاتا ہے اور کوئی شعر لفظی رعایت اور ایہام سے خالی نہیں۔ ککڑی (بضم کاف) کے معنے مرغی ہوتے ہیں۔ کہتا یہ ہے اگر تم اس پھل کا نام پوچھنا چاہتے ہو تو وہ مرغا نہیں بلکہ کسی قدر ککڑی یعنے مرغی کی چھاٗنوں میں ہے۔ اب وہ چھاٗنوں کیا ہے۔ وہ چھاٗنوں کاف کا پیش ہے۔ اگر پیش کو زبر سے بدل دو تو ککڑی (بفتح کاف) اس پھل کا نام ہے۔

یہ چند شعر وہ ہیں جو سرسری مطالعہ میں میری نظر پڑ گئے۔ ورنہ ابھی بہت سے ایسے شعر ہوں گے جن کی صحت اور تشریح کی ضرورت ہے یا جو صحیح نہیں پڑھے گئے ہیں۔ اس کے لیے فرصت درکار ہے جو افسوس ہے کہ اس وقت مجھے حاصل نہیں۔

باوجود اس کے ہم ڈاکٹر صاحب کے بہت شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے کلام کو جو اب تک ناپید تھا بڑی جستجو سے مہیا کرکے شایع کردیا اور پرانی دکنی زبان کے شائقین کے لیے بہت اچھا سامان فراہم کردیا۔ (ا)

تاریخ و سیر

اتاترک

شایع کردہ کتب خانہ علم و ادب، دہلی

اس کتاب میں محمد مرزا صاحب دہلوی نے اتاترک غازی مصطفیٰ کمال کے حالات زندگی بڑی محنت اور گہرے مطالعہ کے بعد لکھے ہیں اور یہ غازی اعظم کی تمام و کمال سوانح عمری ہے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو اور اس کے ہر کارنامے سے بحث کی ہے۔ آخری باب میں اتاترک کی سیرت کی بہت ہی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ایسی جامع کتاب اب تک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی تھی۔ حجم تقریباً تین سو صفحے ہے۔

قیمت مجلد دو روپے۔

(ا)

متفرقات

مصنفین اردو کی تصویروں کا البم

(مرتبہ سید زوار حسین صاحب۔ حالی پبلشنگ ہاؤس
، کتاب گھر، دہلی قیمت پانچ روپے)

حالی پبلشنگ ہاؤس بہت اچھا کام کررہا ہے اور اس نے بعض بہت اچھی اچھی کتابیں شایع کی ہیں۔ یہ البم بھی اسی نے شایع کیا ہے۔ اس البم میں اردو کے چوٹی

کے ادیبوں، مفسرین، ناقدین، مترجمین، ناول نگاروں، افسانہ نویسوں، شعرائے متقدمین، شعرائے متوسطین، شعرائے متاخرین، شعرائے جدید، مزاحیہ نگاروں، مورخین، سوانح نگاروں، فلسفیوں، سیاست دانوں، طبیبوں، معاشین کی نہایت عمدہ اور نفیس عکسی تصویریں ہیں۔ ایک دو تصویروں کے متعلق مجھے شبہ ہے۔ میرتقی میر اور مصحفی اور میردرد کی تصویریں نہ معلوم اصلی ہیں یا محض قیاس سے بنالی گئی ہیں۔ یہ البم ہر کتب خانے میں اور صاحب ذوق کے پاس رہنے کے قابل ہے۔ جن صاحبوں کو ان مصنفین کے حالات، ان کی تصانیف اور ان کے کلام کی تنقید دیکھنے کا شوق ہو وہ «مصنفین اردو» نامی فہرست حالی پبلشنگ ہاوس، کتاب گھر، دھلی سے منگا کر اپنا شوق پورا کریں۔ یہ فہرست ۲۳۲ صفحے کی ہے۔ باتصویر فہرست دو آنے میں ملتی ہے اور بلا تصویر مفت۔ یہ فہرست بھی رکھنے کے قابل ہے اور مصنفین کے حالات اور کلام کی تنقید بڑی خوبی اور سلیقے سے لکھی ہے۔ (ا)

—o—

اُردو کے جدید رسالے

ھمالیہ۔

یہ رسالہ ماھانہ ہے اور بمبئی سے نکلنا شروع ھوا ہے۔ اس کے اڈیٹر منال قریشی، رشید طلعت دھلوی اور ٹھاکر سورج پال ھیں۔ مضامین مختلف نوعیت کے ھیں۔ مثلاً طبی، ادبی، فلمی وغیرہ۔ ان کے علاوہ اور بہت سی کارآمد باتیں درج رھتی ھیں۔ قیمت سالانہ ایک روپیہ ہے۔ ایک روپیے میں یہ رسالہ بہت سستا ہے۔ رسالہ دلچسپ اور مفید ہے۔

خاص نمبر

رسالہ ہمدرد صحت دہلی

(سہ ماہی و ضبط تولید نمبر۔ مرتبہ جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی۔
ملنے کا پتہ ہمدرد منزل دہلی۔ قیمت بارہ آنے)۔

رسالہ کا یہ نمبر سو صفحات کے قریب حجم کی ایک کتاب ہے جس میں ضبط تولید کے مسئلہ پر ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ علمی، مذہبی، سماجی، عملی اور ادبی ہر نقطہ نظر سے اس میں [illegible] کی گئی ہے فاضل مرتب نے اطبا کے مجرب نسخے بھی نہیں بتائے [illegible] آج کل کے اہل دنیا کی رائے اور خیالات بھی اس بارے میں موجود ہیں۔ [illegible] ضبط تولید کا عمل جو مضرتیں پیدا کرتا ہے [illegible] صحت [illegible] اور سائنس کے پہلو سے اگر یہ نمبر معلومات اور [illegible] ہے تو صحافت اور طباعت کا بھی یہ نمبر نمونہ ہے [illegible] اور تصویریں بھی موقع بہ موقع دی ہیں جن سے اس مسئلہ کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ معاشی مسائل پر بھی جو آبادی کی کمی بیشی سے تعلق رکھتے ہیں کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ اس مسئلے پر ہر قسم کا مسالہ [illegible] فراہم کر دیا ہے کہ اسے پڑھ کر بہت سی متعلقہ کتابوں کا مطالعہ غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ ابواب کی تقسیم اور مندرجات کی ترتیب میں نہایت دقت نظر سے کام لیا گیا ہے۔ یوں تو ہمدرد صحت کا ہر نمبر اپنی جگہ دلچسپ اور مفید معلومات کا حامل ہوتا ہے مگر یہ خاص نمبر اردو صحافت اور ادارت کی انفس مذاقی کا ایک بلند معیار قائم کرتا ہے۔ اس کے باوجود قیمت کچھ بھی نہیں۔

(ک)

اردو

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر — عبدالحق

شائع کردہ
انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

اُردو

۱۔ یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر زیادہ۔

۳۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپے۔ نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

۴۔ مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۰ دریاگنج دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے۔

المشتہر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

نرخ نامۂ اجرت اشتہارات 'اردو' و 'سائنس'

کالم	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
دو کالم یعنی پورا ایک صفحہ	۸ روپے	۳۰ روپے
ایک کالم (آدھا صفحہ)	۴ روپے	۱۵ روپے
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۲ روپے ۴ آنے	۸ روپے

جو اشتہار چار بار سے کم چھپوائے جائیں‌گے ان کی اُجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے۔ البتہ جو اشتہار چار یا چار سے زیادہ بار چھپوایا جائےگا اس کے لیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اُجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد۔ منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے۔

المشتہر منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

اُردُوْ

جلد ۱۹ | اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء | نمبر ۷۶

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)

کا

سہ ماہی رسالہ

مقام اشاعت:- دہلی

عبداحمد ایم۔اے نے لطیفی پریس دهلی میں چھپواکر
انجمن ترقیٔ اردو (هند) دهلی سے شایع کیا۔

اُردُو

اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ ع

فہرستِ مضامین

بنیادی هندستانی کے الفاظ

از
محمد اجمل خاں ایم - اے

هندستان کے هر شہر میں هندستانی سمجھی جاتی هے اور شمالی هندستان کے شهروں کے رهنے والوں کی تو یه مادری زبان هے۔ یه هندستان کی قومی زبان مانی جاتی هے اور سوائے جنوبی هندستان کی زبانوں کے، هندستان کے مختلف حصوں کی بولیوں اور زبانوں سے بہت زیادہ ملتی جلتی هے۔ اس میں سنسکرت، عربی، فارسی اور یوروپین زبانوں کے لفظ کثرت سے پائے جاتے هیں۔ لیکن ان کے بولنے کا طریقه هندستانی هوگیا هے اور بہت سے لفظ تو اتنے بدل گئے هیں که یه بتانا مشکل هے که وہ سنسکرت هیں، عربی هیں یا فرنگی۔ گویا وہ سب هندستانی هوگئے هیں۔

هندستان میں بہت سی زبانیں اور سیکڑوں نہیں هزاروں بولیاں رائج هیں۔ اس لیے اگر کوئی هندستانی ان سب بولیوں کو سیکھنا چاهے تو اس کی عمر کافی نه هوگی۔ خود هندستانی زبان میں پانچ چھے لاکھ لفظ موجود هیں۔ ان میں سے عام آدمی کا کام پانچ چھے سو لفظوں سے چل جاتا هے۔ لیکن جہاں کسی ادبی یا علمی مضمون سے کام پڑتا هے وهاں نئے نئے لفظوں کی انتہا نہیں رهتی۔ اس حالت میں ایک معمولی لکھا پڑھا آدمی خود اپنی زبان سمجھنے کے لیے ڈکشنری ڈھونڈھنے لگتا هے اور جن کی زبان هندستانی نہیں هے انھیں تو اور بھی مصیبت کا سامنا هوتا هے۔ غرضکه هندستانیوں کو دو بڑی مشکلیں سر کرنی هیں۔ پہلی تو یه که هندستانی زبان کے هزاروں لاکھوں لفظوں میں سے ایک هزار کے لگ بھگ ایسے لفظوں کا چننا جن میں روزمرہ کی بات چیت، کاروبار، پڑھنا لکھنا سب کچھ هوسکے تاکه ان لفظوں

لیے سیکھنے اور بولنے میں دوسرے صوبوں کے لوگوں کو آسانی ہو۔ دوسری مشکل یہ دور کرنی ہے کہ خود ہندستانی بولنے والوں کی تعلیم کے لیے ایک سہل اور آسان زبان کا معیار مقرر ہوجائے تاکہ ان محنت پیشہ اور کاروباری لوگوں کو تھوڑے سے وقت میں اتنی زبان آ جائے کہ وہ ادبی و علمی شاہکاروں کے ترجمے پڑھنے میں آسانی محسوس کریں۔ اگر وہ مثلاً دیوان غالب پڑھنا چاہیں تو ایک ہزار لفظوں کے ذریعہ سے ان چیزوں کا ترجمہ ہوسکے اور وہ سمجھ سکیں۔

اس کوشش میں دو چیزوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ اول یہ کہ ہم کوئی نئی زبان نہیں بنانا چاہتے بلکہ ہندستانی زبان کے رائج لفظوں کو ایک ہزار یا اس سے کم لفظوں میں محدود کرنا چاہتے ہیں۔ دوم یہ کہ ہمارا منشا بین صوبجاتی (Inter-Provincial) زبان کو ترقی دینا ہے۔ اس لیے لفظوں کے چننے میں اس بات کی پروا نہ کی جائے کہ ان کا پرانے زمانے میں سنسکرت سے تعلق تھا یا عربی سے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ عام رواج کی مہر کن لفظوں پر لگ چکی ہے۔

بنیادی انگریزی کا یہ دعوی ہے کہ سنہ ۲۰۳۰ء تک یہ بین الملی یعنی (International) زبان ہو جائے گی۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی کتاب (The Shape of Things to Come, 1933.) میں یہ پیشین گوئی کردی ہے اور بڑے اہتمام سے بنیادی انگریزی کی ہر ایک کتاب میں یہ الفاظ درج کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں سیاسی اقتدار کے زعم میں کہی جارہی ہیں؛ غیر انگریزی قوموں کو اس زبان سے وہ دلچسپی نہیں جو فرنچ یا جرمن سے ہے۔ فرانس کی زبان یوروپ کی فارسی ہے۔ اس میں جو شیرینی اور سلاست ہے وہ کسی یوروپین زبان میں نہیں۔ جرمن زبان سائنس کی خزانہ دار ہے اور کسی سائنس والے کو اس کے بغیر چارہ نہیں۔ لہذا ہم انگریزی کی طرح یہ دعویٰ تو نہیں کرنا چاہتے کہ ہم ابھی ہندستانی کو انٹرنیشنل زبان بنانا چاہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی زبان انٹرنیشنل زبان بننے کی بہت زیادہ اہلیت رکھتی ہے اور ہندستان آنے والوں کو بہت آسانی سے یہ زبان آجاتی ہے اور جہاں جہاں تجارت یا مذہبی ضرورتوں کے لیے ہندستانی جاتے

ہیں وہاں کے باشندے ہندستانی زبان سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ، ماریشش فیجی، جاوا، افغانستان، برما، تبت، ہانگ کانگ میں تاجروں کے ذریعہ سے اور ایران، عراق، حجاز، فلسطین اور شام میں زائروں اور حاجیوں کے ذریعہ سے ہماری زبان پہونچ گئی ہے۔ لیکن باوجود اس کے آج ہم یہ نہیں چاہتے کہ اپنی زبان کو اس طرح انٹرنیشنل بنائیں کہ فارسی، عربی یا جاوی لفظوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کریں اور بےضرورت ایسے لفظوں کو بنیادی ہندستانی میں داخل کریں جو خود ہمارے ملک میں عام طور پر رائج نہیں۔

بنیادی ہندستانی میں کتنے لفظ ہوں؟

ہمارا روزمرہ کا کار و بار سات آٹھ ہزار لفظوں سے چلتا ہے۔ لیکن بنیادی انگریزی لکھنے والوں نے دس سال کے تجربہ کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کام چلانے کے لیے آٹھ نو سو لفظوں کے بغیر چارہ نہیں۔ ہم بھی اس تجربہ کی بنا پر یہ کرسکتے ہیں کہ بنیادی انگریزی کی طرح ۸۵۰ لفظوں کا انتخاب کریں۔ ان لفظوں میں اگر سو انٹرنیشنل لفظ اور پچاس کسی مخصوص سائنس کی اصطلاحیں شامل کرلی جائیں تو ہم سائنس کا رسالہ آسانی سے نکال سکتے ہیں۔ گویا صرف ایک ہزار لفظوں میں ہم سب کچھ کہہ سکیں گے۔

ساڑھے آٹھ سو انگریزی لفظوں کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ایک گھنٹے میں تیس لفظ یاد کیے جاسکتے ہیں۔ اس طرح ایک ایسا شخص جس کی زبان انگریزی سے بہت زیادہ مختلف نہ ہو اگر ایک گھنٹہ روزانہ لفظوں کو سیکھے تو تیس گھنٹوں یعنی ایک مہینے میں پورے لفظ سیکھ سکتا ہے۔ اگر اس دعوے میں کچھ بھی حقیقت ہے تو ہم پورے بھروسے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی ہندستانی کے ۸۵۰ لفظوں کو ہندستان کے مختلف غیر ہندستانی بولنے والے صرف ۵ گھنٹوں میں یاد کرسکتے ہیں۔ اس کے دو سبب ہیں:—

پہلا سبب تو یہ ہے کہ ہندستان کی جتنی زبانیں اور بولیاں ہیں ان میں بنیادی لفظ تقریباً یکساں ہیں۔ صرف تلفظ کا فرق ہے جو آسانی سے ہندستانی زبان کے معیار پر آسکتا ہے اور جس طرح بنیادی انگریزی کے گراموفون ریکارڈ بنائے گئے ہیں اسی طرح پندرہ منٹ میں پورے ہندستانی لفظ سنے جاسکتے ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ گوتم بدھ کی انقلابی تحریک نے ہندستانیوں کو ذات پات کے بندھنوں کے توڑنے میں بہت مدد دی تھی اور ہندستانیوں میں متحدہ قومیت کو بڑھا کر بین الاقوامیت تک پہنچادیا تھا۔ مسلمانوں کا دور شروع ہونے سے پہلے اگرچہ قدامت پرستی نے پھر پیر جمالیے تھے لیکن پھر مساوات انسانی کا سبق دھرایا جانے لگا تھا اور شہنشاہی دربار کے علاوہ صوبوں کے حکام نے بھی ملکی بولیوں کو ترقی دینی شروع کی تھی۔ قدرتاً وہ بولی جو دھلی یا آگرے سے قریب تھی ہندستان کی عام زبان بننے لگی اور کبیر، نانک اور دادو کی قسم کے بزرگوں کو بے جھجکے اپنے جذبات کے اظہار کا موقع ملا۔ اس طرح "ہندستان" کی بولی پورے ہندستان میں پھیلنے لگی۔

لہذا اگر ہم ہندستان کی مختلف زبانوں کا مطالعہ کریں تو وہ زبانیں جو دھلی یا آگرے سے اثر پذیر ہوئی تھیں ان میں ایک خاص یکجہتی پائیں گے۔ صرف تلفظ اور کسی قدر گرامر کا اختلاف ہے جو چند گھنٹوں کی محنت میں دور ہوسکتا ہے۔ یعنی ہم مختلف صوبوں کے باشندوں کو ایک ہفتہ میں ہندستانی زبان اور گرامر سکھا سکتے ہیں۔

معمولی هندستانی بولنے والوں کے لیے بنیادی هندستانی کے فائدے

پوچھا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان ہندستانی ہے انھیں بھی بنیادی ہندستانی سیکھنا چاہیے یا نہیں۔ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے کہ نہ صرف

سیکھنا چاہیے بلکہ جہاں تک ممکن ہو آپس میں اسی کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس سے ایک بہت بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ دماغ پر بلاوجہ ہزاروں لفظوں اور گرامر کے مشکل اصولوں کا بار نہ پڑےگا اور ہر ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی ہرقسم کی علمی اور ادبی معلومات سے فائدہ حاصل کرسکےگا۔ بچے بھی زبان کی پیچیدگیوں سے بچ جائیں گے اور تیزی سے علموں اور فنون کو حاصل کرنے لگیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جب اس قسم کا کافی لٹریچر بن جائےگا تو غیرہندستانی بولنے والوں کو اس زبان کے سیکھ لینے میں کوئی مشکل باقی نہ رہےگی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ایچ۔جی۔ولز کی طرح پیشین‌گوئی کی جائے تو سنہ ۲۰۲۰ع میں نہیں بلکہ صرف بیس سال کے اندر یہ زبان ہندستان کے گاؤں گاؤں میں پھیل جائےگی۔

لیکن جہاں تک شعر و شاعری اور اونچے درجہ کی ادبی تصنیفات کا تعلق ہے وہ معمولی ہندستانی میں جاری رہیں‌گی تاکہ ہندستانی زبان کا فطری نشو و نما جاری رہے۔ اس لٹریچر کے سمجھنے کے لیے ایک ایسی لغت کی ضرورت ہوگی جو معمولی ہندستانی کے لفظوں کو بنیادی ہندستانی میں بیان کردے۔ بالفعل سات آٹھ ہزار معمولی لفظوں کی لغت بنیادی ہندستانی میں تیار کی جارہی ہے۔

لغت اور محاورات

شروع میں صرف سات آٹھ ہزار ایسے لفظوں کی لغت تیار کی جارہی ہے جو عام ادبی اور اخباری لفظوں پر حاوی ہو۔ لیکن اس سلسلے میں سینکڑوں لفظ ایسے مل رہے ہیں جو ہندستان کی مختلف ہندیوں میں تھوڑے سے اختلاف تلفظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ ایسے لفظوں کو انٹر پراونشل (بین صوبجاتی) قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ہندستانی میں ایک لفظ ہے «چاند»۔ اسے ایک ہندی میں چندر، دوسری میں چندرو، تیسری میں چندرماں، چوتھی میں چندا، پانچویں میں چھوم یا سوم کہتے ہیں۔ لیکن جس کسی خطۂ ملک میں آپ ہندستانی لفظ «چاند» بولیں وہاں

یہ لفظ سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس لیے ایسے ہندستانی لفظوں کو انٹرپراونشل کہتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور چیز سمجھنے کی ہے۔ یعنی بہت سے ایسے لفظ ہیں جو مختلف صوبوں میں ایک ہی طرح بولے اور لکھے جاتے ہیں گویا انٹرپراونشل ہیں۔ لیکن ہر جگہ ان کا مفہوم الگ الگ ہے۔ مثلاً بنارسی ہندی میں دھنباد کے معنی ہیں شکریہ۔ مگر مرہٹی میں مبارکباد کے لیے یہ لفظ رائج ہے۔ اسی طرح ہندستانی میں پنچایت کے معنی ہیں مجلس منصفہ، لیکن مرہٹی میں جھگڑے کو کہتے ہیں۔ گجراتی میں راجی نامہ (راضی نامہ) استعفیٰ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور دخل (دخل بمعنی دبدبہ) تو مداخلت بیجا کے لیے بولتے ہیں۔ بہاری میں سوبھاگ سہاگ کو کہتے ہیں لیکن اسی لفظ کے معنی ناگپور میں محنت کے لیے جاتے ہیں۔ اس اختلاف مفہوم کو صرف اس طرح ختم کیا جاسکتا ہے کہ کسی لفظ کے جو معنی ہندستانی زبان میں مقرر ہو گئے ہیں وہی معیاری معنی ہوں گے اور باقی معنی غیر فصیح قرار دیے جائیں گے۔

بہر حال اس قسم کے جتنے لفظ ہندستانی زبان میں موجود ہوں وہ سب انٹرپراونشل سمجھے جائیں گے اور مختلف زبانیں بولنے والوں کا فرض ہوگا کہ ان لفظوں کو ہندستانی مفہوم میں اپنے یہاں رائج کریں تاکہ ہندستانی زبان صحیح معنوں میں ملک کی عام زبان کہی جاسکے۔

معمولی ہندستانی میں جو محاورے رائج ہیں وہ ایسے ہیں کہ ہندستان کی دوسری زبانوں میں آسانی سے ترجمہ ہوسکتے ہیں اور جو شخص صرف بنیادی لفظوں کے معنے ہی جانتا ہو وہ بھی انھیں سمجھ لےگا لیکن خود تصنیف نہیں کرسکتا۔ ابتدا میں ایک ہزار کے قریب قریب محاوروں کی فہرست بنادی جائےگی جن میں سے چار پانسو محاورے تو دیکھتے ہی سمجھ میں آجائیں گے اور باقی بھی ایسے ہوںگے جو استعمال اور بات چیت کرنے کی مشق کے بعد خود بخود زبان پر چڑھ جائیں گے اور اکثر تو ایسے ہوںگے جو سیاق بیان ہی سے سمجھ لیے جائیں گے۔ مثلاً لفظ (بننا) کے ایک تو معمولی معنی ہیں جو بنیادی ہندستانی میں استعمال

ہوں گے ۔ لیکن محاورے کے طور پر دوسرے لفظوں کے ملانے سے کئی ایسے پیچیدہ معنی پیدا ہوسکتے ہیں جو صرف معمولی سادہ معنی پر دلالت نہیں کرتے ۔ جیسے :۔

(۱) اتنا کیوں بنتے ہو؟　(۲) تم لاکھ جھگڑو لیکن کچھ بنا نہیں سکتے ۔
(۳) اتنا نہ بناؤ کہ رونے لگے ۔　(۴) کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے؟
(۵) کبھی بن سنور کے جو آگئے تو بہار حسن دکھا گئے!
(۶) ان بن ہو جانا ۔　(۷) دونوں میں خوب بنتی ہے ۔
(۸) بنی کے سب ساتھی ہیں ۔　(۹) تو بنے اور بنی میں رہے اخلاص باہم...
(۱۰) بناوٹی غصہ کرتا ہے　(۱۱) بناوٹ کی خرابی ہے ۔
(۱۲) بنا بنایا کھیل بگڑ گیا ۔　(۱۳) بن کے بیٹھنا ۔
(۱۴) بنانا بگاڑنا خدا کے ہاتھ ہے وغیرہ ۔

اختصار سے طوالت کی طرف

بنیادی زبان میں صرف چند سو لفظوں سے کام لینا ہوگا ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں ان ہی لفظوں کے بہت سے ایسے مرکبات بنانے ہوں گے جو معمولی بنیادی میں مختصر طور پر صرف ایک ہی لفظ سے ادا ہوسکتے ہیں ۔ یا یہ کرنا ہوگا کہ اپنے مفہوم کو گھما پھرا کر بیان کریں تا کہ کسی نہ کسی طرح مقررہ لفظوں کی فہرست سے ہم باہر نہ جاسکیں ۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمارا کام بالکل اس استاد کا سا ہو جائے گا جو کسی شاعر یا ادیب و فلسفی کے مشکل مفہوم کو ابتدائی درجے کے بچوں کو سمجھانا چاہتا ہے اور ایسی آسان اور عام فہم زبان میں سمجھانا چاہتا ہے جو ان بچوں کی استعداد سے باہر نہ ہو ۔ گویا مختصر معانی کو طول دینا اور آسان کرنا بنیادی ہندستانی کا کام ہے ۔

مختصر لفظوں کو طویل اور آسان بنانے کے کئی طریقے ہیں ۔ ایک تو یہ ہے کہ عام معنی کو خاص یا خاص معنی کو عام بنادیا جائے ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک ہی کلمہ کو مختلف معنوں میں استعمال کریں ۔

عام معنی کو مخصوص مضمون میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ کسی کلمہ کو کل کی بجائے جز کے لیے یا جماعت کی جگہ فرد کے لیے استعمال کریں۔ مثلاً "تختی" عام انداز کی تختی کو کہتے ہیں۔ اس کے مخصوص معنی بچوں کے لکھنے کی تختی کے ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح "قاعدہ" عام لفظ ہے لیکن خاص معنوں میں اس سے بچوں کی ابتدائی کتاب سمجھی جاتی ہے جس سے وہ ابجد سیکھتے ہیں۔ اسی طریقہ پر خاص سے عام بھی بنا لیتے ہیں۔ مثلاً "کاغذ" ایک خاص لفظ ہے۔ لیکن کہیں اس کے معنی "خط" کے ہیں کہیں حکم کے اور کہیں اخبار کے۔

ایک ہی کلمہ کو مختلف مضمونوں کے کلموں کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس طرح ایک کلمہ بہت سے معنوں کا اظہار کرکے اپنی وحدت کو کثرت یا اختصار کو طوالت سے بدل سکتا ہے۔ مثلاً "حور" اسم ہے؛ اسے صفت کے طور پر استعمال کریں تو اس کے معنی خوبصورت عورت کے ہوجاتے ہیں۔ یا "کھانا" فعل ہے؛ اسے اسم کے طور پر استعمال کریں تو کھلائی اور خوراک یا غذا کے معنی پیدا ہوجاتے ہیں۔ "پر" ایک حرف ہے جو مگر یا لیکن کا ہم معنی ہے لیکن اسم بن جاتا ہے اور پر پروانہ یا پر پرندہ ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ "اوپر" کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

بیسک انگلش یا بنیادی انگریزی کے لفظ

اب بغیر کسی مزید تمہید کے ہمیں ان بنیادی لفظوں کی فہرست بنالینا چاہیے جن کی کم سے کم تعداد ہمارے روز مرہ کے علمی اور تجارتی کاموں کو چلاسکے۔ یہ کام ایک حد تک انگریزی میں ہوچکا ہے اور اس سے ہمیں کافی مدد مل سکتی ہے۔

بیسک انگلش کی ایک فہرست سنہ ۱۹۲۸ع میں چنی گئی تھی جو سنہ ۱۹۲۹ع میں شائع کی گئی۔ اس میں بہت سے لفظ بحث طلب تھے اور انگریزی کے زباندان مختلف پہلوؤں سے ان پر بحث و نقد کرتے رہے۔ کوئی کہتا تھا کہ افعال کا ہونا ضروری ہے یعنی ہر مفہوم کے تذکرے کے لیے جو افعال و مصادر پیدا ہوگئے ہیں

وہ فطری هیں اور انهیں زبان کا جزوِ اعظم هونا چاهیے۔ کوئی کهتا تها کہ اسما زیادہ قدیم اور زیادہ ضروری هیں۔ آخرکار یہ طے هوا کہ اسما سے همارا بهت زیادہ اور مفید کام هوسکتا هے، ان کی تعداد چهے سو سے کم نہ هو اور افعال و حروف کی تعداد اتنی هو کہ جن کے بغیر چارہ نهیں۔ غرض کہ جب بنیادی انگریزی کے پندرہ فی‌صدی مشکوک الفاظ بهی نکال دیے گئے تو سنہ ۱۹۳۱ع میں موجودہ فهرست پر سب کا اتفاق هوگیا اور یہ شایع کی گئی۔

ذیل میں بنیادی انگریزی کے آٹھ سو پچاس لفظ درج کیے جاتے هیں، ان کا هندستانی ترجمہ بهی دیا جاتا هے۔ جو حضرات اس فهرست کو ناکافی سمجهتے هوں یا هندستانی زبان کے بنیادی لفظوں میں نہ شمار کرتے هوں ان سے درخواست هے کہ اپنے تجویز کردہ لفظوں کی فهرست بحث و نظر کے لیے ارسال فرمائیں تاکہ ایک آخری اور مختتم فهرست شایع هوسکے۔

A (آ ۔ ء ۔ ع)

آدمی	Man
آئین (قانون)	Law
آگ	Fire
آگے	Forward
آهسته	Slow
آج	To-day
آله	Apparatus
آلو	Potato
عام	General
آم	Mango
آنا	Come
آنکھ	Eye
آپ ۔ خود	Self
آرام	Rest / Comfort
آسمان	Sky
آٹا ۔ کهانا	Meal
آواز	Force / Sound
آزاد	Free
اب	Now
اب هی (ابهی) (موجودہ)	Present
اچها	Good / Well
اچانک ۔ یکایک	Sudden
ادب ۔ عزت کرنا	Respect

Engine	انجن	Muscle	عضلہ (اذلہ)
Thumb	انگوٹھا	Regret	افسوس
And / More / Other	اور ۔ زیادہ	If	اگر ۔ جب
		Strange	عجب
Woman	عورت	Last / End	انتہا (آخر ۔ ختم)
Sense	عقل	Different	علیحدہ
Wise	عقل والا	Off / Away	الگ ۔ جدا
Foolish	بے عقل	Separate	جدا
Request	عرضی	Certainly	البتہ ۔ ضرور
Effect	اثر	Peace	امن ۔ شانتی
Normal	اصلی	In	اندر
Hospital	اسپتال	Dark	اندھیرا ۔ کالا
Such / So	ایسا	Egg	انڈا

B (ب)

Bad	بد ۔ برا	Cloud	بادل
Baby	بچہ	Garden	باغ
Sister	بہن	Hair	بال
Discussion	بحث	Bucket	بالٹی
Frequent	بہت دفعہ ۔ بار بار (اکثر)	Father	باپ
Goat	بکرا	Rest	باقی ۔ آرام
Box	بکس	Fact / Event	بات
Make	بنانا	Talk	بات چیت (گفتگو)
Shut	بند	Left	بائیاں ۔ اُلٹا
Harbour / Monkey	بندر	Market	بازار ۔ مارکٹ
Gun	بندوق	Body	بدن

بناوٹ	Design
بڑا	Big
برابر	Level / Equal
برس - سال	Year
برش	Brush
برف	Snow / Ice
بڑھان - ترقی	Growth
بڑھاؤ - ترقی	Increase / Development
بٹن	Button
بتی	Bulb
بیوپار	Business
بیان	Statement
بیچ - (درمیان)	Middle
بیچ میں	Between
بیج	Seed
بیمار	Ill
بیر	Berry
بیاج	Interest
بیٹی	Daughter
بیٹا	Son
بیاہا	Married
بھائی - برادر	Brother
بھاپ	Steam
بھی - تک	Even
بھیڑ	Sheep
بھیجنا - روانه کرنا	Send
بجلی (الکٹرک)	Electric
بلی	Cat
بندی (نقطه)	Point
بستر	Bed
بوند	Drop
بونگ - هڈی	Bone
بوتل	Bottle
بوجھ - سمجھ - هوش	Conscious
بڈھا - پرانا	Old
بنیاد	Base

C. CH (چ - چھ)

چاهنا - خواهش	Desire / Impulse
چاندی	Silver
چاول	Rice
چلن	Behaviour
چلنے کی جگه	Start
چمکیلا - چمک دار - روشن	Bright
چمچه - کاسک (قاشق)	Spoon
چوڑا	Wide
چپٹا	Flat
(چرخه	(Spinning Wheel
چشمه - کمانی	Spring
چٹنی - جیلی	Jelly

Umbrella	چھتری	Thing	چیز
Sneeze	چھینک	Smooth	چکنا
Narrow	چھوٹا ۔ (تنگ)	Stick	چپکنا ۔ لکڑی
Touch	چھونا	(Sticky)	(لیسدار)
Because	چونکہ	Ring	چھلا ۔ حلقہ
Pipe	چلم ۔ نل ۔ پائپ	Print	چھاپ

D. DH (د ۔ دھ)

Late	دیر	Grain	دانہ (غلہ اناج)
Slope	ڈھال (اترائی)	Argument	دلیل
Substance	دھات	Breath	دم (سانس)
Skeleton	ڈھانچہ (پنجر)	Stick	ڈنڈا ۔ (لکڑی)
Loose	ڈھیلا	Brain	دماغ
Heart	دل (من)	Danger / Fear	ڈر ۔ خطر
Day	دن ۔ روز	Drawer	دراز
Island	دوآب (دویپ) جزیرہ	Degree	درجہ
Far / Away	دور (الگ)	Door	دروازہ (دوار)
		Chemical	دوا
Friend	دوست	Ink	دوات (سیاہی ۔ روشنائی)
Thin	دبلا پتلا	See	دیکھنا
Pain	دکھ درد	Give	دینا

E (ای)

Belief	ایمان دھرم	Invention	ایجاد
Feeling	احساس	Brick	اینٹ

F (ف)

فیصلہ	Decision
فن	Art
فوج	Army
فوجی	Military
فولاد	Steel

G. GH. GH. (گ ـ گھ ـ غ)

گا	Will
گائے	Cow
گانا	Music, Song
گاؤں	Town
گاڑھا	Thick
گہرا	Deep
گدّا	Cushion
گلا	Throat
گندہ ـ میلا	Dirty
گانٹھ ـ گرہ	Knot
گرج	Thunder
گرمی	Summer, Heat
گروہ	Group
گیا ـ گزرا	Past, Went
گھاس	Grass
گھانگرا ـ لہنگا	Skirt
گھنٹہ	Bell
گھوڑا	Horse
گھر ـ مکان	House, Building, Place
گھڑی گھنٹہ	Watch, Hour
غریب	Poor
غلط	Wrong
گھڑیال ـ (کلاک)	Clock
غلطی	Mistake, Error
غصہ	Anger, Angry

H (ح ـ ہ)

حال	Condition
ہے (ہونا)	Is
ہانکنا (چلانا)	Drive
ہاتھ	Hand
ہاضمہ	Digestion
ہل	Plough

Hammer	ہتوڑا
Move	ہلنا۔ حرکت کرنا
Instrument	ہتھیار۔ (آلہ)
Account	حساب کتاب
Become	ہو جانا
Be / Exist	ہونا
Am	ہوں
Order / Authority	حکم
Were / Was	تھے۔ تھا
Goverment	حکومت۔ گورمنٹ
Light	ہلکا (روشنی)
(Us)	ہم کو۔ (ہمیں)
Our	ہمارا
Ever	ہمیشہ۔ سدا
Attack	حملہ
Laugh	ہنسی۔ (ہنسی لانا)
Hook	ہنسیا (ہکا)
Green	ہرا۔ سبز
Every	ہر ایک۔ ہر کوئی۔ ہر
Move / Movement / Motion	حرکت (ہلنا)

I (ا)

Suggestion	مشورہ
Advertisement	اشتہار
Agreement	اتفاق
Unit	اکائی
These	ان۔ یہ
Reward	انعام
End / Last	انت۔ آخر۔ ([illegible]) ختم

J. JH. (ج۔ جھ)

Where	جہاں۔ جدھر
Jewel	جواہر
Young	جوان
Answer	جواب
Ship	جہاز
Flag	جھنڈا (نشان)
False	جھوٹ
Awake	جاگنا
Net	جال
Expert	جانکار (ماہر)
Animal (Animus)	جانور
Knowledge	جاننا (علم)
As / So	جیسا۔ ایسا
Space / Position	جگہ

Addition	جوڑنا۔ جمع کرنا
Boot / Shoe	جوتا (بوٹ۔ شو۔ سلیپر)
Crime	جُرم
Bent	جُھکا ہوا۔ ٹیڑھا
Sex	جنس
Who / Which	جو
Connection	جوڑ۔ میل

K. KH. KH (ک. کھ. خ)

Work / Use / Act / Business	کام۔ کار
Industry	کاریگری
Factory	کارخانہ
Comb	کنگھی
Who	کون
Linen / Dress / Cloth	کپڑا
Do	کرنا
Bitter	کڑوا (زہر)
Attraction	کشش۔ کھینچنا
That	کہ۔ وہ
Insect / Worm	کیڑا
Ant	کیڑی (چیونٹی)
Kettle	کیتلی
Food / Meal	کھانا (خوراک)
Bad	خراب (بُرا)
Chalk	کھریا (چاک)
Store	کھتّا
Cork	کاک
Prison	کال کوٹھری۔ قید خانہ
Black	کالا۔ سیاہ
Ear	کان
Bite / Cut	کاٹنا
Of	کا
When	کب (کس وقت)
Say	کہنا
How	کیسا۔ کیسے (کس طرح)
Cough	کف۔ کھانسی
Where	کہاں (کس جگہ)
Fiction / Story	کہانی۔ قصہ
To-morrow / Yesterday	کل
Little / Some	کچھ۔ ذرا۔ تھوڑا (سا)
Spring	کمانی (سپرنگ)
Camera	کیمرا
Room	کمرہ (کوٹھری۔ دالان)
Edge	کنارہ

Any / Certain	کوئی	Curve	خم ۔ گولائی
Committee	کمیٹی	Play / Amusement	کھیل تماشا
Angle	کونہ (زاویہ)	Farm	کھیت
Whip	کوڑا	Window	کھڑکی
Crush	کچلنا	Rough	کھردرا
Family	کنبہ ۔ خاندان	Pleasure	خوشی
Dog	کتا	Canvass	کینوس
Well	کنواں	Ray	کرن
What	کیا ۔ جو	Book	کتاب
Why	کیوں	Library	کتب خانہ
		To	کو

L (ل)

Girl	لڑکی	Red	لال ۔ سرخ
Hang	لٹکنا	Get	لان
Paste	لئی	Lip	(لب) ہونٹ
Transport	لیجانا	Word	لفظ ۔ بول
Take	لینا	Wave	لہر ۔ موج
Writing	لکھنا	Stick / Wood	لکڑی (چھڑی)
List	لسٹ ۔ فہرست	Long / Tall	لمبا (طویل)
Iron	لوہا		
Elastic	لچک ۔ لوچ	Flame	لو (لپٹ ۔ شعلہ)

M (م)

Money / Property	مال ۔ (مال و زر)	Famale	مادہ (ناری)
Owner	مالک	Material / Matter	مادہ ۔ دھات

Strong	مضبوط
Porter / Worker	مزدور
Sweet	میٹھا
Kind	مہربان
Please	مہربانی کرکے
Arch	محراب
Among / In	میں - درمیان
Connection	میل - جوڑ
Table	میز
Mix	ملانا
Minute	منٹ
Example	مثال
Twist	موڑنا
Fat	موٹا
Country	مُلک - دیس
Possible	ممکن
Face / Mouth	منہ - چہرہ
Competition / Comparison	مقابلہ
Square	مربع
Cock / Fowl	مرغا (مرغی)
Difficult	مشکل

Seem	معلوم ہونا
Mother	ماں
Expert	ماہر (جانکار)
Fish	مچھلی
Help	مدد
West	مغرب (پچھم)
Month	ماہ - مہینہ
(1)	میں
Fly	مکھی
Bee	مکھی شہد کی
Rub	ملنا
Mind	من (دل)
Manager	منیجر
Temple	مندر (معبد)
Approval	منظوری
Current	موجودہ - رائج - لہر
Present	موجودہ - حال - (ابھی)
Chance	موقع
Weather / Monsoon	موسم
Death	موت
Die	مرنا
Machine	مشین
East	مشرق (پورب)
Taste	مزہ

N (ن)

Drain	نالی	Nose	ناک
Name	نام	Nail	ناخن

Mark	نقش ۔ علامت	Measure	ناپ
Map	نقشہ	Orange	نارنگی
Male	نر ۔ مرد	Female	ناری (مادہ)
Soft	نرم	No / Not	نہ ۔ نہیں (مت)
View	نظر	Natural	نیچرل
Theory	نظریہ	Disgust	نفرت
Low	نیچا (کمینہ)	Bathe	نہانا
Down	نیچے	Pipe	نل ۔ نالی
Sleep	نیند	Salt	نمک
Sign	نشان	Number	نمبر (گنتی)
System / Organisation	نظام (طریقہ) (ہیت)	Youth (See young)	نوجوانی
		Servant	نوکر
Loss / Damage	نقصان	Copy	نقل

OO (او)

Over / Up / On	اوپر ۔ پر	Wool	اون ۔ پشم

P. PH. (پ ۔ پھ)

Wheel	پہیہ ۔ چکر	Pocket	پاکٹ (جیب)
Representative	پنچ (نمائندہ)	Polish	پالش
Cheese	پنیر	Water	پانی
Reading	پڑھنا (پڑھائی)	Foot	پاؤں
Curtain	پردہ	First	پہلا
Teaching	پڑھانا ۔ تعلیم	Birth	پیدائش ۔ جنم
Care	پروا	Cook	پکانے والا ۔ باورچی
Selection	پسند ۔ چننا	Grip	پکڑ (گرفت)
Stone	پتھر	Mountain	پہاڑ

Stomach	پیٹ	After / Back	پیچھے (پیٹھ)
Spade	پھاوڑا	Yellow	پیلا ۔ زرد
Fruit	پھل	Drink	پینا
Stretch / Expansion	پھیلنا (پھیلاؤ)	Pencil	پنسل
Crack	پھٹنا (شگاف)	Love	پریم محبت ۔ پیار محبت
Flower	پھول	Dear	پیارا ۔ عزیز
Pin	پن ۔ سوئی	Complex	پیچ دار
Plate	پلیٹ (رکابی)	Screw	پیچ
Old	پُرانا (بڈھا)	Tree	پیڑ

Q (ق)

Pen	قلم	Rule	قاعدہ
Scissors	قینچی	Process	طریقہ
Shirt	قمیص	Able	قابل
Town	قصبہ	Control	قبضہ ۔ قابو
Debt	قرض ۔ ادھار	Step	قدم

R (ر)

Nerve	رگ	Opinion	رائے
Colour / Paint	رنگ	Road	راہ ۔ راستہ
Amount	رقم (کُل جمع)	Guide	راہبر
Cord	رسی	Government / State	راج ۔ حکومت ۔ سلطنت
Rail	ریل	Tin	رانگ ۔ رانگا
Silk	ریشم	Night	رات
Sand	ریت ۔ بالو	Remain	رہنا
Relation	رشتہ	Keep	رکھنا

Stop	روک۔ رکاوٹ	Light	روشنی۔ اُجالا
Cotton	روئی	Bread	روٹی
		Cry	رونا۔ چلّانا

S. SH. (س۔ ص۔ ش)

Winter	سردی	Soap	صابون
Street	سڑک	Simple	سادہ
Question	سوال	Clean / Clear	صاف۔ ستھرا
Straight / Right	سیدھا	Science	سائنس
Learning	سیکھنا۔ علم	Snake	سانپ
Tray	سینی	Company / Together / With	ساتھ۔ سنگ۔ مع
Whistle	سیٹی	Shade	سایہ۔ چھاؤں
Secretary	سکریٹری	All	سب
By / From / With / To	سے	Reason	سبب
Politics	سیاست	Meeting	سبھا۔ جلسہ۔ میٹنگ
Picture	شبیہ۔ تصویر	True / Right	سچ۔ سچا
Sugar	شکر (معرب سکّر)	Page	صفحہ
Person	شخص	Hard / Difficult / Stiff	سخت
Wine	شراب	May	سکنا
Shame	شرم	Safe	سلامت
Shelf	شلف۔ الماری	Society	سوسائٹی۔ سماج
Star	ستارہ	Sea	سمندر
Gold / Sleep	سونا	Head	سر
Dry	سوکھا۔ خشک	Slip	سرکنا
Sun	سورج	Chief	سردار
Form	صورت		

Hear / Hearing	سننا
Needle	سوئی
Station	سٹیشن
Morning	صبح - سویرا

T. TH. (ت. تھ. ٹ. ٹھ)

Wet	تر - گیلا
Oil	تیل
Sharp / Fast	تیز
Tired	تھکا - ماندا
Cold	ٹھنڈا
Regular	ٹھیک
Adjust	ٹھیک کرنا
Bag	تھیلا (بیگ)
Kick	(ٹھوکر) کک
Solid	ٹھوس
Chin	ٹھڈی
Ticket / Postage	ٹکٹ
Weight	تول - وزن
Hat-Topee	ٹوپی
Basket	ٹوکری
Train	ٹرین
Part / Bit	ٹکڑا
You	تم - آپ - جناب -
Lock	تالا - قفل
Copper	تانبا
Wire	تار
History / Date	تاریخ
Then	تب
Destruction	تباہی
Sail / Swim	تیرنا - پیرنا
Walk	ٹہلنا
Ready	تیار
Experience	تجربہ
Even / To / Till	تک (بھی)
Trouble	تکلیف - دکھ
Stem	تنا
Tight	تنگ
Scale	ترازو
Side / Direction / Across	طرف
Like	طرح
Way	طریقہ - راستہ

U (اُ)

Lift	اٹھانا
Jump	اچھلنا - کودنا

North	اُتّر۔ شمال	Sad	اُداس
		White	اُجلا۔ سفید

V. W. (و)

He / That / They	وہ	Dew	پالا۔ ([illegible])
		Event	واقعہ۔ بات
Same	وہی (وہ ہی)	Promise	وعدہ (بچن)
		Time	وقت

Y. (ے)

This / These / It	یہ۔ اس	Or	یا
		Memory	یاد
This very	یہی	Here	یہاں
		Friend	یار۔ دوست

Z. (ذ۔ ز۔ ض۔ ظ)

Ornament	زیور گہنا	Tyrant / Cruel	ظالم
Responsible	ذمہ دار	Tongue / Language	زبان
Living	زندہ		
Force	زور	Poison	زہر [illegible]
Feeble	(کم) زور	Wound	زخم
Tyranny	ظلم	Land / Earth / Floor / Ground	زمین
Certainly	ضرور		
Impotant / Necessary	ضروری	Chain / Connection	زنجیر۔ کڑی
Need	ضرورت	Some / Little / a little	ذرا۔ تھوڑا۔ کچھ

فہرست الفاظ پر ایک نظر

جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے اس فہرست میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ افعال بہت کم ہوجائیں اور اسما کی تعداد حتی‌الامکان زیادہ ہو اس لیے کہ اسما سے کئی قسم کے مشتقات بنانے میں انگریزی زبان میں آسانی ہوتی ہے اور چند افعال و حروف کو ملانے سے اسما کی زیادتی سے کارآمد اور بامحاورہ زبان بن‌جاتی ہے۔ ہندستانی میں قدرتی طور پر بہ آسانی موجود ہے۔ یعنی اس کے جتنے مصدر ہیں وہ سب اسم ہیں اور اسم کا کام دیتے ہیں۔

اس فہرست میں چھے سو اسم ہیں جن میں سے دو سو ایسے ہیں جن کی تصویر کھینچی جاسکتی ہے۔ مثلاً چاقو، گھنٹہ، جال، آلو، گاڑی، انگلی وغیرہ۔ چار سو ایسے اسم ہیں جو عام ہیں اور ان کی تصویر کھینچنا یا تو بہت ہی مشکل ہے یا ناممکن ہے مثلاً ہوا، کھانا، دوست، محبت، نفرت، وقت، فولاد، صابون، صفحہ، کاغذ، کپڑا، نقصان وغیرہ اس لیے کہ یہ لفظ کسی ایک خاص چیز کو نہیں بتاتے بلکہ ایک جماعت کے مختلف افراد یا اجزا کے لیے عام خیال پر حاوی ہیں۔

صفتوں کی تعداد ڈیڑھ سو ہے جن میں سے سو تو عام صفات ہیں؛ جیسے، زرخیز۔ تندرست۔ نیا۔ سرخ۔ ذمہ‌دار۔ اونچا۔ چکنا۔ گرم وغیرہ۔ اور پچاس ایسی ہیں جو پچاس عام صفات کے اضداد کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً بیمار۔ پرانا۔ سبز۔ نیچا۔ کھردرا۔ ٹھنڈا وغیرہ جن کے مقابلے میں تندرست، نیا، سرخ، اونچا، چکنا گرم وغیرہ الفاظ عام صفات کی فہرست میں موجود ہیں۔

باقی سو کلمات افعال و حروف کو بتاتے ہیں۔ ان حروف میں ضمیریں۔ اشارے موصولات اور ملانے والے حرف سب داخل ہیں۔

ان لفظوں کے علاوہ اس فہرست میں ناپ تول کے لفظ، گنتی، دنوں اور مہینوں کے ناموں اور سکّوں کے ہندستانی ناموں کو شامل کرلینا چاہیے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہندستان کے ہر ایک صوبے میں ان چیزوں کے لیے تقریباً الگ الگ الفاظ ہیں۔ لہذا ہندستانی فہرست درج ذیل ہے:—

ناپ | انگل، بالشت، ہاتھ، گرہ، گز، انچ، فٹ، فرلانگ، میل، کوس وغیرہ کے رقبے کی ناپ کے مربع بیگہ بھی رائج ہیں جو حساب کی کتابوں میں تفصیل سے درج ہیں۔

تول | تولنے کے لیے گاؤں گاؤں میں الگ الگ من اور سیر ہیں اس لیے انگریزی تولہ جو ۱۲ ماشہ کا ہوتا ہے عام ہوگیا ہے۔ اسی سے اسی تولے کا سیر اور پانچ سیر کی پنسیری اور آٹھ پنسیری کا من بنا لیا جاتا ہے۔

گنتی | جہاں تک گنتی کا تعلق ہے وہ خالص ہندستانی ایسی ہے کہ عام طور پر ہندستان بھر میں سمجھی جاتی ہے گو ہر جگہ بعض بعض عددوں کے تلفظ میں فرق ہوجاتا ہے۔ ان کی فہرست یہ ہے: ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھے، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ، بارہ، تیرہ، چودہ، پندرہ، سولہ، سترہ، اٹھارہ، انیس، بیس، اکیس، بائیس، تئیس، چوبیس، پچیس وغیرہ تا سو۔ ہزار، لاکھ، کروڑ، ارب، نیل، پدم، سنکھ، مہا سنکھ۔

دن | سنیچر، اتوار، پیر، منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ۔

مہینے | سن عربی، ہندی، انگریزی، روانی، فارسی کا رائج ہیں۔ ان میں سے (چیت، بیساکھ، جیٹھ) (اساڑھ، ساون، بھادوں) (کنوار، کاتک، اگھن) (پوس، ماگھ، پھاگن) ہندستانی مہینوں کے نام کہے جاسکتے ہیں۔ ان ہی کی مختلف شکلیں دوسرے غیر ہندستانی مقاموں میں رائج ہیں۔

سکّے | سکّے وہی رائج ہوتے ہیں جو حکومت چلائے۔ آج کل ہندستان میں تین قسم کے سکّے موجود ہیں: ایک انگریزی حکومت کے سکّے دوسرے مختلف ریاستوں کے سکّے اور تیسرے وہ سکّے جن کی قیمت اس کے ہم‌وزن چاندی یا سونے کے برابر ہے اس لیے کہ وہ سکّے کہیں رائج نہیں، صرف پرانی سلطنتوں کی یادگار ہیں؛ مثلاً اشرفی اور ڈبل وغیرہ۔ انگریزی سکّے پائی، پیسے، آنے، اکنّی، دوّنی، چوانّی، اٹھنی، روپے پر مشتمل ہیں۔ گنی اور ساورن کا عام چلن نہیں۔ کاغذی نوٹ

مختلف قیمتوں کے چلتے ہیں اور یہ ایسے ہی ہیں جیسے پرانے زمانہ میں ہنڈیاں ہوتی تھیں ۔

حروف تہجی

ہم نے اوپر کی فہرست میں ہندستانی ابجد کی ترتیب انگریزی الفابٹ کی ترتیب پر رکھی ہے ۔ اس لیے کہ اگر ہم ہندستانی زبان کو ہندستان کے ہر صوبہ میں رائج کرنا چاہیں تو بغیر رومن رسم خط کے چارہ نہیں ۔ بدقسمتی سے ہندستان کے ہر صوبہ میں الگ الگ قسم کے رسم خط جاری ہیں ۔ ان میں سے جو ہندی زبانوں یعنی گجراتی، مرہٹی، پوربی، بنگالی، اڑیہ وغیرہ کے موجودہ رسم خط ہیں وہ دیوناگری سے ملتے جلتے ہیں لیکن ان میں خ، ذ، ز، ظ، ض، ژ، ش، غ، ف، ق موجود نہیں حالانکہ ان حرفوں سے سینکڑوں ہندستانی لفظ بن گئے ہیں اور روزمرہ کی بولی میں رائج ہیں ۔ انگریزی میں (خ) (غ) اور (قاف) نہیں ہے لیکن دوسری یورپین زبانوں میں (خ) اور (غ) موجود ہیں لہذا ان کے سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوسکتی ۔ خود اردو رسم خط ہندستان کا سب سے زیادہ مکمل رسم خط ہے لیکن عصبیت اور قدامت پرستی کی وجہ سے اس رسم خط کا ہندستان میں عام طور پر قبول کیا جانا بہت ہی مشکل ہے اگرچہ نہ صرف یہ عربی، فارسی اور یورپیں حروف کو پورے طور پر ادا کرتا ہے بلکہ خالص ہندی اور سنسکرت حروف کو جو (ھ) کے ساتھ مخلوط ہوکر بنتے ہیں اور جو (ڈ) (ڑ) اور (ٹ) کی آوازوں کو ظاہر کرنے میں بھی پورے طور پر بتاتا ہے ۔ اور جہاں تک (واؤ) کی اور (ے) کی چار چار قسم کی آوازوں کا تعلق ہے انہیں تو سوائے اردو کے دنیا کا کوئی رسم خط اتنے آسان طریقہ سے ظاہر ہی نہیں کرسکتا ۔ ان آوازوں کی تفصیل اور ان کے لکھنے اور بولنے کے طریقوں کو کاتب الحروف نے "تین ہفتے میں اردو ابجد سکھانے والے نئے قاعدے" میں مکمل طور پر بیان کردیا ہے ۔

بہر حال اس فہرست میں جو لفظ ح، خ، ذ، ز، ظ، ض، ش، ص، ط، ع، غ، ف، ق سے شروع ہوتے ہیں وہ عربی، فارسی، ترکی، چینی اور فرنگی زبانوں سے آکر

ہندستانی بن گئے ہیں اور جن زبانوں سے یہ لیے گئے تھے ان میں یا تو ان کے معنی وہ نہیں ہیں جو ہم سمجھتے ہیں یا اکثر لفظ ایسے ہیں جن کا تلفظ قطعی بدل کر ہندستانی ہوگیا ہے۔

ترجمہ کے سلسلے میں دو چیزیں نوٹ کرلینا چاہیے: اول یہ کہ یہ ترجمہ زیادہ تر اسما (Nouns) کا ترجمہ ہے۔ دوسرے یہ کہ موجودہ ترجمہ میں بعض اسما کے ترجموں میں مصدری معنی دیے گئے ہیں: جیسے (Meal) کے معنی «کھانا» درج کیے گئے۔ اس کا ترجمہ خوراک یا غذا بھی ہے۔ لیکن علامت مصدری (نا) بڑھادینے سے اس لفظ میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور اسم اور فعل دونوں پر حاوی ہوسکتا ہے۔ بہر حال جو حضرات تنقید فرمائیں وہ ان چیزوں کو سامنے رکھیں اور جو مناسب مشورہ ہو اس سے استفادہ کا موقع دیں۔

حاصل مصدر

ہندستانی میں مصدر (Infinitive) اس اسم کو کہتے ہیں جو کسی کلمہ سے نہ نکلا ہو لیکن خود اس سے دوسرے اسم اور فعل بنائے جاسکتے ہوں۔ پھر اس کی دو قسمیں کی گئی ہیں: مفرد اور مرکب یا وضعی اور غیر وضعی۔ اس کے آخر میں (نا) ہوتا ہے اور جب اس (نا) کو نکال دیا جاتا ہے تو امر کا صیغہ باقی رہ جاتا ہے۔ اسے مادہ (Root) بھی کہتے ہیں۔ مصدر میں کسی فعل کا کرنا، ہونا یا سہنا سمجھا جاتا ہے۔ جو اسم مصدر کی کیفیت ظاہر کرنے کے لیے مصدر ہی سے بنائے جاتے ہیں انھیں حاصل مصدر کہتے ہیں۔ ان سے مصدر کے معنی کی حالت و کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندستانی میں اکثر مصدر ہی کو حاصل مصدر کے طور پر استعمال کرلیتے ہیں لیکن بہت سے ایسے حاصل مصدر ہیں کہ صرف علامت مصدری (نا) کے دور کرنے سے بن جاتے ہیں: مثلاً کھیل، کود، دوڑ، روک، سوجھ، بوجھ وغیرہ اور بعض میں تو صرف (الف) کے کم کردینے سے بن جاتے ہیں؛ جیسے، مرن، چلن، اٹھن وغیرہ اور اکثر مادۂ مصدر پر (ا، ان، اپ، اٹی، آس، پا، ت، تی، نت، ول، وا، واس، ھٹ، لائی، ی) بڑھانے سے حاصل مصدر بن جاتا ہے۔ مثلاً پھیرا، اڑان، ملاپ، سمائی، پیاس، جلاپا، کھپت، بھرتی، لڑنت، پھٹول، بھلاوا،

بکواس، بناوٹ، گھبراہٹ، رلائی، ہنسی ہیں اسی طرح دو مصدری مادوں کو بھی ملا کر حاصل مصدر بنالیتے ہیں؛ جیسے، سمجھ بوجھ، مارپیٹ، دیکھ بھال وغیرہ۔

اس سلسلہ میں یہ چیز قابل لحاظ ہے کہ حاصل‌مصدر صرف مصدر ہی سے نہیں بنتا بلکہ اسم صفت اور معمولی اسمائے نکرہ پر چند لاحقے بڑھانے سے بن جاتا ہے؛ مثلاً صفت پر (س، ک، ن، ہٹ، ئی) بڑھانے سے مٹھاس، ٹھنڈک، چوڑان، چکناہٹ، لمبائی، ہریالی وغیرہ اور اسم پر (پا، پنا، پن، ی) بڑھانے سے بڑھاپا، گنوارپنا، لڑکپن، دوستی وغیرہ بن جاتے ہیں۔

ان حاصل‌مصدروں کے علاوہ فارسی اور عربی کے حاصل‌مصدر بھی ہندستانی زبان میں رائج ہیں؛ مثلاً طلب، خواہش، احترام، پاکیزگی وغیرہ۔ اس طرح نہ صرف ہندستانی میں حاصل مصدروں کی بہت بڑی تعداد ہوجاتی ہے بلکہ یہ دشواری بھی پیدا ہوتی ہے کہ تقریباً سب حاصل مصدر سماعی ہیں۔ یعنی ان کے بنانے کا کوئی مقررہ قاعدہ نہیں جس کی بنا پر قیاس کیا جاسکے اور حاصل مصدر بن جائے۔

لیکن جس طرح انگریزی میں مصدر (Infinitive) حاصل‌مصدر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح ہندستانی زبان کے بہت زیادہ مصدر بغیر کسی تبدیلی کے حاصل مصدر بن جاتے ہیں مگر بخلاف ہندستانی کے انگریزی حاصل مصدر (Noun of Action یا Verbal Noun) ہر مصدر میں صرف ing بڑھانے سے بن جاتے ہیں اور اسی طرح بہ آسانی ہوتی ہے کہ نو آموزوں کو گرامر کی دقت نہیں ہوتی۔

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم بنیادی ہندستانی کے لیے گرامر کے نئے اصول وضع کریں، البتہ ہم یہ کرسکتے ہیں کہ جہاں‌تک ممکن ہو ایسے مصدروں کا استعمال کریں جو حاصل‌مصدر کا بھی کام دے‌سکیں؛ مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "رونا دھونا اچھا نہیں اس سے کوئی فایدہ نہیں" لیکن "رونا دھونا" کی بجائے اگر ہم کہیں "رلائی دھلائی بے‌سود ہے" تو وہی مفہوم ادا ہوجاتا ہے۔ اور حاصل‌مصدر کی وہ صورت پیدا ہوجائے گی جو عام طور پر سماعی قاعدوں کے مطابق ہندستانی میں رائج

ہیں۔ بس اتنی دقت ہوگی کہ بنیادی ہندستانی سیکھنے والوں کو کوئی عام قیاسی قاعدہ نہ بتاسکیں گے اور انہیں زبان سیکھنے میں لفظوں کی کثرت کی وجہ سے دقت ہوگی۔ غرض یہ ہمیں بنیادی لفظوں کے انتخاب میں اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو ایسے لفظوں کو چنیں جو گرامر کے قیاسی قواعد کی پابندی کرسکیں تاکہ دوسرے صوبوں کے لوگوں کو سیکھنے میں آسانی ہو۔

موجودہ فہرست مکمل نہیں ہے

اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ جہاں تک ہندستانی زبان کی خصوصیتوں کا تعلق ہے یہ فہرست پوری نہیں۔ ہمارے روزمرہ کے استعمال میں بہت سے ایسے الفاظ داخل ہوگئے ہیں جن کے بغیر با محاورہ بول چال ناممکن سی ہوگئی ہے۔ فہرست الفاظ کے ناقص ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزی اور ہندستانی گرامر اور اسلوب بیان میں اچھا خاصہ فرق ہے۔ مثلاً انگریزی افعال کے ساتھ حروف جر کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور اسما و صفات بھی مختلف حروف کے ساتھ مرکبات بنائے بغیر مفہوم کی وضاحت نہیں ہوتی۔

ہندستانی میں بھی مرکب افعال استعمال ہوتے ہیں اور اس طرح ان کے معنوں میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ شروع کرنے کے لیے (لگنا) (چاہنا) (والا)۔ ختم کے لیے (چکنا)۔ اجازت کے لیے (دینا)۔ امکان کے لیے (سکنا)۔ مجبوری کے لیے (پڑنا)۔ مفاجات کے لیے (اٹھنا۔ بیٹھنا۔ پڑنا۔ دینا۔ ڈالنا۔ جانا)۔ تسلسل یا استمرار کے لیے (کرنا۔ کیا کرنا۔ رہنا۔ جانا) کے مختلف صیغے بڑھا دیے جاتے ہیں۔

حروف جار (یعنی میں۔ سے۔ تک۔ کو۔ پر۔ لیے۔ واسطے وغیرہ) بھی اسموں اور ضمیروں کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں اور مختلف معنی پیدا کرکے ان اسموں اور ضمیروں کا تعلق فعلوں یا صفتوں وغیرہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح ان سے اور دوسرے حروف سے متعدد محاورے بنتے ہیں جو انگریزی گرامر کے اصولوں سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں۔

ان باتوں کا لحاظ کرکے سب سے بہتر صورت یہ ہوگی کہ جو حضرات بنیادی ہندستانی کے لفظوں کی فہرست میں تبدیلی کرنا چاہیں وہ پہلے یہ کریں کہ روزمرہ کی زبان کے لفظوں کی فہرست مرتب کرنے کے بعد یہ دیکھیں کہ وہ کون سے لفظ ہیں جو بار بار استعمال ہوتے ہیں اور موجودہ فہرست میں ان کے اضافہ کے بغیر چارہ نہیں ہے ۔

انٹرنیشنل لفظ International Words

بیسک انگریزی لکھنے والوں نے تقریباً پچاس لفظ انٹرنیشنل قرار دیے ہیں ۔ ان کے علاوہ بارہ علوم کے ناموں کو بھی انٹرنیشنل مانا ہے ۔ چونکہ ہندستان نیشن (Nation) نہیں ہے اور عام طور سے مشرقی اقوام کو یوروپین مصنفین اپنے سامنے نہیں رکھتے، ان کی دنیا یورپ اور امریکہ تک محدود ہے لہذا اس فہرست میں بعض لفظ ایسے ہیں جو ہندستان کے نقطۂ نظر سے انٹرنیشنل نہیں ہیں ۔ یہاں ان لفظوں کا یا تو بہت کم استعمال ہے یا ان کی جگہ دوسرے لفظ رائج ہیں ۔ مثلاً Automobile کی جگہ موٹر، Sport کے لیے کھیل، Sir کے واسطے جناب کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور Bar, Beef, Colony, Opera, Parrafin, Terrace صرف چند پڑھے لکھے لوگوں تک محدود ہیں ۔

علوم کے بارہ نام دیے گئے ہیں ۔ معلوم نہیں ہندستان والے ان ناموں کو انٹرنیشنل سمجھتے ہیں یا نہیں ۔ مجھے تو ان کے مان لینے پر کوئی اعتراض نہیں ۔ نام یہ ہیں :—

الجبرا ۔ ارتھمیٹک ۔ بیالوجی ۔ کیمسٹری ۔ جغرافی ۔ جیومٹری ۔ میتھےمیٹکس ۔ فزکس ۔ فزیالوجی ۔ سائی کالوجی ۔ زوآلوجی ۔ اس پرمیں ایک اور نام بڑھاتا ہوں ستارانومی ۔

ہندستان میں بعض اور لفظ عام طور پر سمجھے جاتے ہیں اور یہ انٹرنیشنل بنائے جاسکتے ہیں ؛ مثلاً گلاس ۔ بوتل ۔ بٹن ۔ فونٹین پن ۔ کالج ۔ اسکول ۔ میوزیم ۔ پریزیڈنٹ ۔ پٹرول ۔ شوفر ۔ ملیریا ۔ کونین ۔ نوس ۔ بٹر ۔ وایولن ۔ افیون (opium) ۔ پلیٹی نم ۔ آملیٹ ۔ پاجامہ ۔ قمیص ۔ ماچس وغیرہ ۔

بنیادی ہندستانی کو کیسے ترقی دی جائے؟

ہندستان میں متحدہ قومیت کا احساس شروع ہوگیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب ہم اپنے قوانین کے ذریعے سے انگریزی کی جگہ ہندستانی زبان کو رائج کردیں گے۔ لیکن جب تک وہ زمانہ آئے ہمیں انتظار میں بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں۔ اس دوران میں بنیادی لغت، بنیادی گرامر اور بنیادی زبان بنا لینا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ اس زبان میں عام دلچسپی کی کتابیں ترجمہ ہونے لگیں تاکہ وہ لوگ جن کی زبان ہندستانی نہیں ہے اسے سیکھنے کے بعد بھول نہ سکیں۔

خود ہندستانی بولنے والوں کے مدرسوں میں، عدالتوں میں اور قانونی مجلسوں میں بنیادی ہندستانی کو اس لیے رواج دینے کی ضرورت ہے کہ معیاری یا بلند ہندستانی کا تعلق عوام سے بہت کم ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ گاؤں والے بھی عام طور پر ہندستانی زبان بولنے لگیں تو شہری ہندستانی سے قریب لانے کا صرف یہ ذریعہ ہے کہ ہم خود بنیادی ہندستانی کو اپنے روزمرہ کے کاروبار میں استعمال کرنے لگیں اور دیہات کے پوربی، اودھی اور کھڑی بولی بولنے والوں کو ہندستانی زبان اختیار کرنے میں مدد دیں۔

کلکتہ اور بمبئی کے سنیما والوں کو بنیادی ہندستانی میں فلمیں تیار کرنے کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ اس میں ان کے بہت سے فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب وہ عام ہندستانیوں کی زبان میں فلمیں تیار کریں گے تو انھیں دیکھنے والوں کی زیادہ تعداد ملے گی۔ پھر یہ بھی ہوگا کہ ایسی فلمیں تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرسکیں گی اور وہ لوگ بھی ان سے لطف اور فائدہ اٹھا سکیں گے جن کی مادری زبان ہندستانی نہیں ہے بلکہ انھوں نے بنیادی ہندستانی کے دو چار سو لفظ سیکھ لیے ہیں۔ "دو چار سو لفظ" اس لیے کہے گئے کہ کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں بنیادی ہندستانی کے ہزار لفظوں میں سے چھے سات سو لفظوں کو سمجھنے والے موجود نہ ہوں۔ گویا ہندستان والوں کی بہت بڑی تعداد کو بنیادی ہندستانی کے ذریعے سے

مخاطب کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اگر هندستان کا ہر ایک ریڈیو اسٹیشن اپنے روزانہ پروگرام میں دس منٹ بنیادی هندستانی کے لیے وقف کردے تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک والے اسے پسند نہ کریں اور هندستان کی مشترک زبان کی ترقی نہ ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس طرح رفتہ رفتہ ریڈیو کی افادیت بہت بڑھ جائے گی اور بیرون هند کے لوگ بھی بنیادی هندستانی کی خبروں میں دلچسپی لینے لگیں گے۔ جاپان اور بعض دوسرے ملکوں نے محض اپنی تجارتی اور سیاسی غرضوں کی بنا پر هندستانی زبان کو اپنی یونیورسٹیوں میں جگہ دے دی ہے اور ان کی فطری خواہش ہے کہ هندستانی زبان کو خود هندستانیوں کے منہ سے سنیں اور صحیح تلفظ ادا کرسکیں۔ اس کے علاوہ جو هندستانی غیر ممالک میں ہیں وہ ریڈیو پر جب اپنی پیاری زبان سنتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے اپنی غریب‌الوطنی بھول جاتے ہیں اور محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ اپنے وطن ہی میں ہیں۔ غرضکہ ہر نقطۂ نظر سے ریڈیو کے ہرایک اسٹیشن سے بنیادی هندستانی میں براڈکاسٹ ہونا مفید اور ضروری ہے۔

رومن رسم‌الخط

لیکن هندستانی زبان کو ترقی دینے کے لیے خواہ وہ "بنیادی" ہو یا "معمولی" صرف ایک ہی ذریعہ ہے یعنی ہم اس کے لیے رومن‌رسم‌الخط (Roman Script) اختیار کرلیں اور اگر ہماری موجودہ قدامت‌پرستی اس شاہراہِ عمل سے روکتی ہو تو کم از کم یہ کوشش کی جائے کہ اردو اور ناگری کے ساتھ ساتھ رومن خط میں بھی ہر سرکاری اور غیر سرکاری چیز شایع ہو اور محکمۂ تعلیمات میں ہر طالب علم کو پورا اختیار ہو کہ وہ چاہے تو صرف رومن رسم‌خط کے ذریعے سے اپنی مادری زبان سیکھ سکے۔ اس طرح هندستان میں لکھائیوں کا جو اختلاف ہے وہ بھی مٹ جائے گا اور "هندستانی" زبان کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ نہ صرف بنگالی، گجراتی، مدراسی، آسامی اور برمی ہماری زبان کو پڑھنے لگیں گے بلکہ لاکھوں یورپین، جاپانی اور چینی اور تقریباً سب هندستانی عیسائی، فوجی، ریلوے ملازمین و مزدور ہماری زبان سیکھ جائیں گے اس لیے

که ان لوگوں کو اتنی زبان کی دقت نہیں جتنی رسم‌الخط کی ہے اور سب ہندستانیوں کے لیے یہ چیز سو سال تک ممکن نہیں که ہمارے رہنماؤں کی امیدوں اور دعاؤں کو پورا کرسکیں یعنی ہندی اور اردو دونوں رسم‌الخط سیکھ لیں حتّی که بلند پایه ادیب اور ہندی کے بھی ماہر بن جائیں۔ اس قسم کی تصور پرستی (Idealism) عموماً اس ارتجاعی ذہنیت کا نتیجه ہوتی ہے جو ہر نئی چیز سے بھڑکنے کا نام مذہب سمجھتی ہے اور نقصان‌ده تاریکی میں رہنا اساس وطنیت قرار دیتی ہے۔

سنسکرت زبان

اور

اس کی شاعری کی ایک ہلکی جھلک

از

(پنڈت ونشی دھر ودیالنکار، لیکچرار جامعہ عثمانیہ)

انسانی زندگی کا سوال جتنا پیچیدہ ہے زبانوں کا سوال اس سے کم پیچیدہ نہیں ہے۔ جس طرح زندگی کے مسائل کو ایک عالم یا حکیم ایک طرح سے حل کرتا ہے اور دوسرا دوسری طرح اور اس طرح ایک کے بعد دوسرا نظریہ پیدا ہوتا رہتا ہے اور ان نظریوں کے ماتحت خیالات کے بہت سے ادارے بنتے چلے جاتے ہیں اور جس طرح باوجود ان تمام نظریوں کے زندگی کا مسئلہ ایک پہیلی ہی بنا رہتا ہے اور انسانی ذہنیت کو چنوتی دیتا رہتا ہے اسی طرح کسی زبان کا مسئلہ بھی مختلف طریقوں سے حل کیا جاتا ہے اور اس میں بھی ایک کے بعد دوسرا نظریہ آتا اور خیالات کے ادارے بنتے جاتے ہیں اور پھر بھی زبان کا مسئلہ ایک ایسی پہیلی بنا رہتا ہے جو انسانی دماغ کو ہمیشہ چکر میں ڈالے رکھتی ہے۔

یہ بات خاص کر ان زبانوں کے لیے ٹھیک اترتی ہے جو پرانی ہیں اور جو عام طور پر بول چال اور استعمال کی دنیا سے ہٹ کر صرف ریسرچ (Research) کی دنیا کی ملکیت بن گئی ہیں۔

بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے مشرقی زبانوں میں ریسرچ کی بنیاد مغرب کے عالموں کے ہاتھوں پڑی۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ انھیں کی بےمثل تحقیق

اور جان توڑ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ علم کی دنیا میں ان زبانوں کی بوجھ بھر سے ہونے لگی ہے لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی کہنا پڑے گا کہ ان لوگوں کی بدولت ان زبانوں کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ جوں جوں ہمارے مشرقی عالم اس میں اپنا ہاتھ بٹا رہے ہیں بہت سی غلط فہمیاں دور ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مغربی محقق بھی قیاس کی بنیاد پر بہت کچھ لکھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ان کی تحقیق مکمل طور پر مقبول نہیں ہوتی۔

بہت سے لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جب سنسکرت زبان کی بھنک یورپ میں پہنچی اس وقت کئی محققوں نے اس قسم کی کتابیں لکھیں جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ سنسکرت زبان کوئی زبان نہیں ہے۔ ہندستان کے چالاک برہمنوں نے سکندر اعظم کے ہندستان پر حملے کے بعد یونانی زبان کے نمونے پر نہ صرف سنسکرت ادب کو بلکہ سنسکرت زبان کو بھی بڑی ہوشیاری سے گھڑ لیا۔

They endeavoured to prove that not only Sanskrit literature, but also the Sanskrit language was a forgery made by the crafty Brahmans on the model of Greek after Alexandar's conquest.

اس کے بعد بھی جب سنسکرت کی بہت سی کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو کر یورپ میں پہنچ چکی تھیں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لارڈ بنٹنگ کے زمانے میں جب نئی تعلیم کی اسکیم بنائی جا رہی تھی تو لارڈ میکالے نے سنسکرت زبان کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ایسی الماری سے جس میں سنسکرت کے ادب کی کتابیں بھری ہوں وہ الماری اچھی ہے جو بالکل خالی ہو۔

اس کے بعد بہت سا زمانہ بیت گیا۔ آہستہ آہستہ سنسکرت زبان کا مطالعہ بھی بڑھتا گیا۔ سنسکرت زبان کی مقبولیت کے بڑھانے میں جرمن عالموں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس زمانے کے سنسکرت کے مشہور عالم Arthur A. Macdonell نے جو کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر تھے سنسکرت زبان کے بارے میں حسب ذیل لکھا ہے:۔

"Since the Renaissance there has been no event of such world-wide significance in the history of culture as the discovery of Sanskrit literature in the latter part of the eighteenth century............"

یعنی احیاے علوم کے بعد دنیا کی تہذیب کی تاریخ میں کوئی بھی واقعہ ایسی اہمیت نہیں رکھتا جتنی کہ سنسکرت زبان کی دریافت ہے جو کہ اٹھارویں صدی کے پچھلے حصے میں ہوئی ہے۔

سنسکرت زبان کی دریافت کے بعد زبانوں کی بنیاد بہت کچھ سائنٹفک ہوگئی۔ اس سے جہاں ایک طرف Comparative Philology تقابلی اسانیات کا علم نکلا وہاں دوسری طرف ویدوں اور پرانوں کے مطالعہ کے بعد Comparative Mythology یعنی تقابلی دیومالا کی بنیاد پڑی۔ اسی طرح مرضیات میں Comparative Pathology یعنی تقابلی مرضیات کی بنیاد پڑی۔ اب جو نئی لغات تیار ہورہی ہیں ان کی بنیاد بھی بدل گئی ہے اور وہ تاریخی بنیاد پر تیار کی جارہی ہیں۔ اسی طرح اور بھی مختلف علموں کے مطالعہ پر سنسکرت زبان کا اثر پڑ رہا ہے۔

سنسکرت زبان کس طرح پیدا ہوئی اس کے بارے میں بالکل صحیح طور پر کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے۔ لیکن اس میں بہت کچھ اٹکل پچو سے کام لیا گیا ہے اور لیا جاتا ہے اور اسی لیے بہت سے ایسے نظریے پیدا ہوگئے ہیں جن میں یکسانیت نہیں ہے۔ میں اس مضمون میں بالکل مختصر طور پر یہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ سنسکرت زبان جس میں ادبی تصانیف لکھی گئی ہیں کس طرح پیدا ہوئی اور اس کا ادب کس انداز پر ترقی پذیر ہوا، اس کی کیا خصوصیات تھیں، کن کن بڑے ادیبوں اور شاعروں نے اس کو ایسے سانچے میں ڈھالا جس سے سنسکرت زبان دیوتاؤں کی زبان کہلائی اور ہمیشہ کے لیے امر ہوگئی۔ میں صرف سنسکرت کی اس زبان اور ادب کے بارے میں کچھ لکھوں گا جو ٹکسالی یا مستند سمجھی جاتی ہے۔ میں ویدوں

کی سنسکرت اور اس سے متعلق ادب کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا چوں کہ وہ ایک بالکل الگ مضمون ہے۔

یورپین سنسکرت عالموں کے حساب سے ہندستان کی تا اس کے ادب کی تاریخ اگر سلسلہ وار کہیں سے شروع ہوتی ہے تو وہ سکندر کے ہندستان میں آنے کے بعد سے ہے۔ اسی کی بنیاد پر سنسکرت زبان اور اس کے ادب کی بنیاد بھی اس کے لگ بھگ یا اس سے کچھ پہلے ہی تک رکھی جاتی ہے۔ سکندر کا ہندستان پر حملہ سنہ ۳۲۶ ق۔م میں مانا جاتا ہے۔ اگر مہاتما بدھ کی موت کی تاریخوں کا سنہ ۴۸۰ ق۔م میں پتہ نہ لگتا تو ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ ماہر شرقیات سنسکرت زبان کو سنہ ۵۰۰ ق۔م تک بھی شاید نہ لے جاتے۔ ان لوگوں کے خیال میں سنسکرت زبان کی بنیاد اسی کے آس پاس پڑی ہے۔ بہت سے دوسرے ماہر شرقیات اس کو سنہ ۵۰۰۰ ق۔م اور کئی اس سے بھی بہت قبل لے گئے ہیں۔ وقت کے بارے اتنی کھینچ تان ہو رہی ہے اور اس کے لیے اتنی توڑ مروڑ کی جاتی ہے کہ اس معاملے میں قطعی طور پر کچھ کہنا ناممکن ہے۔ تاریخوں کا معاملہ اور اس کی بحث ایک ایسا گورکھ دھندہ بن گیا ہے جس میں ریسرچ کے بڑے بڑے عالم نئے نئے نظریے قائم رکھتے ہیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اب جو کھوجیں ہو رہی ہیں ان سے یہ تاریخیں لگاتار پیچھے ہٹتی چلی جا رہی ہیں۔

بہت سے محققوں کا خیال ہے کہ سنسکرت کی مستند زبان آہستہ آہستہ پراکرت زبانوں سے ترقی پذیر ہوئی یعنی سنسکرت پراکرتوں کی ہی ایک سنواری ہوئی اور منجھی ہوئی شکل ہے۔ پراکرت لفظ کے معنی ہیں قدرتی اور سنسکرت کے معنی ہیں بنائی ہوئی سنواری ہوئی۔ پراکرت کے معنی ہیں عوام اور پراکرت زبان کے معنی عوام کی زبان ہے اور سنسکرت لفظ کے معنی ہیں سنواری ہوئی یا شستہ زبان۔ ان ناموں کے معنے کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سنسکرت پراکرتوں ہی کی ایک سنواری ہوئی شکل ہے، کوئی دوسری زبان نہیں ہے۔ ایسا خیال رکھنے والوں کی رائے میں سنسکرت کا ادب پہلے پہل پراکرت زبان میں ہی

شروع ہوا - یہ پراکرت وہ پراکرت نہیں تھی جس نے علم قواعد کے ذریعہ پیچھے سے مستند شکل اختیار کی، بلکہ وہ پراکرت زبان تھی جو قدیم ترین تھی - ان لوگوں کی رائے میں مہاتما بدھ کے زمانے کے قریب قریب ہی سنسکرت زبان میں ادب کی تحقیق کی جانے لگی - مہاتما بدھ نے پراکرتوں کو فروغ دیا - اس لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ غیرمذہبی یا دنیاوی ادب پہلے پراکرت میں ہی بنا - وہ عالم یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ راماین اور مہابھارت بھی پہلے پراکرت ہی میں لکھی گئیں لیکن یہ باتیں جس آسانی سے کہہ دی جاتی اتنی آسانی سے ثابت نہیں کی جاسکتیں - ہماری معلومات اتنی کم ہیں کہ ان کی بنیاد پر یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ سنسکرت پراکرتوں کی ہی ایک منجھی ہوئی شکل ہے -

اس طرح کے خیالات صرف Sylvan Lavy وغیرہ کچھ یورپ کے ماہروں کے ہی نہیں پرانے جینی عالموں کے بھی یہی خیالات ہیں - رودرٹ نے اپنے کاویا لنکار میں لکھا ہے :-

"प्राकृत संस्कृत मागध पिशाचभाषाश्च शौरसेनीच ।
षष्ठोऽत्र भूरिभेदो देश विशेषादपभ्रंश : ॥"

اس شلوک میں اس نے سنسکرت سے پہلے پراکرت کا نام دیا ہے - اس کی بنیاد پر گیارھویں صدی کے ایک جین عالم نمی سادھو نے لکھا ہے :-

"प्राकृतं बालमहिलादि सुबोधं सकलभाषा निबन्ध-
भूतं वचनमुच्यते । तदेव च देशविशेषात् संस्का-
रणाच संस्कृता पुत्तरविभेदानाप्नोति"

یعنی پراکرت وہ زبان ہے جو بالکل آسان ہے اور یہی علم قواعد کے مطابق بن کر سنسکرت بن جاتی ہے -

اس کے بعد وہ محقق آتے ہیں جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سنسکرت زبان آریوں کی زبان یعنی ویدوں کی سنسکرت اور یہاں کے پراکرتوں کے میل سے بنی ہے - جس طرح اردو زبان فارسی، عربی اور ہندی کے میل سے پیدا ہوئی اسی طرح آریہ لوگ جب ہندستان میں آئے تو وہ زبان جو اپنے ساتھ لائے تھے

اور وہ زبانیں جو یہاں بولی جاتی تھیں ان کے میل سے سنسکرت پیدا ہوئی۔ اسی بات کو پرانے مصنفوں نے اس طرح ثابت کیا ہے۔ پرانے آریوں کی وہ زبان جو اپنے ساتھ لائے تھے یہاں کی زبان کا ساتھ ملی اور اس طرح پہلے پہل جو بھاشا پیدا ہوئی وہ پراکرت تھی۔ اور یہ وہ پراکرت تھی جس میں کوئی قواعد نہیں تھے۔ یہی زبان جب قواعد کے تحت آئی اور اس نے جو شکل اختیار کی وہ سنسکرت ہے اور اسی کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ پراکرت سے سنسکرت پیدا ہوئی۔ راج شیکھر کے اس شلوک کا بھی اس معنی میں حوالہ دیا جاتا ہے۔ "यद् योनि: किल संस्कृतस्य......" یعنی سنسکرت پراکرت سے پیدا ہوئی۔ بہت سے علم قواعد کے لکھنے والے یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ پراکرت زبان کے قاعدے قریب قریب وہی ہیں جو ویدک زبان کے تھے۔

اس کے علاوہ پراکرت زبان کے مشہور وہ نحوی ہیں جو پراکرت لفظ کے معنی یوں بیان کرتے ہیں۔

"प्रकृति: संस्कृतं तत्रभवं तत आगतम्. प्राकृतम

(हेमचन्द्र)

"प्रकृति: संस्कृतं तत्र भवं प्राकृतमुच्यते (प्राकृतसर्वस्व)

"प्राकृति: संस्कृतं तत्र भवत्वात्प्राकृतं स्मृतम् (प्राकृतचन्द्रिका)

"प्रकृते: संस्कृतायास्तु विकृति: प्राकृती मता (षड्भाषाचन्द्रिका)

"प्राकृतस्य तु सर्वमेव संस्कृतं योनि: (प्राकृतसंजीवनी)

ان تمام حوالوں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پراکرت وہ زبان ہے جو سنسکرت سے بگڑ کر بنی ہے۔ سنسکرت سے پراکرت پیدا ہوئی، پراکرت سے سنسکرت پیدا نہیں ہوئی۔

اس کے بعد میں سنسکرت کی پیدائش کے اس نظریے پر آتا ہوں جو کہ عام طور پر صحیح سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ویدک زبان ہی ترقی کرتے کرتے سنسکرت کی شکل میں بدل گئی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پانینی نے جو سنسکرت زبان کے سب سے بڑے قواعد دان ہیں اور جن کی وجہ سے سنسکرت زبان مستند سانچے

میں ڈھل گئی، جگہ جگہ اپنے سوتروں میں ویدک بھاشا کا تو ذکر کیا ہے لیکن پراکرت بھاشا کا کہیں ذکر نہیں کیا ان کی اشٹادھیائی کو پڑھنے سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مستند سنسکرت زبان ویدک سنسکرت سے پیدا ہوئی اور اسی کی ایک سنواری ہوئی شکل ہے۔ ویدک زبان اور سنسکرت زبان کے لفظوں میں یکسانیت ہے اگر آپ ویدوں کی سنسکرت کو پڑھیں اور اس کے بعد سنسکرت کو پڑھیں تو دونوں کے ڈھانچے میں کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اگر آپ پراکرت کو پڑھیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں بہت فرق ہے۔ ویدک زبان اور سنسکرت زبان کا تلفظ ایک جیسا ہے مگر پراکرت کی بولی بگڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ اس سنسکرت زبان میں کچھ الفاظ دوسری زبانوں کے مل گئے ہوں۔ لیکن اس سے زبان کے ڈھانچے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زبان کا ڈھانچہ لگ بھگ وہی ویدوں کی ہی زبان کا رہا۔ ہاں اس میں کچھ پھیر پھار ضرور ہوئے اور اس طرح سنسکرت زبان آہستہ آہستہ ایک مستند شکل میں بدل گئی نہ صرف پانِنی کے اشٹادھیائی سے بلکہ سنسکرت کے ادب سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ ویدوں کے بعد براہمن، آرنیک، اپنیشد اور پھر سوترگرنتھ ان سب میں ایک ہی زبان ہے جو ایک دریا کی طرح آگے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہی آخری نظریہ ہمیں صحیح معلوم ہوتا ہے اور آج کل کے ماہر شرقیات بھی زیادہ تر اسی کو صحیح مانتے ہیں۔ ڈاکٹر کیتھ، ڈاکٹر میکڈونل، پروفیسر پشل وغیرہ بلکہ پرانے سنسکرت کے محقق بھی اسی نظریے کو صحیح مانتے ہیں اور جو بھی محقق سلسلہ‌وار اس زبان کا مطالعہ کرےگا اسی نتیجے پر پہنچےگا۔ ان باتوں میں بہت سی الجھنیں نہ صرف اس لیے پیدا ہوگئیں ہیں کہ ہمارے پاس اس کے لیے ذخیرہ بہت کم ہے اور نہ صرف اس لیے کہ ہزاروں برس پہلے کی پرانی چیزوں کو ٹھیک طور پر سمجھنے میں بہت کٹھنائیاں پیش آتی ہیں بلکہ اس لیے بھی ہوئی ہیں کہ آج کل کے محقق کوئی نئی بات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ محقق اگر کوئی

نئی بات نہ کہےگا تو شاید وہ محقق و عالم ہی نہ سمجھا جائےگا۔ اس لیے نئی بات کہنے کی دھن میں محقق دور دور سرچ کی دنیا میں ایسی کھوج کیا کرتے ہیں جو سننے میں تو سچی سی معلوم ہوتی ہیں لیکن جب دلیلوں کی کسوٹی پر کسی جاتی ہیں تو سچی ثابت نہیں ہوتیں۔

اوپر کی تمام باتوں کے کہنے کا نچوڑ یہ ہے کہ سنسکرت زبان وہ زبان ہے جو پہلے ویدک بھاشا، ویدک زبان یعنی ویدک سنسکرت تھی۔ یہی زبان ترقی کرتے کرتے جب اس صورت میں آگئی کہ اس میں علم قواعد کے تحت ایک طرح کی ترتیب اور سگھڑ پن آگیا تو اسے سنسکرت کہا جانے لگا۔ ہم اوپر سنسکرت لفظ کے معنی بتا چکے ہیں یعنی سنسکار کی ہوئی یا علم قواعد کی رو سے ترتیب میں لائی ہوئی سنواری ہوئی، سگھڑ بنائی ہوئی۔ یہ زبان ترقی کرتے کرتے اتنی میٹھی اور شستہ ہوگئی اور اس میں ایسے ادب کی تخلیق ہوئی کہ نقاد اسے دیوتاؤں کی زبان کہنے لگے۔

"संस्कृतं नाम दैवी वाक अन्वाख्याता महर्षिभिः"

یعنی مہارشی لوگ سنسکرت زبان کو دیوتاؤں کی زبان کہتے ہیں۔

اس زبان میں اس طرح ادب کی تخلیق شروع ہوئی اس کا صحیح طور پر پتا لگانا قریب قریب نا ممکن ہے۔ جس طرح ہزاروں کروڑوں لوگ پیدا ہوتے ہیں لیکن کسی ایک کا نام سیکڑوں صدیوں کے گزرنے کے بعد بھی زندہ رہ جاتا ہے اسی طرح ادبی دنیا میں بھی ہزاروں ادیب پیدا ہوتے ہیں لیکن کچھ زمانے کے گزرنے کے بعد کوئی ایک آدھ ادیب ایسا ہوتا ہے جس کا نام اور کام زندہ رہ جاتا ہے۔ جس طرح ایک بڑا آدمی کروڑوں معمولی آدمیوں کے ناموں کو بھلا دیتا ہے اور ایسا کردیتا ہے کہ گویا جیسا کہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اسی طرح ایک بڑا شاعر ایک بڑا ادیب ہزاروں ادب کی خدمت کرنے والے ناموں کو ہمیشہ کے لیے بھلا دیتا ہے۔ صدیاں بیت جاتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بس ایک ہی ادیب پیدا ہوا۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ایک سچے اور بڑے ادیب کے پیدا کرنے میں ہزاروں

ادیبوں کا ہاتھ ہوتا ہے جو اسے پیدا کرکے خود مٹ جاتے ہیں اور ان کے نام‌ونشان تک کا پتہ نہیں چلتا۔

یہی وجہ ہے کہ سنسکرت کے ادب کی تاریخ میں مہا کویوں کی یعنی بڑے شاعروں کی ادبی تصانیف ہی ہمارے سامنے ایک‌دم آتی ہیں۔ کیا شاعری میں کیا اور قصہ کہانیوں میں غرض ادب کے جس حصے کا بھی آپ مطالعہ کریں ایک‌دم آپ‌کو ایسے بڑے مصنفوں کی تصانیف ملیں گی جن کے ادبی زبان کے ڈھانچے کے بننے میں بہت سا زمانہ گزرا اور جس کی بنیاد میں بہت سے ادیبوں کے نام بھلا دیے گئے۔

یہی سبب ہے کہ سنسکرت ادب میں ہمارے سامنے سب سے پہلے شاعر رامائن کے لکھنے والے والمیکی آتے ہیں۔ ان کی "رامائن" نے نہ صرف اپنے سے پہلے شاعر کو اور ان کی ادبی کوششوں کو بھلا دیا بلکہ اپنے بعد کے آنے والے بہت سے شاعروں کو بھی اُبھرنے نہیں دیا کیونکہ جب تک کوئی رامائن کی ٹکر کی کتاب نہ لکھتا تب تک والمیکی کے سامنے ٹھیرنا کٹھن تھا۔ اس لیے رامائن کے بعد اگر کوئی شاعر زندہ رہا تو وہ مہابھارت کا مصنف ویدویاس تھا۔

والمیکی کی رامائن نے ہندستانیوں کے دلوں پر بہت بڑا اثر پیدا کیا۔ سیکڑوں صدیوں کے گزر جانے کے بعد اس کا احساس ہمیں آج بھی ہوتا ہے۔ رام‌چندر کو اگر کسی نے زندہ دنیا کی چیز بنائے رکھا تو وہ والمیکی کے امر قلم نے۔ آج ہم جو کچھ بھی رام‌چندر جی کے بارے میں جانتے ہیں اور رام‌چندر جی جو کچھ بھی ہیں وہ والمیکی کی دماغ کے اپج ہیں۔

والمیکی کو سنسکرت کا آدی کوی یعنے پہلا شاعر کہا جاتا ہے۔ والمیکی کس طرح شاعر بنے، اس کے بارے میں یہ کہانی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز وہ تمساندی میں اشنان کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہاں پرندوں کا ایک جوڑا جنھیں سنسکرت میں کرونچ کہتے ہیں آپس میں محبت کی کلولوں میں مست تھا۔ ایک چڑی‌مار آیا اور اس نے اپنے تیر سے اس جوڑے کے نر پرندے کو مار ڈالا۔ اس سے والمیکی کے دل‌کو سخت چوٹ پہنچی اور ان کے منہ سے یکایک بلا سوچے سمجھے یہ شعر نکل گیا:—

"मा निषाद प्रतिष्ठां त्वमगमः शाश्वतीः समाः ।
यत् क्रौञ्चमिथुनादेकमवधीः काममोहितम् ॥"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اے چڑیمار تو کبھی خوش‌حال اور آباد نہ ہو اور ہمیشہ ذلت سے اپنی زندگی بسر کرتا رہ کیونکہ تونے محبت کے رنگ میں رنگے ہوئے کھیلتے ہوئے اس پرندے کے جوڑے میں سے ایک کو مار ڈالا ہے۔

کہتے کو تو والمیکی کے منہ سے یہ شعر نکل گیا لیکن اس کے نکلتے ہی والمیکی سوچنے لگے کہ یہ شعر میرے منہ سے کیسے نکل گیا۔ یہ تو شلوک ہے۔ اس میں وزن ہے۔ سنسکرت کے پرانے مصنفوں کی رائے میں Seclnar غیر مذہبی سنسکرت کا یہ پہلا شلوک یعنی شعر ہے۔ اس کے بارے میں کالیداس نے رگھوونش میں لکھا ہے:

"श्लोकत्वमापद्यत यस्य शोकः"

یعنی جس کا سوگ شلوک میں بدل گیا۔ اسی طرح بھوابھوتی نے بھی والمیکی کو آدی کوی یعنی سنسکرت نظم کا بانی کہا ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے مشہور شاعروں کی بھی رائے ہے۔

جس طرح کسی کے ہاتھ ایک دم کوئی بڑا قیمتی ہیرا لگ جائے اسی طرح والمیکی کو یہ شعر معلوم ہوا۔ گھر آکر والمیکی بار بار یہ سوچنے لگے کہ جو کچھ میرے منہ سے آج نکل گیا ہے اس میں ایک سنگیت یا نغمہ ہے اور ایسا سوچتے سوچتے کہا جاتا ہے کہ انھیں الہام سا ہوا کہ انھیں اسی طرح نظم میں رامچندر جی کی کہانی لکھنی چاہیے۔ والمیکی نے راماین لکھ کر رامچندر کو ہمیشہ کے لیے زندہ دنیا کی چیز بنادیا۔ اس طرح والمیکی نے سنسکرت ادب کی شاندار بنیاد رکھی۔ راماین میں والمیکی نے اپنے کرداروں سے جو معیار پیش کیے ہیں وہ ہندستان کی تہذیب کی بنیاد ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب والمیکی کی راماین گائی جاتی تھی تو لوگوں کے دلوں پر بڑا گہرا اثر پڑتا تھا۔ راماین میں لکھا ہے کہ والمیکی نے اپنی راماین کو پہلے کُش اور لَو کو سکھلایا تھا اور جس وقت کُش اور لَو اس راماین کو رشیوں کی مجلسوں میں گاتے تھے تمام رشی محو ہوجاتے تھے۔ اس دن سے لے کر

آج تک راماین نے لوگوں کے دلوں پر جو سکہ بٹھایا تھا وہ آج تک بھی ویسے ہی قایم ہے۔

والمیکی کی زبان بالکل بول چال کی سنسکرت ہے۔ سیدھی سادی زبان ہے۔ اس میں کسی طرح کی بناوٹ نہیں ہے۔ اس میں جو تشبیہات پیش کی گئی ہیں وہ روزمرہ کی زندگی سے لی گئی ہیں؛ وہ خیالی یا کتابی نہیں ہیں۔ والمیکی کی راماین کی ایک ایک سطر میں والمیکی کا اپنا دل دھڑکتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ پھر اس سیدھی سادی بےساختہ زبان میں جو خوبی، جو حسن، جو ادا، جو بانکپن، جو شان، جو لطافت اور جو موھنی پھونکنے کا منتر ہے وہ پڑھنے والوں اور سمجھنے والوں کا دل ہی جانتا ہے۔

ھندستان کی زبانوں کے مشہور پنڈت Grearson نے لکھا ہے کہ بائبل کے بعد ساری دنیا میں اگر کوئی کتاب سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے تو وہ والمیکی کی راماین ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ والمیکی کی راماین نہیں ہے لیکن کسی کی بھی راماین کیوں نہ ہو اس کی عزت والمیکی کو ہی ملے گی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ کوئی بیس سال ہوئے جب کہ میں کشمیر کی ایک مجلس میں جو ایک باغیچے میں ہو رہی تھی کسی شاعر کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ جب میں نے کسی سلسلے میں راماین کا قصہ چھیڑا باغیچے کے سارے مالی اپنا کام چھوڑ کر آ گئے اور تلسی‌داس کی راماین کے دوہے اور چوپائیاں سننے لگے۔ مجھے اس دن یہ احساس ہوا کہ راماین کا اثر اب بھی کتنا اچھوتا ہے۔

اگر میں والمیکی کی راماین کے بارے میں اور والمیکی کی شاعری کے متعلق ہی کچھ کہنا چاہوں تو یہی ایک الگ مضمون بن جائےگا۔ میں چلتے چلتے ایک دو شلوکوں کا ذکر کر دیتا ہوں جس سے آپ کو رام کی زندگی کی خصوصیت کا کچھ پتہ چل سکےگا۔

رامچندر تخت نشین ہونے والے ہیں۔ سارے راج میں خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ یکایک رام کو یہ سندیسا دیا جاتا ہے کہ راج گدی تو اس کے چھوٹے بھائی بھرت

کو دی جائے گی اور اسے چودہ سال کے لیے کسی جنگل میں جاکر رہنا پڑے گا۔

جس وقت یہ خبر رامچندرجی کو دی گئی والمیکی لکھتے ہیں:—

"राज्यभारो तु काकस्य त्यजतश्च वसुन्धराम् ।
न मया लक्षितस्तस्य स्वल्पोऽप्याकारविभ्रम ॥"

اس کے معنی یہ ہیں کہ "جس وقت رامچندرجی سے یہ کہا گیا کہ تمہیں کل صبح راج گدی دی جائے گی اس وقت اور جب انہیں یہ حکم دیا گیا کہ انہیں چودہ سال کا بنواس دیا گیا ہے تب ان کے چہرے میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا۔ نہ راج گدی کے وقت خوشی تھی اور نہ راج چھوڑنے کے وقت غم تھا"۔

اسی طرح جب کہ رانی کیکئی رامچندر کو راجا کا حکم سنانے میں پس و پیش کررہی ہیں اس وقت رامچندرجی کہتے ہیں:—

"तद्ब्रूहि सत्यं देवि राज्ञो यदभिकाङ्क्षितम् ।
करिष्ये प्रतिजाने च रामो द्विर्नाभिभाषते ॥"

"اماں جان مہربانی کرکے مجھے جلد بتائیے کہ راجا کا کیا حکم ہے۔ آپ سچ مانیے کہ میں ویسا ہی کروں گا۔ رام دو باتیں کرنا نہیں جانتا، وہ تو ایک ہی بات کرتا ہے یعنی اس کے کہنے اور کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جو کہتا ہے وہ کرتا ہے"۔ والمیکی کے اس شعر کی گونج سارے سنسکرت اور ہندی کے ادب میں سنائی دیتی ہے۔

اس طرح راماین کے ہر ایک کردار کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ اوپر جو ذرا سا میں نے ذکر کیا ہے وہ نمونے کے طور پر ہے۔

والمیکی کے بعد جو شاعر ہوئے ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہت سے شاعر تو اپنے کلام کو راماین میں ہی ملاتے چلے گئے۔ کوئی شاعر جب تک والمیکی سے ٹکر نہ لے سکتا اور یا ان کی راماین کے مقابلے کی کوئی کتاب نہ لکھتا تب تک وہ گنتی میں آہی کیسے سکتا تھا۔ راماین نے سارے شاعروں کو اپنے رنگ میں ایسا رنگا کہ جس نے جو کچھ لکھا راماین میں ہی ملتا گیا۔ جیسے ایک بڑی ندی ہزاروں چھوٹی چھوٹی ندیوں کو اپنے اندر ملالیتی ہے اور اس طرح آگے بڑھتی جاتی

ھے اسی طرح والمیکی کے بعد کے شاعر راماین کی گنگا کی لہروں میں بہ گئے۔ ان کا کہیں پتہ نہیں۔ راماین نے شاعری کے میدان میں اتنا بڑا معیار قائم کردیا تھا کہ اس کے مقابلے میں کچھ پیش کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔ اس لیے راماین کے بعد بہت عرصے تک کوئی ایسا شاعر نہیں ملتا جو عام طور پر مقبول ہوا ہو اور جس کا نام سنسکرت ادب کی تاریخ میں زندہ رہ گیا ہو۔

راماین کے بعد اگر سنسکرت کے ادب کے میدان میں اور اس اونچے معیار کے سامنے کوئی تصنیف ٹھیرسکی اور عام طور پر مقبول ہوئی تو وہ مہابھارت تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہابھارت کا اثر عوام کے دلوں پر راماین سے شاید گہرا نہیں پڑا تو بھی مہابھارت نے سنسکرت کے ادب میں ایک نئی جان ڈالدی۔ کئی محققوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ھے کہ مہابھارت راماین سے پہلے لکھی گئی ھے لیکن جو زبان کے پرکھیا ھیں وہ سمجھ سکتے ھیں کہ راماین کی زبان اور مہابھارت کی زبان میں کتنا فرق ھے۔ راماین کی زبان میں ایک قسم کا بھولاپن ھے اور مہابھارت کی زبان میں ایک قسم کی شوخی ھے۔ مہابھارت کی زبان بھی بول چال کی زبان ھے لیکن بہت ستھری اور سنواری ہوئی۔ راماین کی زبان میں مٹھاس ھے لیکن مہابھارت کی زبان میں مٹھاس بھی ھے اور لوچ بھی۔ پھر مہابھارت میں پیچیدگیاں بھی بہت ھیں۔ جو سوال راماین میں بالکل سادہ معلوم ہوتے ھیں وہ مہابھارت میں آکر بہت پیچیدہ ہوگئے ھیں۔

بہت سے عالم مہابھارت کو سنسکرت کی انسائیکلوپیڈیا کہتے ھیں۔ کوئی مسئلہ لے لیجیے، آپ کو مہابھارت میں ضرور اس کا ذکر ملےگا۔ اس میں سیاسیات کے ہر ایک انسانی مسئلہ کو تفصیل اور باریکی سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ھے۔ سینکڑوں کہانیاں قصے جو عوام میں مشہور تھے مہابھارت میں قلمبند ہوئے ھیں۔ انھیں وجوہ سے مہابھارت کی حیثیت راماین سے بہت زیادہ بڑھ گئی ھے۔ یوں تو دنیا کی کسی زبان میں راماین اور مہابھارت سے بڑی رزمیہ نظمیں نہیں ھیں۔

کا بھگوت گیتا، جو سنسکرت ادب کی سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے مہابھارت کا ایک بہت ہی چھوٹا سا جز ہے - سچ تو یہ ہے کہ مہابھارت میں ایسی سینکڑوں گیتائیں بھری ہوئی ہیں لیکن وہ اتنی مقبول نہیں ہوئیں جتنی کہ بھگوت گیتا ہوئی ہے - بھگوت گیتا کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ ایک مذہبی مقدس کتاب بن گئی ہے - بھگوت گیتا کا اثر ہندستان کے باہر بھی پڑا ہے - امریکہ کے مشہور مصنف ایمرسن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ روز سویرے اٹھ کر بھگوت گیتا کا انگریزی ترجمہ پڑھا کرتے تھے - جب ڈاکٹر رویندرناتھ ٹاگور امریکہ تشریف لے گئے تھے تو وہاں وہ اس مکان پر بھی گئے تھے جہاں ایمرسن رہتا تھا - انھوں نے ان کا کتب خانہ دیکھا اور اس میں سے ایک کتاب نکالی جس میں بہت سے نوٹ لکھے ہوئے تھے - یہ کتاب اور کوئی نہیں تھی بھگوت گیتا تھی - جب رویندرناتھ ٹاگور نے ان کے بیٹے سے پوچھا کہ کیا مسٹر ایمرسن اس کتاب کو پڑھا کرتے تھے تو انھوں نے جواب دیا کہ روز سویرے وہ اسی کتاب کو پڑھا کرتے تھے اور یہ سب نوٹ انھیں کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں - سنسکرت میں بھگوت گیتا پر جتنی شرحیں ہوئی ہیں اور ہورہی ہیں اتنی شاید کسی اور کتاب پر نہیں ہوئیں - اسی سے اس کتاب کی مقبولیت معلوم ہوتی ہے - جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں مہابھارت میں سینکڑوں گیتائیں بھری ہوئی ہیں - اسی طرح مہابھارت میں بہت سی نیتیاں بھی ہیں جن میں کنک نیتی اور ودرنیتی بہت مشہور ہیں - ان نیتیوں میں اس بات کو کامل طور پر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک انسان کو اپنی زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیے -

مہابھارت کے معنے ہیں بڑا ہندستان - اس نام کی وجہ یہ ہے کہ مہابھارت کی لڑائی میں مدراس کے راجا سے لے کر قندھار تک کے راجا اور بنگال سے لے کر پھلور تک کے اس طرح سارے ہندستان کے تمام صوبہ جات کے راجا شامل ہوئے تھے - کوئی یدھشٹر کی طرف تھا اور کوئی دریودھن کی طرف - مہابھارت کی لڑائی ہندستان کی پرانی لڑائیوں میں سب سے بڑی تھی اور اس وجہ سے لفظ

'مہابھارت' کے معنے بھی 'بڑی لڑائی' (Great-war) کے ہوگئے ہیں۔ مہابھارت کے بارے میں کئی ہندو گھروں میں ایسا وہم پھیلا ہوا ہے کہ جس گھر میں مہابھارت کی کتاب ہو اس گھر میں لڑائی ہوجاتی ہے۔

حقیقت میں مہابھارت سنسکرت کے ادب کی ایک ایسی کتاب ہے جو ہر پہلو سے بےنظیر ہے۔ دنیا کے کسی زبان میں شاعری کی اس سے بڑی کوئی کتاب نہیں ہے۔ اگر کوئی پرانی ہندستانی تہذیب اور تمدن کا، پرانے آریوں کے ہر قسم کے کارناموں کا، اس کے عروج کا حال ایک کتاب سے جاننا چاہتا ہے تو وہ مہابھارت ہے۔ مہابھارت علم کا خزانہ ہے اور اس کی زبان میں اتنی مٹھاس اور روانی ہے اور اس کا طرز بیان اتنا جاذب ہے کہ ایک مرتبہ کتاب پڑھنا شروع کرنے پر پڑھنے والا سب کچھ چھوڑ سکتا ہے لیکن اس کتاب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مہابھارت کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کٹھن سے کٹھن اور بڑے سے بڑے زندگی کے مسئلوں کو اتنی سادگی اور گہرائی سے، اتنی آسانی اور باریکی سے اور ابتدا سے لےکر آخر تک اس خوبی سے سمجھایا گیا ہے کہ ایک معمولی ان‌پڑھ آدمی اور عالم دونوں کے لیے وہ ایک جیسی ہے اور پھر وہ ایسی پُرلطف ہے کہ جتنی دفعہ پڑھیے پھر پھر پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔

لارڈ Avebury نے جو سر آئیزک نیوٹن کے پڑوسی تھے اپنی مشہور کتاب Pleasures of Life میں کتابوں کی ایک فہرست تیار کی ہے جو دنیا کے ہر تہذیب یافتہ آدمی کو چاہیے وہ کہیں کا رہنے والا ہو ضرور پڑھنی چاہییں۔ اس فہرست میں انھوں نے مہابھارت اور راماین دونوں کتابوں کا نام لکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح ہمالیہ ہندستان کی ایک بےنظیر چیز ہے اسی طرح راماین اور مہابھارت بھی ہیں۔ یہ بھی ہمالیہ کی ان اونچی چوٹیوں کی طرح رعنا سر شان سے اٹھائے کھڑی ہوئی ہیں جہاں تک کسی کو پہنچ ہونی قریب قریب ناممکن ہے۔

صدیوں تک ہندستان کے ادب میں راماین اور مہابھارت ہی کو دہرایا جاتا رہا ہے اور دونوں کتابوں نے ہندستان کے ادیبوں کے دلوں پر کچھ ایسا جادو کیا کہ انہوں نے اگر کچھ لکھا تو راماین اور مہابھارت کو لکھا اور یا پھر ان کے قصوں کو لکھا۔ ہندستان کے کسی صوبہ کی کوئی زبان لے لیجیے اس میں جب کبھی ادب کی ابتدا ہوئی ہے تو انہیں دونوں کتابوں کی بدولت اور پھر بھی کوئی شاعر ان تک نہیں پہنچنے پایا۔

"نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا"

کئی شاعروں نے راماین اور مہابھارت کو نظم کیا لیکن تمام زور لگانے پر بھی والمیکی اور ویاس کا انداز نصیب نہ ہوا۔

یہ مدری بات تھی کہ مہابھارت کے بعد جلد کوئی شاعر سنسکرت ادب کے میدان میں سر اٹھا کر کھڑا نہ ہو سکا۔ جس طرح ہندستان میں تاج محل بننے کے بعد بھی عمارتیں تو بہت سی بنیں لیکن فن عمارت کی دنیا میں خاموشی سی قایم ہے اسی طرح مہابھارت کے بعد شاعر تو بہت سے ہوئے لیکن ادب کی دنیا میں خاموشی سی قایم رہی۔

اس خاموشی کو توڑنے والا اور راماین اور مہابھارت کے مصنف والمیکی اور ویاس کے سامنے سر اٹھا کر کھڑا ہونے والا، سنسکرت کے ادب اور شاعری میں ایک نئی روح پھونکنے والا اگر کوئی شاعر آیا تو وہ کالیداس ہے۔ اس کی زبان میں ایک حسینہ کی دونوں طرف سے نوکدار بڑی بڑی آنکھوں کی مست شوخ اور بانکی چتون، اس کے پتلے نازک ترین ہونٹوں کے بیچ سگھڑ دانتوں کی صاف میٹھی اور چلبلی مسکراہٹ، اس کی مٹکتی چال اور ادائیں ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کالیداس کی زبان میں سنسکرت زبان کی جوانی ابھر آئی ہے۔

یہ تو ناممکن ہے کہ مہابھارت کے بعد کالیداس سے پہلے کوئی شاعر نہ ہوا ہو کیونکہ کالیداس کی شاعری سے پہلے پچاسوں نئی بحریں پیدا ہوچکی تھیں جن کا

پتہ راماین اور مہابھارت تک میں نہیں ملتا ہے ۔ ان تمام بحروں کے بننے میں کافی وقت لگا اور کاویہ یعنی شاعری لکھنے کے جس اسلوب بیان کو کالیداس نے اختیار کیا ہے وہ بھی آہستہ آہستہ اس درجہ کو پہنچا ۔ ہمارے پاس جو کچھ ذخیرہ ہے اس کی بنیاد پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مہابھارت اور راماین کے بعد سنسکرت زبان اور اس کے ادب میں جو ترقی ہوئی وہ پہلے پہل کالیداس کی شاعری میں ہمارے سامنے آتی ہے ۔ Dr. Keith اور کئی اور محقق کالیداس سے پہلے اشوگھوش کو رکھتے ہیں۔ اشوگھوش نے بدھ مذہب کو اختیار کرلیا تھا ۔ انھوں نے بدھ چرت نام کی ایک نظم کی کتاب سنسکرت میں لکھی ہے ۔ ڈاکٹر کیتھ انھیں پہلی صدی عیسوی میں رکھتے ہیں اور کالیداس کو چوتھی صدی عیسوی میں ۔ لیکن بہت سے ماہر شرقیات نے یہ ثابت کیا ہے کہ کالیداس پہلی صدی عیسوی سے قبل ہوئے ہیں ۔ یہ مہاراجا وکرمادتیہ کے دربار کے شاعر تھے ۔ اشوگھوش ان کے بعد کے شاعر ہیں ۔ کچھ بھی ہو، یہ تو ماننا پڑے گا کہ اشوگھوش نے سنسکرت کے ادب پر وہ اثر نہیں چھوڑا جو کالیداس نے ۔

والمیکی اور ویاس تو رشی کہلاتے ہیں لیکن کالیداس سنسکرت کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں ۔ انھوں نے اپنی شاعری سے سنسکرت کے ادب کو جو فروغ دیا اور اس نے جو زندگی پیدا کی وہ ان کے بعد بھی قایم رہی ۔ والمیکی اور ویاس نے جو کتابیں لکھی تھیں اس میں چوبیس ہزار اور چھبیس ہزار شلوک تھے اور اتنے یا اس سے زیادہ شلوک لکھے بغیر ادب کی دنیا میں مقبولیت مشکل تھی ۔ یہ سلسلہ بھی کالیداس نے توڑا ۔ کالیداس نے چھوٹی چھوٹی نظموں میں وہ لطافت اور حسن پیدا کیا کہ شاعر بننے کے لیے بڑی بڑی کتابوں کے لکھنے کی ضرورت نہ رہی ۔

کالیداس کی زبان سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے زمانے تک سنسکرت زبان کی بہت ترقی ہوچکی تھی اور اس میں بہت سے علم و فن کی کتابیں لکھی جاچکی تھیں ۔ ان کی بہت سی تشبیہات ایسی ہیں جن کی بنیاد علمی کتابیں ہی ہوسکتی ہیں ۔

ان کی کتابوں سے یہ صاف نمایاں ہوتا ہے کہ اس وقت تک بہت سے علم جیسے رقص، موسیقی، دیومالا، سیاسیات، معاشیات، نجوم، مکان کا علم، ریاضی وغیرہ ترقی کی آخری حد تک پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے بہت سے علموں کا تو وہ خود ماہر معلوم ہوتا ہے۔

ان کی کتابوں کے پڑھنے سے یہ بھی صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قریب قریب سارے ہندستان میں اچھی طرح نہ صرف پھر چکے تھے بلکہ انھوں نے یہاں کے مختلف صوبوں کے قدرتی نظاروں کا پورا پورا لطف اٹھایا تھا اور ان کے خاموش ترنم کو ایک شاعر کی حیثیت سے سنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اگر ایک طرف اپنے شاعرانہ انداز میں ہمالیہ کی تصویر کھینچی ہے تو دوسری طرف مالابار کی۔ ایک طرف سمندر کی تو دوسری طرف میدانوں کی۔ ایک طرف جنگلوں کی تو دوسری طرف بستیوں کی۔ ایک طرف اگر سرجو ندی کی تو دوسری طرف سپرا، نربدا اور کاویری کی۔ ایک طرف پٹنہ کی تو دوسری طرف کانچی کی۔ ان کی شاعری اساڑھ کے بادلوں کی طرح سارے ہندستان کے آسمان میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیل گئی ہے جس کی زندگی پیدا کرنے والی بوندوں نے سنسکرت کے ادب کو نئی کھیتیوں کی طرح ہرا بھرا اور ہمیشہ کے لیے لہلہاتا بنا دیا ہے۔ ان کی نظموں میں ہندستان کے قریب قریب ہر حصے کا بیان ہونے کی وجہ سے کوئی کہتا ہے کالیداس کشمیر کے تھے کوئی کہتا ہے بنگال کے تھے۔ کوئی کہتا ہے کہ اُجین کے رہنے والے تھے کوئی انھیں شمالی ہندستان کا اور کوئی انھیں جنوبی ہندستان کا کہتے ہیں۔

ان کے زمانے کے بارے میں بھی کوئی ایک رائے نہیں ہے۔ آٹھویں صدی قبل عیسی سے لے کر پانچویں صدی بعد عیسی تک ان کی تاریخ مقرر کی گئی ہے۔ اس کے باوجود بھی جبکہ بہت کچھ لکھا جاچکا ہے ابھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کالی‌داس کہاں اور کس زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔

کالی‌داس کی شاعری میں آنکھ اور دل کا، زبان اور جذبات کا، مصوری اور موسیقی کا، سادگی اور شوخی کا، اصلی اور خیالی دنیا کا پرلطف اور حیرت انگیز

قدرتی اور قدرت سے بالاتر خدائی ملاپ ہوا ہے۔ سنسکرت زبان بڑی خوش نصیب ہے کہ اسے کالی‌داس جیسا شاعر ملا۔ سنسکرت نے کالی‌داس کو اور کالی‌داس نے سنسکرت کو بنا دیا۔ پھر کالی‌داس کی شاعری میں جو میٹھا، گدگدا، بانکا، پینا، تیکھا اور چبھتا ہوا فراق ہے وہ سنسکرت کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ تشبیہات کی دنیا کا تو وہ بادشاہ ہے۔ اس کی تشبیہیں سادی، انوکھی اور بڑے پتے کی ہیں۔

کالی‌داس نے سات کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں تین ڈرامے ہیں اور چار شاعری کی کتابیں ہیں۔ ڈراموں کے بارے میں میں اپنے اس مضمون میں کچھ نہ لکھوں گا۔ باقی چار کتابوں میں رگھوونش، کمار سنبھو، رت سنہار اور میگھ دوت ہیں۔ ان میں سب سے بڑا رگھوونش ہے۔ اس کے انیس باب ہیں۔ رگھو خاندان کے انیس راجاؤں کا اس میں بیان دیا گیا ہے۔ رگھوبنسیوں کا خاندان سورج بنسیوں کا خاندان ہے۔ مہاراجا دلیپ سے لےکر مہاراجا اگنی‌متر تک کے تمام مہاراجاؤں کا اس میں سلسلہ‌وار بیان ہے۔

ڈاکٹر ونیا کمار سرکار کی رائے میں ہندو مہاراجاؤں کی تہذیب کا، ان کی حکومت کا، سماجی حالات کا، رسم و رواج کا، ان کی بہادری کے کارناموں کا اور رعایا کو خوش‌حال رکھنے کے طریقوں کا اگر کسی کتاب سے پتا چلتا ہے تو وہ 'رگھوونش' ہے۔ یہ سچ ہے کہ 'رگھوونش' کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے تو بھی اس میں تاریخ کا اور خاص کر ہندوؤں کی تہذیبی تاریخ کا بہت سا مسالہ ہے۔ اس میں رگھوونشی راجاؤں کی لڑائی کا بیان، ان کے زندگی کے اصول، طرز حکومت، لڑکیوں کا سوئمبر، شادیوں کی رسمیں، ان کا شکار کھیلنا اور دوسرے شغل وغیرہ قریب قریب ہر پہلو پر بڑی خوبی سے لکھا گیا ہے۔

رگھوونش کے چھٹے باب میں کالی‌داس نے اندومتی کے سوئمبر کی جو تصویر کھینچی ہے وہ صرف کالی‌داس ہی کھینچ سکتے تھے۔ اندومتی ودربھ یعنی برار کے مہاراجا کی چھوٹی بہن تھیں۔ اس کے سوئمبر میں ہندستان کے تمام صوبجات کے راجا مہاراجا آئے ہیں۔ مہاراجا کے محل کے ایک عالی‌شان بڑے کمرے میں سونے

کو راج گدیوں پر ترتیب سے تمام راجا بیٹھے ہوئے ہیں۔ جس وقت اندومتی پالکی میں سے اتر کر اس عالیشان کمرے میں پیر رکھتی ہے اس وقت راجاؤں کی آنکھوں اور دلوں کی جو حالت ہوتی ہے اور جس طرح اندومتی کا دھیان کھینچنے کے لیے اسی حرکتیں خود بخود ان سے ہو جاتی ہیں جنہیں وہ شاید خود نہیں سمجھ سکتے تھے انہیں کالیداس نے بڑی خوبی اور حسن سے اپنی شاعری میں قلمبند کردیا ہے۔ ایک طرف اکیلی لڑکی تھی اور دوسری طرف ہندوستان کے تمام راجا۔ لڑکی کیا تھی خدا کے حسن کے خیال کی زندہ مجسم تصویر تھی اور راجا کیا تھے بس ایک دل جو زور سے دھڑک رہا تھا اور اپنی خواہش کو خاموشی کے ساتھ بتانا چاہتا تھا۔ سوئمبر شروع ہوتا ہے۔ ایک ایک مہاراجا کا پوری تعریفوں کے ساتھ تعارف کرایا جاتا ہے اور اندومتی کچھ کہے بغیر آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جن جن راجاؤں کو چھوڑ کر وہ آگے بڑھتی چلی جاتی تھی ان راجاؤں کی جو حالت ہو رہی تھی اس کا بیان شاعر نے یوں کیا ہے :—

> "संचारिणी दीपशिखेव रात्रौ,
> यं यं व्यतीयाय पतिंवरा सा।
> नरेन्द्र मार्गाट्ट इव प्रपेदे,
> विवर्णभावं स स भूमिपाल ॥"

جس طرح رات کے وقت شاہراہ پر چلتی ہوئی ایک لالٹین جن محلات کے پاس سے گزرتی جاتی ہے اور انہیں گھپ کالے اندھیرے میں چھوڑتی چلی جاتی ہے، اسی طرح اندومتی جس جس مہاراجہ کے پاس سے آگے بڑھ گئی اس اس راجا کا منہ کالا پڑتا چلا گیا۔ جیسے ایک لالٹین کی روشنی کے سامنے راستے کا ایک مکان رات میں چمک اٹھتا ہے اور جب وہ روشنی آگے نکل جاتی ہے تو وہ مکان اندھیرے میں کالا سیاہ ہو جاتا ہے اسی طرح وہ دیے کی لو کی طرح جگمگاتی اندومتی پہلے جس راجا کے پاس کھڑی ہوتی تھی اس کے منہ پر خوشی کی چمک دوڑ جاتی تھی لیکن جوں ہی وہ آگے بڑھ جاتی تھی اس کا منہ مایوسی سے کالا پڑ جاتا تھا۔ اس شعر میں لالٹین کی تشبیہ سے شاعر نے جو پتے کی بات کہی ہے اس کا لطف بیان سے باہر ہے۔

قصہ بہت لمبا ہے۔ اسی طرح سارے سوئمبر کا بیان شاعر نے بڑے شاعرانہ طریقے سے کیا ہے۔ آخر میں اندومتی مہاراجا رگھو کے بیٹے اج کے گلے میں جےمالا پنہاتی ہے۔ ساتویں باب میں جب اج اندومتی کو ساتھ لےکر دھوم دھام سے اپنی راج‌دھانی ایودھیا میں آتے ہیں اور ان کی سواری شہر کے بڑے بڑے راستوں سے گزرتی ہے اس وقت مکانوں میں بیٹھی ہوئی عورتیں اپنے مکان کی کھڑکیوں میں کس طرح دوڑ دوڑ کر آتی ہیں اس کا نظارہ کالی‌داس نے اپنی قلم سے اس باب میں دکھایا ہے۔ کوئی عورت اپنے بال بنا رہی تھی وہ ویسے ہی بالوں کو پکڑے کھڑکی میں کھڑی ہوکر ایک ٹک دیکھنے لگی۔ کوئی مہاور لگا رہی تھی وہ اپنے گیلے مہاور سے فرش کو لال کرتی ہوئی دوڑ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ کوئی ساڑی باندھ رہی تھی اسے اج کو اور اندومتی کو دیکھنے کی اتنی زبردست خواہش تھی کہ وہ آدھی ساڑی باندھے اپنے ہاتھوں سے کمر میں لٹکتی ہوئی ساڑی کو پکڑے کھڑکی میں آکر کھڑی ہوگئی ہے۔ راستے بھر کے مکانوں کی کھڑکیوں میں تمام عورتیں ہی عورتیں کھڑی تھیں۔ ان کے گورے لال منہ اور کالی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام کھڑکیوں میں لال کنول کھلے ہوئے ہیں جن پر آنکھوں کی شکل میں کالے بھنورے منڈلا رہے ہیں۔

"विलोलनेत्र भ्रमरैर्गवाक्षा : सहस्रपत्राभरणा इवासन्"

اسی طرح رگھوونش کے ہر ایک باب میں اس نے ایک ایک چیز کو لیا ہے اور اس کی ایسی مکمل تصویر کھینچی ہے کہ وہ ادبی دنیا کی ایک انمول ملکیت بن گئی ہے۔

ان کی دوسری کتاب «کمار سنبھو» ہے اس کی کہانی کو انھوں نے پرانوں سے لیا ہے۔ اس میں سترہ باب ہیں جس میں کل آٹھ کالی‌داس کے لکھے ہوئے کہے جاتے ہیں۔ باقی کسی دوسرے گمنام شاعر نے اس میں ملا دیے ہیں۔ «کمار سنبھو» میں کالی‌داس نے مہادیو اور پاربتی کی شادی کا بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ہمالیہ پہاڑ کے بیان سے شروع ہوتی ہے کیونکہ پاربتی ہمالیہ کی بیٹی تھی۔ شیوجی نے اپنی پہلی بیوی ستی کے مرنے کے بعد یہ مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ اب شادی نہیں کریں گے۔ لیکن

دیوتاؤں کی خواہش تھی کہ وہ شادی کریں۔ اس لیے راجا اندر نے کام‌دیو کو بلایا اور کہا کہ کچھ ایسا کرو کہ شیوجی کے دل میں پھر محبت کی چاہ پیدا ہوجائے۔ کام‌دیو اس کام کے لیے تیار ہوگئے اور وہ بسنت یعنی موسم بہار کو اپنے ساتھ لےکر شیوجی کے دل کو گرمانے کے لیے وہاں آئے جہاں شیوجی اپنی ریاضت اور تپسیا میں لگے ہوئے تھے۔ چاروں طرف بہار کا موسم چھا گیا، تمام چرند، پرند محبت کی رنگ رلیوں میں مست ہوگئے۔ ہندو پرانوں میں لکھا ہے کہ کام‌دیو پھولوں کے تیروں سے مارتا ہے۔ ایک دن جبکہ بہار کا موسم پوری جوانی پر تھا کام‌دیو ایک پیڑ پر چھپ کر بیٹھ گئے۔ ٹھیک موقع پر جب پاربتی ان کے سامنے کھڑی تھی کام‌دیو نے اپنے پھولوں کے تیر کو چلا دیا اور سچ مچ ایک لمحے کے لیے شیوجی کا دل بھی ڈانواں ڈول ہوگیا۔ مگر وہ جھٹ سنبھل گئے اور جو انہوں نے غصے میں بھر کر آنکھ اٹھائی تو ان کی تیسری آنکھ سے آگ نکل پڑی اور بیچارہ کام‌دیو جل بھن کر راکھ ہوگیا۔ پاربتی مایوس ہوگئی۔ پاربتی کہنے لگی کہ لوگ کہتے ہیں خوبصورتی بڑی چیز ہے لیکن جس خوبصورتی سے میں شیوجی کا دل بھی نہ جیت سکی اس خوبصورتی پر لعنت ہے۔ وہ اپنا سب گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں چلی گئی اور جوگن بن گئی۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ بھری برسات میں سخت گرمی اور کڑاکے کی سردی میں کھلے بدن رہی۔ اس نے اتنی سخت تپسیا کی کہ آخر شیوجی جو اس کی جوانی اور حسن کو دیکھ کر ذرا بھی نہیں پسیجے تھے ہل گئے اور وہ ایک طالب‌علم کا بھیس بنا کر گئے اور پاربتی سے پوچھا کہ وہ شیوجی سے کیوں شادی کرنا چاہتی ہے۔ شیوجی کی اس نے بہت برائی کی۔ کہا کہ اس شیوجی سے تم شادی کرنا چاہتی ہو جو مسان میں رہتے ہیں، ہڈیوں کی مالا پہنتے ہیں، جن کے گلے میں سانپ رہتے ہیں، جو ننگے بدن رہتے ہیں۔ لیکن پاربتی جواب دیتی ہے کہ 'ہاں' وہ انہیں سے شادی کرنا چاہتی ہے اور وہ ان کی کسی قسم کی برائی کو نہیں سن سکتی۔' آخر میں دونوں کی شادی ہوتی ہے۔ جہاں حسن، کام‌دیو کے پھول اور بہار کا موسم فتح نہیں پاسکے وہاں پاربتی کی ریاضت فتح پاتی ہے۔ اس میں سے

ایک ایک سین کالی‌داس نے جس فن اور استادی کے ساتھ جس میٹھی، نازک، پرلطف چلبلی اور شفاف زبان میں جس ادبی حسن کے آخری درجے کے معیار میں کھینچا ہے وہ لاجواب ہے۔ آخر میں جب شیوجی شادی کے لیے راضی ہوجاتے ہیں تو کالی‌داس نے ایک ایسی میٹھی سی چٹکی لی ہے جس سے ان کی زندہ دلی کا پتہ چلتا ہے وہ لکھتے ہیں :—

"तस्मिन संयमिनामाधे जाते परिणयोन्मुखे ।
जहु : परिग्रह व्रीडाँ प्राजापत्यास्पीस्वन, ॥

یعنی جب شیوجی جیسے دل پر قابو رکھنے والے بڑے رشی شادی کرنے کے لیے تیار ہوگئے تو بیچارے چھوٹے چھوٹے رشیوں کی جو شادی کرنے میں شرماتے تھے۔ شرم چلی گئی۔ وہ کہنے لگے کہ جب شیوجی نے شادی کرلی تو ہم شادی کرنے میں کیوں شرم کریں اس میں جو لطیف مذاق اور زندہ دلی ہے اسے آپ محسوس کرسکتے ہیں۔

ان کی ’رت سنہار‘ کتاب میں ہندستان کے تمام موسموں کی بڑی شستہ زبان میں تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس کے انگریزی میں بہت سے ترجمے ہوئے ہیں اور اسی کے نمونے پر بعد میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس کے بعد کالیداس کی اس کتاب پر آتا ہوں جو دنیا کی ادبی تصانیف میں سے ایک ہے اور وہ ہے ’میگھ دوت‘۔ اگر کالیداس اپنی زندگی میں صرف ایک یہی کتاب لکھتے تو بھی وہ سنسکرت زبان کے سب سے بڑے شاعر کہلاتے۔ اس کا تخیل بالکل اچھوتا ہے۔ اس کی زبان اتنی بےساختہ اور منجھی ہوئی ہے کہ اس کی بحر بھاری بھاری بادلوں کی سست چال سے چلنے والی ہے اور اس میں جو نغمہ ہے وہ نکلتا تو بحر میں سے ہے لیکن جب وہ شعر کے ساتھ مل جاتا ہے تو اس کا اثر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ میگھ دوت میں جس طرح یکش "اساڑھ کے پہلے دن کے بادل" کو اپنے محبت کا سندیسا دیتا ہے، جس طرح اسے اپنے گھر تک پہنچنے کا راستہ بتاتا ہے، جس طرح اپنے گھر اور اپنی بیوی کی پہچان بتاتا ہے، جس طرح اس سارے راستے کا بیان کرتا ہے، جہاں سے

بادل جائے گا اور مختلف جگہوں پر پہنچنے سے بادلوں کا جو دیکھنے کے لایق نظارہ بنے گا اس کی جھلک دکھاتا ہے اور پھر اپنے دل کی حالت اور وہ سندیسا جو لکھا ہو ضرور سنسکرت زبان میں گیا ہے لیکن ہر دل ہر زبان اور ہر دیس کے لیے یکساں ہے ۔ میگھ دوت کا پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زبان کس کمال تک پہنچ سکتی ہے ۔ اگر کبھی ادبی دنیا کے معجزات گنے جائیں گے تو ان میں میگھ دوت بھی ایک ہوگا ۔

کالیداس کے بعد اشوگھوش آتے ہیں۔ انھوں نے بدھ چرت لکھا ہے جو پورا نہیں ملتا۔ اس میں انھوں نے تمام بدھ کی زندگی نظم میں لکھی ہے۔ اس کی زبان پرلطف اور بالکل سادہ ہے ۔ کہتے ہیں کہ ان کا لکھا ہوا ایک ڈرامہ کا مسودہ ملا ہے لیکن وہ بھی پورا نہیں ہے ۔ اشوگھوش کے بعد بہت سے شاعر ہیں ۔ ان میں بھٹی کا نام مشہور ہے ۔ انھوں نے بھٹی کاویہ نام کی مشہور کتاب لکھی ہے ۔ اس میں لکھی تو انھوں نے رام کی زندگی ہے لیکن ایسی زبان میں لکھی ہے جس سے سنسکرت کے علم قواعد کا استعمالوں کا بلاتکلف آسانی سے علم ہوجاتا ہے ۔ اسی وجہ سے یہ کتاب سنسکرت کے ادب میں مشہور ہے ۔ بھٹی کے بعد بہت سے شاعر ہوئے لیکن جس شاعر نے سنسکرت میں ایک انوکھی چیز پیدا کی اس کا نام بھاروی ہے ۔ ان کی صرف ایک کتاب ملتی ہے ۔ اس کا نام کرات ارجونیہ ہے ۔ اس کے اٹھارہ باب ہیں ۔ اس کی کہانی مہابھارت سے لی گئی ہے لیکن شاعر نے اسے اس طرح سے پیش کیا ہے کہ وہ اس کی اپنی بن گئی ہے ۔ سنسکرت میں بھاروی اس لیے مشہور ہیں کہ وہ جو بات کہتے ہیں وہ بڑی کھری اور وزن دار ہوتی ہے ۔ اس نے ایسے بہت سے مصرعے لکھے ہیں جو کہاوتوں کی شکل میں بدل گئے ہیں ۔ اتنے پر بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ سنسکرت کے ادب میں بھاروی کی جو عزت ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ اس نے اپنی کہانی کا خاکہ مہابھارت سے لیا ہے تو بھی اس نے اس میں تازگی اور نیا پن پیدا کرلیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ 'گیتا' کے بعد سنسکرت کے ادب میں اگر کوئی کتاب ہے جو ایک انسان میں مردانگی کے جذبات پیدا کرسکتی ہے تو وہ بھاروی کی کرات ارجونیہ ہے اس کا پہلا

باب یہاں سے شروع ہوتا ہے : یدھشٹر نے اپنے ایک جاسوس کو بھیجا ہے کہ پتہ لگاکر آؤ کہ دریودھن کس طرح راج کررہا ہے ۔ جاسوس آتا ہے اور تمام خبریں سناتا ہے پاس میں دروپدی بیٹھی ہوئی تمام حالات کو سن رہی ہے ' سنتے سنتے اسے اس وقت کا خیال آجاتا ہے جب کہ وہ راجا تھے۔ جاسوس کے چلے جانے کے بعد دروپدی یدھشٹر سے کہتی ہے کہ ہم وہی ہیں جو راج محلوں میں رہتے تھے اور آج جنگلوں میں پڑے ہیں ' ہمیں صبح نہانے کے لیے نگاڑے (نقارے) اور طرح طرح کے باجے بجتے تھے ' بھاٹ اور بندی گانے گاتے تھے لیکن آج گیدڑوں کی کان پھاڑنے والی چلاہٹ ہمیں روز صبح جگاتی ہے ۔ اے راجا تم لڑائی کرو اور اپنا راج واپس لو اور اگر یہ نہیں ہوسکتا تو ڈاڑھی اور جٹائیں بڑھالو اور دنیا ترک کردو ' کشتری کہلانا بند کردو ۔ اسی طرح اگلے باب میں بھیم‌سین اسی طرح کی باتیں کرتا ہے ۔ تیسرے باب میں جب ارجن ہتھیاروں کو حاصل کرنے کے لیے جانا چاہتا ہے اس وقت کا سین شاعر نے خوب کھینچا ہے ۔ دروپدی بالوں کو کھولے ہوئے ارجن کو دروازے تک پہچانے کے لیے آتی ہے اور کہتی ہے :

''दुश्शासनामर्सं रजो विकीर्णै-
रेभिस्सना थैरिव भाग्यनाथै : ।
केशै: कदर्थीकृत वीर्यसार :-
कच्चित् स एवासि धनजयस्त्वम्'' ॥

یعنی کیا تو وہی ارجن ہے جس کی باھوں کی طاقت کے سامنے دشاسن نے میرے ان بالوں کو میرے پتیوں کے ہوتے ہوئے مجھے اناتھ سمجھ کر غصے میں آکر کھینچا تھا اور تم چوں نہیں کرسکے تھے ۔

اس کے بعد اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آتے ہیں اور شاعر کہتا ہے کہ ارجن ان آنسوؤں کو اپنے راستے کی توشے کی طرح اپنے ساتھ لے گیا ۔ اس کتاب کا سب سے پر زور باب گیارھواں ہے ۔ اس میں جو باتیں کہی گئیں ہیں ان سے بھاروی نے سنسکرت کے ادب میں ہمیشہ کے لیے جگہ قایم کرلی ہے ۔ ان کے اس باب کے شعروں اور شلوکوں میں وہ گرمی بھری ہوئی ہے کہ شاید کبھی آگ بھی ٹھنڈی پڑسکتی

ہے لیکن اس کے شعروں میں جو آگ ہے وہ کبھی بجھ نہیں سکتی۔ بھاروی کا کرات ارجونیہ انسان کو سمجھ دار اور بہادر بنانے والا ہے۔

بھاروی کے بعد ماگھ آتے ہیں۔ ماگھ جتنے بڑے شاعر تھے اس سے بڑے سنسکرت زبان کے عالم تھے۔ ان کو سنسکرت زبان پر جتنا عبور حاصل تھا بہت کم کو ہوا ہے ان کی ایک کتاب ملتی ہے جس کا نام شیشوپال‌ودھ ہے۔ اس کی کہانی کا خاکہ بھی مہابھارت سے لیا گیا ہے۔ ماگھ کے بارے میں سنسکرت میں یہ شعر مشہور ہے:

"नव सर्गे गते माघे नव शब्दो न विद्यते"।

یعنی اگر کوئی شخص ماگھ کی کتاب کے نو باب پڑھ جائے تو اسے سنسکرت میں کوئی نیا لفظ ہی نہیں ملے گا اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت زبان پر ان کو کتنا عبور حاصل تھا۔ اس کتاب کے بیس باب ہیں۔ ماگھ کا طرز بیان پرزور اور اس کی زبان شستہ اور بامحاورہ ہے۔

ماگھ کے بعد کئی شاعر ہوئے لیکن ان میں سے شری ہرش کا نام بہت مشہور ہے۔ انھیں نے نیشدھ چرت نام کی مشہور کتاب لکھی ہے۔ اس کے لیے انھیں بہت سا مسالہ مہابھارت سے ملا ہے۔ نل اور دمینتی کی کہانی کو جو اہمیت ہے وہ نیشدھ چرت کی وجہ سے ہے۔ اس کے بائیس باب ہیں لیکن کہتے ہیں کہ شری ہرش نے ساٹھ اور بعض کہتے ہیں کہ ایک سو بیس باب لکھے تھے۔ شری ہرش نے اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ جس طرح ایک حسین عورت ایک بچے کے دل کو نہیں کھینچتی اسی طرح میری شاعری کا لطف معمولی آدمی نہیں اٹھاسکتے۔ شری ہرش کو اپنی زبان پر پورا عبور حاصل تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے کئی شلوکوں کے بتیس اور اس سے بھی زیادہ معنے نکالے جاتے ہیں۔

اس طرح ہم بارھویں صدی تک آپہنچتے ہیں۔ میں نے صرف بڑے بڑے شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بیچ میں اور ان کے بعد بہت سی شاعری کی چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان میں سے کئی بہت زیادہ مقبول ہوئی ہیں۔ جیسے

بھرتری ہری کی تین شتکیں ہیں۔ 'نیتی شتک'، 'شرنگار شتک' اور 'ویراگیہ شتک'، شتک کے معنی ہیں سو۔ یعنی جس میں سو شلوک ہوں۔ اسی طرح بہت سے ستوتر قصیدے وغیرہ سنسکرت میں لکھے گئے جن سے زبان منجھتی چلی گئی۔ زبان کی ترقی اتنی ہو چکی تھی کہ شاعر لفظوں کو بڑی خوبی سے لکھنے لگے چاہے اس کے معنے میں کوئی خوبی پیدا نہ ہو، لیکن لفظوں کی کچھ ایسی بناوٹ ہو جس سے بہت سے معنے نکل آئیں۔ یہ بات تب ہی ممکن ہے جبکہ زبان پختہ ہوجائے۔ وہ ایسی حالت کو پہنچ جائے کہ اس میں اتنا لچکیلاپن آجائے کہ جدھر چاہیں موڑ لیا جائے اور اس سے جو اور جتنے معنے چاہیں نکال سکیں۔ اس شاعری کا نہ سہی لیکن لفظوں کا بہت بڑا فن ہے کہ بات تو کچھ نہ ہو لیکن لفظ ایسے ہوں کہ اس سے سیکڑوں معنی پیدا ہوجائیں۔ اس فن میں راگھو پانڈویم کے مصنف کوی‌راج نے کمال حاصل کیا ہے۔ یہ کتاب اسی شلوک میں لکھی گئی ہے جس میں راماین اور مہابھارت لکھی گئی ہے۔ لکھنے کا یہ کمال ہے کہ دونوں مہابھارت اور راماین ایک ہی شلوک میں سے نکل آتی ہیں اور پھر مزہ یہ کہ لفظوں میں کچھ کھینچ تان نہیں کرنی پڑتی۔

کچھ بھی ہو اس طرح کی شاعری میں جذبات کا مزہ نہیں مل سکتا اور اس طرح زبان پیچدار الجھنوں والی بنتی چلی گئی۔ لکھنے والوں کے پاس خیالات نہیں تھے جذبات نہیں تھے۔ تھی سو ایک زبان۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا لفظوں پر ہی شاعری کا دارومدار تھا۔ اس طرح سیکڑوں چترکاویہ سنسکرت میں بن گئے؛ جیسے لکڑی پر نقاشی کی جاتی ہے اسی طرح یہ ایک قسم کی لفظوں کی نقاشی تھی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ تیرھویں صدی تک سنسکرت کے ادب میں اسی طرح کا سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن اس کے بعد ہندستان کے حالات میں فرق پڑا اور اس کا اثر سنسکرت زبان میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ حالات کے بدلنے سے سنسکرت کی شاعری میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں یہ فارسی کا اثر تھا۔ فارسی کے مطالعہ سے سنسکرت میں نئی بحریں پیدا ہوئیں قافیہ اور ردیف بھی سنسکرت کی شاعری میں داخل ہوا اور اس کی وجہ سے سنسکرت میں ایک نیا سنگیت پیدا ہوگیا۔

شاعری میں نئے انداز پیدا ہوگئے اور نئے خیالات کا بھی اثر پڑا اور طرز میں فرق پڑ گیا۔ پہلے ورن چھند یعنی لفظوں کی بحریں زیادہ مروج تھیں پھر ماترا چھند یعنی بحریں حرفوں کی بجائے مسلمہ علامتوں کی گنتی پر آگئیں۔ پہلے بحروں میں قافیہ ردیف نہیں تھے، مسلسل ورس تھی یعنی نظم معری اب نظم میں ردیف، قافیہ بھی جاری ہوگئے۔ جسے اپبھرنش کہتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ آریہ سپت شتی میں آریہ بحر میں جو دو دو سطروں میں ایک ایک مضمون باندھا گیا ہے اس میں بھی شاید فارسی کے شعروں کے انداز کا کچھ اثر تھا۔ انہیں سپت شتی میں سے ہندی "ستسئی" بنیں۔ دو دو سطروں یا چار سطروں میں ایک مضمون باندھا جانے لگا۔ آریہ بحر کی جگہ دوہوں کا استعمال ہوا۔ پنڈت راج جگن ناتھ کی بھامنی ولاس میں بھی اس کا کچھ اثر دکھائی دیتا ہے۔ کبھی وہ بادل، کبھی بھنورے، کبھی پھول، کبھی ہوا، کبھی ہنس یا طوطے کو تعاقب کرکے ایک ایسا نکتہ کہہ دیتے ہیں جو زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر صادق آجاتا ہے۔ یہ شاہجہاں کے دربار کے شاعر تھے اور دارا شکوہ ان کے سرپرست تھے۔

سنسکرت میں جو نیا سنگیت بحر اور قافیہ اور ردیف جاری ہوئے وہ جے دیو کے گیت گووند میں نظر آتے ہیں۔ یہ بنگال کے رہنے والے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ راجہ لکشمن سین کے درباری شاعر تھے۔ ان کو بارھویں یا تیرھویں صدی کا شاعر کہا جاتا ہے۔ انہوں نے سنسکرت میں جس سنگیت کو جاری کیا وہ بالکل نیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے بحروں پر نیا اثر پڑا ہے۔ سنگیت کے لحاظ سے سارے سنسکرت کے ادب میں گیت گووند کے جوڑ کی دوسری کتاب نہیں ہے۔

میں نے اپنے اس چھوٹے سے مضمون میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سنسکرت کی ادبی زبان کس طرح پیدا ہوئی، اس کی شاعری کا ارتقا کس انداز پر ہوا اور کن بڑے شاعروں نے اسے ایسی شکل دی کہ وہ آگے ترقی کرتی چلی گئی۔ میں نے اس مضمون میں سنسکرت کے بہت سے دوسرے پہلوؤں پر کچھ نہیں لکھا ہے۔ خاص کر قصہ کہانی، سنسکرت کی نثر اور اس کا ارتقا اور نثر کے بہترین لکھنے والوں

کے بارے میں بھی میں نے کچھ نہیں لکھا۔ پھر قصہ کہانی بھی ایک قسم کی نہیں، بہت قسم کی ہیں۔ ان میں سے کئی قصوں کا اثر تو قریب قریب دنیا کی ہرایک زبان پر پڑا ہے۔ کبھی وقت ملا تو میں ان کے بارے میں سلسلہ‌وار اپنے خیالات آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس مضمون میں تو میں نے سنسکرت زبان اور اس کی شاعری کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے۔

(یہ مقالہ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے کوآپریٹیو یونین میں پڑھا گیا تھا۔)

مقالات گارساں دتاسی

(۲)

(ترجمه از پروفیسر عزیز احمد صاحب جامعه عثمانیه حیدرآباد۔ دکن)

۴۔ سرکاری سررشتۂ تعلیم کو هندستان نے بالکل اپنا لیا ھے۔ هندستانی اس کے عادی هوچکے هیں اور اسے خوشی سے قبول کرچکے هیں۔ ثبوت کے لیے میرے پاس اوده کی پرانی حکومت کی مثال موجود ھے جس کی رپورٹ (سنه ۱۸۷۱ع و سنه ۱۸۷۲ع) مجھے اس محکمے کے ناظم مسٹر کولن براوننگ (Colin Browning) نے بھیجی ھے۔ یه رپورٹ جو بڑی احتیاط سے مرتب کی گئی ھے اور جو فولیو تقطیع کے ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ھے۔ اوده نے سررشتۂ تعلیم کی اصلی حالت کا صحیح نقشه پیش کرتی ھے۔ یه تو ناممکن ھے که میں یہاں ان تمام تفصیلات کو نقل کروں جو انھوں نے پیش کی هیں اور جن میں انھوں نے میرے «مقالات» کے طریقۂ بیان کو پسند کیا ھے' لیکن ان میں سے چند اطلاعات اس قابل هیں که میں نے انھیں اپنی یادداشت میں درج کرلیا ھے۔ مثلاً یه که زمانے میں تعلیم کا رواج هوتا جارها ھے یه ایک ایسی چیز ھے جو بہت مفید اور قابل تعریف ھے اور هندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کے لیے مفید ھے۔ یه طریقۂ تعلیم همارے یہاں کے اس طرز تعلیم سے بہت ملتا جلتا ھے جس کو هم "Leçon particulières" کے نام سے موسوم کرتے هیں۔ یه خانگی طریق تعلیم عام نسوانی مدارس کی ترقی میں حارج نہیں هوتا۔ اس طریقے سے جو عورتیں تعلیم پاتی هیں ان کی حیثیت وهی هوتی ھے جو نارمل اسکولوں کی تعلیم‌یافته معلّمات کی۔

بنگال میں بھی پردہ‌نشین خواتین میں تعلیم بہت ترقی کررهی ھے۔ پندرہ سو سے زیادہ خواتین اپنے گھروں هی میں روزانه سبق لیتی هیں ان میں سے زیادہ‌تر ان

ہندستانیوں کی بہو بیٹیاں ہیں جنھوں نے سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے یا مشنریوں کی بیویاں اور لڑکیاں ہیں شمالی ہندستان میں بھی تعلیم نسواں کی یہی حالت ہے[1]۔

لکھنؤ ورنیکلر مڈل کلاس اسکول جن کا مقصد یونیورسٹی کے لیے ایسے طلبہ کو تیار کرنا ہے جو انگریزی میں جوابات نہیں دینا چاہتے ہیں گورنمنٹ کے عطیہ کی مدد سے امریکن اور انگریز مشنریوں کی زیر نگرانی قائم ہیں اس سہولت کی وجہ سے ان ہندستانیوں کی تعداد جو انگریزی سیکھ رہے ہیں گھٹ گئی ہے۔ لیکن گورنمنٹ نے اپنے وعدے کے مطابق ان اسکولوں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے دو سو نو کو ملازمتیں دی ہیں۔

بہ کثرت طلبہ اردو اور ہندی سیکھ رہے ہیں۔ فارسی، عربی اور سنسکرت کی طرف بھی توجہ کی جا رہی ہے۔ مسلمان جن پر اکثر الزام عائد کیا جاتا ہے، ہندوؤں سے زیادہ ان ذرایع تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جو حکومت نے فراہم کیے ہیں۔ ہندو طلبہ کی تعداد چالیس ہزار تین سو پچپن ہے اور مسلمان طلبہ کی تیرہ ہزار نو سو اٹھارہ یعنی ایک چوتھائی سے زیادہ حالانکہ اودھ میں مسلمانوں کی آبادی پوری آبادی کے دسویں حصے سے بھی کم ہے۔ صرف اس ایک صوبے میں مختلف ذرایع سے سرکار نے اس کام کے لیے دو لاکھ تینتیس ہزار تین سو تینتالیس روپیے عطا کیے ہیں۔ ہائی اسکول بھی ابتدائی اور ثانوی مدارس کی طرح ترقی کر رہے ہیں۔ زبانوں کی حد تک پتہ چلتا ہے کہ انگریزی اور اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمہ ہوتا رہتا ہے، نظم میں بھی اور نثر میں بھی۔ اردو سے انگریزی میں اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے اور ہندی اور فارسی کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ سنہ ۱۸۷۱ع کے ختم تک ان مدارس فوقانیہ میں دو ہزار دو سو طلبہ زیر تعلیم تھے جن میں سے آٹھ سو ستّر مسلمانوں کی تعداد ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کلکتہ یونیورسٹی میں داخلے کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔

---

1 Indian Mail ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۷۳ع۔

جن مقامات پر اعلیٰ درجہ کے سرکاری مدارس موجود ہیں وہاں محض واقعات کی رفتار کے باعث دیسی مدارس بند ہوتے جارہے ہیں۔ پھر بھی ان کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ صرف لکھنؤ میں چوراسی کے قریب ایسے مدارس موجود ہیں۔

صوبجات شمال مغربی میں تعلیم کو ہمیشہ فروغ حاصل رہا ہے۔ ڈیوک آف آرگائل نے الہ آباد کے مرکزی کالج کے قیام کی منظوری دی ہے جس کی بنیاد پڑ چکی ہے[1]۔

سررشتۂ تعلیم صوبۂ بمبئی کی رپورٹ بابت سنہ ۷۲-۱۸۷۱ع سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں مدارس کی تعداد میں چھے سو چالیس کا اضافہ ہوگیا ہے اور طلبہ کی تعداد میں بیس ہزار آٹھ سو ستاسی کا۔ چودہ ملین آبادی کے لیے تین ہزار چھے سو اٹھانوے مدارس موجود ہیں جن میں اٹھانوے ہزار نو سو ستر طالب‌علم تعلیم پاتے ہیں۔

پونے کا سول انجینیرنگ کالج جس کا رپورٹ میں ذکر ہے، طبی کالج، کلیۂ قانون فنون کے کالج اور مدارس اور دیگر تمام ادارہ جات علم بہت اچھی حالت میں ہیں۔

حیدرآباد دکن میں سر سالار جنگ نے ایک بہت قابل مسلمان عنایت الرحمن خاں کو جو پہلے دھلی کالج میں پروفیسر تھے، ناظم تعلیمات مقرر کیا ہے[2]۔

میسور میں جو کالج آنجہانی مہاراجا نے قایم کیا تھا اس میں اب پانچ سو سے زاید طلبہ ھندستانی، کنڑی اور انگریزی کی تعلیم پارہے ہیں۔ گزشتہ مارچ کی پہلی تاریخ کو جلسۂ تقسیم انعامات کی صدارت کرنل میلسن[3] (Mulleson) نے کی تھی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ نوجوان مہاراجا نے نوے روپے کی دو تھیلیاں عطا فرمائی ہیں اور وہ خود اسی طرح کی تین اور ان نادار طالب‌علموں کی مدد کے لیے دینے

۱ علیگڑھ اخبار مورخۂ ۲۴ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع۔

۲ ان صاحب کے متعلق ایک مضمون میری "تاریخ ھندوی و ھندستانی" میں ملاحظہ فرمائیے۔

۳ Allen's Indian Mail ۲۴ مارچ سنہ ۱۸۷۳ع۔

والے ہیں جن کے امتحانات کے نتایج اچھے رہے ۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر کوئی مسلّمہ قابلیت رکھنے والا ہندستانی نوجوان اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے انگلستان جانا چاہتا ہے تو وہ خود اس کے ذرایع فراہم کریں گے[1] ۔

مہاراجا بلرام پور نے سالانہ بارہ ہزار روپیہ کا عطیہ ایک میڈیکل کالج کے قیام کے لیے دینے کا وعدہ کیا ہے ۔ کالج کا تعلق بلرامپور ہسپتال لکھنؤ سے رہے گا[2] ۔

ہندستان میں تعلیمی ترقیوں کی رفتار مستقل ہے ۔ سنہ ۱۸۷۰ع کے بعد سے ایک ملین سے زیادہ طلبہ سرکاری مدارس میں زیر تعلیم ہیں اور چونکہ ہندستان کی تین چوتھائی آبادی اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی استطاعت نہیں رکھتی اس لیے ان طلبہ کی تعداد جو تعلیم پا رہے ہیں اس لحاظ سے اچھی خاصی ہے ۔ تمام مدارس سرکاری نگرانی میں ہیں ۔ ان میں خاص مدارس، امدادی مدارس، ورنیکلر مدارس، قانون، طب، انجنیرنگ کے مدارس اور نسوانی مدارس شامل ہیں ۔ ان موخرالذکر مدارس کا وجود آئے پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی خانگی زندگی پر بہت اہم اثر پڑے گا ۔ صرف بنگال میں سنہ ۱۸۶۹ع میں لڑکیوں کے لیے دو سو چالیس مدارس تھے جن میں نو ہزار پینتیس طالبات تعلیم پاتی تھیں ۔ ختم سال سنہ ۱۸۷۰ تک بمبئی میں سڑسٹھ ہزار نو سو چار لڑکے اور لڑکیاں مدارس میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں ۔ اسی سال صوبۂ شمال مغربی میں دو لاکھ ایک ہزار لڑکے اور دس ہزار لڑکیاں زیر تعلیم تھیں ۔ چند سال سے صوبۂ متوسط میں طلبہ کی تعداد اسی ہزار کے قریب ہے ۔ کلکتہ یونیورسٹی میں جو لندن یونیورسٹی کے نمونے پر قائم کی گئی ہے، سنہ ۱۸۶۶ع میں پندرہ ہزار کے قریب طالب علم تھے اور اب تو ان کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے ۔ انھیں نتائج کے باعث بمبئی اور مدراس میں بھی یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں ۔ ہندستان کا سب سے زیادہ سرسبز تعلیمی ادارہ غالباً کلکتہ کا میڈیکل کالج ہے جو سنہ ۱۸۳۴ع میں سر ولیم بینٹنک (Sir William Bentinck) کے زمانے میں قائم کیا گیا تھا ۔ اس کا

۱؎ علیگڑھ اخبار ۲۸ فروری سنہ ۱۸۷۳ع ۔ ۲؎ Allen's Indian Mail ۷ فروری سنہ ۱۸۷۳ع ۔

سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ جو طالب علم اپنی ذات پات اور تعصّبات کو چھوڑ دیتے ہیں انھیں اس کے ذریعے اپنی فنی قابلیت سے عوام‌الناس کو فائدہ پہنچانے کا موقع دیا جاتا ہے۔

لاہور کا میڈیکل کالج بھی ترقی کر رہا ہے اور حیدرآباد دکن کے مدرسۂ طبیہ سے جس میں پوری تعلیم ہندستانی میں دی جاتی ہے، دو نہایت معزز خاندانوں کے چشم و چراغ نوجوانوں نے ڈاکٹری کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہے اور اعلیٰ حضرت حضور نظام کے وزیر سالار جنگ نے ایک خاص دربار میں جو اس موقع کے لیے ۱۴ فروری سنہ ۱۸۷۳ع کو منعقد کیا گیا تھا، ان کو اسناد عطا کیں[1]۔

صوبۂ شمال مغربی کے ناظم تعلیمات مسٹر کیمپسن (Kempson) نے ان مدارس کے لیے جو سرکاری امداد کے طالب ہیں کچھ شرائط مقرر کی ہیں اور ان کے لیے اس طرح کے آئین و ضوابط بنائے ہیں جن میں ہر ذرا سی تفصیل کو پیش نظر رکھا ہے[2]۔

لاہور کا مدرسہ ترقی کر رہا ہے۔ چار سال کے اندر طلبہ نے انگریزی کی تحصیل میں اتنی ترقی کی ہے جس کی نظیر اس کے پہلے چھے یا سات سال میں نہیں ملتی۔ ہندی سے غافل ہوئے بغیر وہ انگریزی لکھ بول سکتے ہیں۔ ان دونوں زبانوں میں ان کے رہبر پنڈت دھرم‌نارایں ہیں جو اس ادارے کے میر منشی ہیں اور دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں[3]۔

اسلامیہ کالج امرتسر کی حالت جو حال ہی میں قایم ہوا ہے، امید افزا ہے۔ تعلیم پانچ جماعتوں پر منقسم ہے جن میں بتدریج تقریر، خفی اور جلی خوشنویسی قرآن و تفسیر، انشائے اردو و فارسی، گلستان بوستان اور قصاید عرفی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اعلیٰ جماعتوں کے بےاستطاعت طلبہ کی کھانے کپڑے سے مدد کی جاتی ہے۔ مزید معلومات کے لیے پرنسپل صاحب کی مہیا کی ہوئی اطلاعات ملاحظہ فرمائیے[4]۔

---

۱ انڈین میل یکم اپریل سنہ ۱۸۷۳ع۔

۲ Supplement to the Institute Gazette ۴ جون سنہ ۱۸۷۳ع۔

۳ اخبار انجمن پنجاب ۱۱ اپریل سنہ ۱۸۷۳ع۔

۴ پنجابی۔ ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع۔

چونکہ اس کالج کا پہلا سال ختم ہو چکا ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے جو علم اور مذہب کی ترقی کے طالب ہیں اس کے متعلق معلومات فراہم کی جائیں تاکہ اس ادارے سے انہیں اطمینان حاصل ہو اور وہ اس کے استحکام اور ترقی کی کوشش کریں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ بحمداللہ اس کالج کا افتتاح ماہ رمضان سنہ ۱۲۸۸ھ (دسمبر سنہ ۱۸۷۱ع) میں ہوا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کی جو عام حالت ہے جو مذہبی اور دنیوی علم تک پہنچانے اور ان لوگوں کے لیے جو مفلس اور محتاج ہیں یا محض سستی اور کاہلی کی وجہ سے قعر جہالت میں گرے ہوئے ہیں اور اس طرح پڑے ہوئے ہیں کہ خود وقت ان کو ملامت کرتے ہیں، علم کی تحصیل اور اس کی اشاعت کے ذریعے فائدہ رسانی کا باعث ہو۔ دو پروفیسر فارسی اور ریاضی سکھاتے ہیں، ایک حفظ قرآن کی تدریس پر مامور ہے اور علاوہ عربیہ کی تعلیم کالج کے ڈائرکٹر کے سپرد ہے۔

ابتدا میں محض چند لڑکے عربی پڑھتے تھے اور آمدنی کے ذرایع بہت کم تھے۔ لیکن خدا کے فضل سے کچھ عرصے کے بعد کافی تعداد میں طلبہ تعلیم پانے لگے اور اخراجات کے لیے چندے وصول کیے گئے۔ اس کالج کے افتتاح کی اطلاع کی ہر جگہ تشہیر کر دی گئی تھی اور توقع تھی کہ اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلےگا پھر بھی بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے جن کی تفصیل بہت طویل ہے، شروع میں جس ترقی کی امید تھی حاصل نہ ہوسکی، نہ چندے وصول ہوئے اور نہ کافی تعداد میں طالب علم شریک ہوئے۔ لیکن خدا کی رحمت لامتناہی ہے، استقلال کو کام میں لایا گیا اور طالب علم شریک ہونے لگے اور درس لینے لگے۔ وہ قرآن پڑھتے ہیں اور لفظ بہ لفظ ہندستانی میں اس کا ترجمہ کرتے ہیں اور تاریخ اسلام اور عربی زبان کی تعلیم پاتے ہیں (۷۳) طالبعلموں کے نام رجسٹر میں درج ہیں جن میں سے ۲۳ شہر سے باہر کے رہنے والے ہیں باقی شہر کے ہیں۔ چندے بھی کافی تعداد میں وصول ہوئے ہیں۔"

۔ مولوی سید احمد خاں کی تجویز کہ علی گڑھ میں مسلمانوں کے لیے ایک عظیم الشان کالج قائم کیا جائے اب تک کامیاب نہیں ہوئی۔ لیکن وہ ہے راہ مستقیم پر اور بہت جلد "یونیورسٹی" کا لقب اختیار کرلے گی۔ اس مشہور مسلمان کی ان تھک کوششوں کے طفیل اس ادارے کے لیے چندے کی تعداد گزشتہ مئی تک بہتّر ہزار روپیہ تک پہنچ گئی تھی۔ پھر بھی یہ رقم ناکافی ہے جیسا کہ سید صاحب نے اپنی تقریر میں جو اسی زمانے میں کی تھی بیان کیا تھا۔ اس پُرجوش مصلح کا مقصد کئی لاکھ روپے جمع کرنے کا ہے جن کا فراہم کرنا بہت دشوار ہوگا کیونکہ جو لوگ فطرت انسانی سے واقف ہیں انہیں یہ معلوم کرکے تعجب نہ ہوگا کہ اس برگزیدہ انسان پر بھی جس نے اپنے آپ کو اپنے ہم‌مذہبوں کے مذہبی اور دنیوی مفاد کے لیے وقف کردیا ہے بعض لوگ تہمتیں عاید کرتے ہیں۔ اس بحث پر علی گڑھ اخبار[1] نے ایک عربی شعر نقل کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے "جو درخت زمین سے یوں ہی اُگ نکلتے ہیں وہ تو بھلے چنگے رہتے ہیں مگر لوگ اسی درخت کو پتھر مارتے ہیں جو بارآور ہوتا ہے"۔

ان تمام حملوں کی طرف توجہ کیے بغیر جو اس پر کیے جاتے ہیں، یہ مرد مسلمان اپنے راستے سے نہیں ہٹتا اور اپنے خیالات پر قائم ہے۔ نوروز سال ہجری سنہ ۱۲۹۰ھ (مطابق ۲۸ فروری سنہ ۱۸۷۳ع) کے موقع پر اس نے ایک مضمون لکھا جو ۱۴ مارچ کے علی گڑھ اخبار کے بارہ کالموں پر مشتمل ہے۔ جابجا دلچسپ حوالے ہیں۔ اس کا مقصد ہندستان کے تیس ملین مسلمانوں کو جوش دلانا ہے کہ وہ اپنی مذہبی، علمی اور ادبی پستی کو چھوڑیں اور ایک عظیم الشان اسلامی یونیورسٹی کی بنیاد کا خواب دیکھیں جس میں ان کی مادری زبان اردو میں تعلیم کے ذریعے ان کی ذہنی زندگی نشوونما پائے گی۔

کمیٹی کے ان ارکان میں جن کا کام انگلستان میں چندہ وصول کرنا ہے جہاں یہ کام ہمدردی سے کیا جارہا ہے، خصوصیت سے قابل ذکر میرے دوست

---

۱ شمارۂ ۲۳ مئی سنہ ۱۸۷۳ع۔

ٹی۔ ایچ لارڈ اسٹینلی آف آلڈرسلی (T. H. Lord Stanley of Aldersley) سر چارلس ٹریولین (Sir Charles Trevelyan) اور مسٹر ایڈورڈ ٹامس[1] (Mr Edward Thomas) ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چندے کی وصولی میں کامیابی کا سہرا ان لوگوں کے سر رہیگا۔

ایک اور انجمن پٹنہ میں مسلمانوں کے لیے ایک یونیورسٹی یا اعلی پیمانے پر ایک کالج کھولنے کی ہے۔ صوبۂ بہار میں مسلمان بڑی کثرت[2] سے آباد ہیں اور اردو بولتے ہیں[3]۔

منگلور ضلع سہارنپور میں حال ہی میں ایک مدرسۂ اسلامی کا افتتاح کیا گیا ہے جس کے لیے چندے کی کوشش کی جارہی ہے[4]۔

امرتسر میں ایک ابتدائی مدرسے کے لیے جو خاص طور پر مسلمانوں کے لیے کھولا گیا ہے سرکاری طور پر خوشنودی کی اطلاع ملی ہے[5]۔

حکومت پنجاب ان کتابوں کے مضامین اور طرز نگارش کی طرف سے غافل نہیں ہے جو مدرسوں کی درسیات میں داخل ہیں۔ ایک کمیٹی اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ ان کتابوں کی جانچ کرے اور ان میں سے جو ناقص ہوں ان کی اصلاح کرے یا بجائے ان کے دوسری کتابیں تجویز کرے اور جو کتابیں ناقص قرار دی جائیں گی ناظم تعلیمات ان کی اصلاح کرے گا[6]۔ اس کمیٹی میں دو ہندو اور دو مسلمان شامل ہیں جو اپنی زبانوں میں بھی بہت قابل ہیں اور انگریزی میں بھی قابل ہیں۔

صوبۂ شمال مغربی میں بھی ایک کمیٹی اسی غرض سے قایم کی گئی تھی کہ وہ نصاب کی کتابوں کی جانچ کرے۔ مسٹر ایم۔ایس ہاول (M. S. Howell) جن کی

---

۱ علی گڑھ اخبار ۱۸ جولائی سنہ ۱۸۷۳ء۔

۲ اس صوبے کی آبادی (۲۲۳۰۰۰۰۰) ہے جس میں سے (۱۵۰۰۰۰۰) مسلمان ہیں۔ اخبار انجمن پنجاب ۱۳ اپریل سنہ ۱۸۷۲ء۔ ۳ Blochmann, "School Geography of India."

۴ اخبار انجمن پنجاب ۱۲ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ء۔ ۵ اخبار انجمن پنجاب ۱۰ جون سنہ ۱۸۷۳ء۔

۶ بمبئی میں ناظم تعلیمات اس وقت تک کتابوں کو مدارس میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا جب تک وہ خود انہیں پسند نہ کرے۔

قابلیت صرف اردو ہی میں مسلّم نہیں بلکہ عربی و فارسی میں بھی مسلّم ہے؛ اس کے سکریٹری ہیں[۱]۔

حکومت بنگال نے بھی انہیں مقاصد کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ اس کمیٹی میں مسٹر کولن براؤننگ (Mr. Colin Browning) ناظم تعلیمات، درگا پرشاد اور دو منشری شامل ہیں۔

مزید برآں جابجا عام کتب خانے کھلتے جا رہے ہیں۔ صرف صوبۂ بمبئی میں (۱۶۷) کتب خانے ہیں۔ کئی مشہور ہندستانیوں کی کوشش سے بنارس میں بھی ایک کتب خانہ کھلا ہے[۲] جس کے لیے مہاراجا وزیانگرم نے چھے ہزار روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔

حکومت نے طے کیا ہے کہ ہندستان کی ہر بڑی عدالت میں قانون کتب کا ایک کتب خانہ کھولا جائے[۳]۔ لندن میں ان ہندستانیوں کے لیے جو وہاں جاتے ہیں ایک کتب خانے کا افتتاح کیا گیا ہے اور وہ ابھی سے ہندستانی کتابوں سے مالامال ہے۔

مسلمانوں کی بیداری نہ صرف علمی و ادبی نتائج بلکہ مذہبی اثرات سے بھی ظاہر ہو رہی ہے[۴]۔ حکومت انگریزی بھی ان کی طرف عنایت کی نظروں سے دیکھ رہی ہے کیونکہ لارڈ نارتھ بروک (Lord Northbrook) نے مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کے ذرایع اختیار کیے ہیں اور وہ اس طرح کہ ان کے لیے ادب اور تمدن اور اپنی السنۂ ماضیہ کی تحصیل کے ذرایع فراہم کیے ہیں۔ بمبئی میں ان زبانوں کی تحصیل کا انتظام کیا گیا ہے، کلکتہ اور ہگلی میں مدرسے کھولے جا رہے ہیں اور کئی اور مدرسے کھولنے کی تجویز ہے۔ طالب علموں کے لیے رقمیں عطا کی گئی ہیں[۵]۔

۱ علی گڑھ اخبار ۱۹ اگست سنہ ۱۸۷۳ ع -

۲ علی گڑھ اخبار ۱۹ مارچ سنہ ۱۸۷۳ ع اور پنجابی ۱۱ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ع -

۳ پنجابی ۴ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ع - علی گڑھ اخبار ۳۰ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ع -

۴ اس سال میں چین کے مسلمانوں کے متعلق کوئی اچھی خبر نہیں سنا سکتا جیسے کہ میں نے گزشتہ سال سنائی تھی کیونکہ نہ صرف یہ کہ صوبۂ یونان کی بغاوت فرو کردی گئی بلکہ پنتھائیوں کو مکمل شکست ہوئی اور وہ بہت بیدردی سے

(بر حاشیہ ۶۴۴)

اس صدی کی ابتدا میں بنگال کے مسلمانوں ہندوؤں سے میل جول کی وجہ سے ضلالت کی حالت میں مبتلا تھے اور بہت سی قبیح اور رسمیں انھوں نے اختیار کر لی تھیں۔ مگر ادھر تین سال سے وھابیت کی اصلاحی کوششوں کے مقابل ھندستان میں کثرت مذھبی ادب ان کے لیے فراھم ھوسکا اور بہت سی عربی اور فارسی کتابیں ہوم کے لیے اھم بنا کر پیش کی گئیں اور اب پھر وہ مذھب میں پلٹے ھوتے جارھے ھیں۔ ھندوؤں کے عقائد کا اثر ان پر بھی پڑا ھے لیکن باوجود اس کے کہ یہ مسلمان بھی ان ھندوؤں کی طرح مغربی تعلیم کی پیداوار ھیں پھر بھی مسلمانوں میں پیدا ہوئی مذھبی امور پر پیدا ھوئی ھے اور عوام الناس میں پھیل رھی ھے۔ ایک نئی تصنیف جس کی خوبیوں کو ھمارا مسیحی تمدن پوری طرح تسلیم کرسکتا ھے، حضرت محمد کے متعلق حال ھی میں لکھی گئی ھے۔ سید امیرعلی[1] نے اس کتاب میں آنحضرت پر محققانہ نظر بیان کیے ھیں۔ اس کتاب کا نام "A Critical examination of the life and teachings of Mohammad" ھے۔ کتاب کے فاضل نوجوان مصنف مشہور شاعر ھند میرتقی کے بھتیجے ھیں۔ ان کا ارادہ مغلیہ سلطنت کے متعلق بھی ایک کتاب لکھنے کا ھے۔ اپنے گزشتہ تبصرے[2] میں مجھے ھندستانی کے متعلق ان کے خیالات شائع کرنے کا موقع ملا تھا۔ جب وہ ھندستان جارھے تھے تو راستے میں پیرس میں مجھے ان سے گفتگو کا موقع ملا اور اس زبان کے متعلق میرے خیالات میں ان کے مباحث کی وجہ سے بہت تقویت پہنچی۔

(بقیہ حاشیہ ۶۴۳)

کا قبضہ ہو گیا۔ حبشیوں نے ان کے سردار سلیمان کو بھی قتل کردیا اور انھیں وحشیوں نے ان کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنریوں اور ان کے مقلدین پر بھی بہت ظلم کیے۔

* انڈین میل ۱۵ جولائی اور ۵ اگست سنہ ۱۸۷۲ع۔

---

[1] انڈین میل مورخہ ۱۷ فروری سنہ ۱۸۷۱ع میں اس ھندستانی نوجوان کے متعلق ایک دلچسپ مضمون نکلا ھے۔

[2] La-langue et la litterature hindoustanies بابت سنہ ۱۸۷۲ع صفحہ ۶ و ۷۔

اگرچہ ہندو مغربی علوم میں ترقی کررہے ہیں مگر خود اپنے علوم کی طرف کافی توجہ نہیں کررہے ہیں۔ علی‌گڑھ اخبار[1] میں ایک ہندو نے اس پر اظہار افسوس کیا ہے۔ مسلمانوں کی یونیورسٹی کے قیام کی اطلاع نے اس کے جذبۂ حب وطن کو بیدار کیا ہے۔

وہ لکھتا ہے: "ایک ملک میں جہاں علیحدہ علیحدہ دو قومیں موجود ہوں اگر ان میں سے ایک اپنی دماغی ترقی کی کوششیں کرتی رہے اور دوسری غافل رہے تو موخرالذکر قعر مذلت میں گر جائےگی۔ درحالیکہ ہمارے ہم‌وطن مسلمان اپنے علوم کو از سرنو زندہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں ہم ہندو بدنصیبی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ اس عظیم ادارۂ تعلیم میں جس کو مسلمان قایم کررہے ہیں یوں تو سبھی انسانی علوم سکھائے جائیں‌گے لیکن خصوصیت سے مذہبی تعلیم پر توجہ کی جائےگی۔ بلکہ یہ کہنا ایک حد تک غلط نہ ہوگا کہ یہی مقصد ان کے پیش نظر ہے۔ مسلمان کے مذہبی علوم اسی حالت پر قایم ہیں اور اب پرانی شوکت کے ساتھ محض ان کی اشاعت کا سوال باقی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے علوم مذہبی کے محض نشانات باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی تقریباً معدوم ہیں۔ لیکن یہ حالات غفلت کا بہانہ نہیں بن سکتے بلکہ ان کی وجہ سے وہ (ہندو) اور بھی زیادہ قابل الزام ہیں۔ کیا وہ یہ پسند کریں‌گے کہ ان کی ہم‌وطن قوم ایک روز اپنے مذہب کی روشنی سے آزادی حاصل کرے اور وہ اسی طرح اس ملک میں جہاں انھوں نے ایسا شاندار ماضی گزارا ہے، ذلّت اور جہالت میں مبتلا رہیں؟"

"اڈیٹر صاحب! میں خود ہندو ہوں اور میرا طرز خیال مسلمانوں کا سا نہیں۔ سرکاری تعلیم سے مجھے کوئی شکایت نہیں کیوں‌کہ وہ ضروریات دنیوی

---

1 شمارۂ ۲۲ نومبر سنہ ۱۸۷۲م۔

کے لیے ہے۔ اپنی مذہبی تعلیم کی ذمہ داری خود ہم پر عاید ہوتی ہے اور ہمیں بھی وہی کرنا چاہیے جو مجوزہ اسلامی یونیورسٹی کے قایم کرنے والے مسلمان کر رہے ہیں۔ ایک خاص مذہبی ادارۂ تعلیم قایم کرنے کے لیے ہمیں سرکاری ادارہ جات تعلیم سے تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ پانچ یا چھ گھنٹے تک دنیوی علوم کی مسلسل تعلیم دینے کے بعد صرف ایک گھنٹے کے لیے ہندو طلبا کو قابل پنڈتوں سے مذہبی تعلیم دلانے سے ... نہیں ہوسکتی۔ اوقات درس کے بعد ایک دو یا کئی گھنٹے کی مذہبی تعلیم کا انتظام گورنمنٹ کی زیر نگرانی ہوسکتی ہے۔ اس طرح ہم بھی خدا کی رحمت سے مستفید ہوسکیں گے اور ایک مستحکم اتحاد قومی کی بنیاد پڑسکے گی۔

"میں خوب جانتا ہوں کہ میں جس رائے کا یہاں اظہار کر رہا ہوں وہ فوری توجہ سے محروم رہے گی لیکن جس طرح نقارخانے میں طوطی کی آواز بھی کبھی سنائی دے جاتی ہے اسی طرح مجھے توقع ہے کہ میرے ہم مذہب اس تجویز کو جو میں پیش کر رہا ہوں دل سے قبول کریں گے اور مجھے یہ بھی توقع ہے کہ حکومت ہماری اس خواہش کو ناراضی کی نظر سے نہ دیکھے گی کہ ہم محض یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے تھوڑی بہت مذہبی تعلیم پا جائیں اسی طرح جیسے کہ اقامت خانوں میں انہیں پوجا کرنے کی اجازت ہے تاکہ وہ مغربی تعلیم کے اثر سے ان مذہبی اصول کو بھول نہ جائیں جو ان کے رہنما ہیں اور وہ سب ہندو جو اپنی ملت کی معاشرتی ترقی دیکھنا چاہتے ہیں اس تجویز کو پسندیدہ نظر سے دیکھیں گے۔"

"اخبار الاخیار" مورخۂ یکم دسمبر سنہ ۱۸۷۲ع میں پنڈت اندرا نراین سکریٹری انجمن کا ایک مکتوب شائع ہوا ہے جس میں انہیں خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس خط میں جو پہلے "اودھ اخبار" میں شائع ہوا تھا جس میں اس کی بہت تائید کی گئی تھی، یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہندستان کے ہر ضلع میں ایک کمیٹی قایم کی جائے جو ہندوؤں کے حقوق کے متعلق کام کرے اور ان کو حصول تعلیم

کے لیے ولایت بھیجنے کے لیے چندے فراہم کرے[1] اور ہندستان میں یتیم طالب علموں کے لیے مدارس قایم کیے جاسکیں۔

پنڈت اندرا نراین مرزا پور اور بنارس میں کمیٹیاں قایم کرچکے ہیں اور ان کی تقلید میں دو مشہور ہندوؤں نانک بخش اور مادھوپرشاد نے ایک کمیٹی پٹیالہ اور دوسری اودھ میں قایم کی ہے۔ سنٹرل کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں ہوگا۔ پنڈت جی کہتے ہیں کہ ہر طرح کی کوشش و محنت کی ضرورت ہے کہ ہندوؤں کا نام صفحۂ ہستی پر باقی رہ جائے۔ اس کے لیے صرف علوم و فنون کی تعلیم ہی ضروری نہیں بلکہ مذہبی عقاید کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس لیے چندے فراہم کرکے سنسکرت کی قدیم کتابوں کے ہندی ترجموں کی اشاعت کی ضرورت ہے تاکہ لوگ ان کی پیروی کریں۔

بریلی کے مشہور ہندو بابو لاشمی نراین نے اس مکتوب کی پیروی میں (جس کا میں حوالہ دے چکا ہوں) اور سر سید احمد خاں کی تقلید میں ہندوؤں کے لیے ایک اینگلو اورینٹل کالج قایم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس نے لیے جو چندے انھوں نے روہیلکھنڈ اور دھلی میں جمع کیے ہیں[2] ان کی تعداد بیس ہزار روپے کے قریب ہے۔ دوسری طرف باشندگان احمدآباد نے اپنے شہر میں ایک کالج قایم کرنے کے لیے بھی چندوں کی فراہمی شروع کردی ہے[3]۔

بمبئی میں میرے پرانے پارسی دوست مانک جی کرست جی نے اپنے ہم وطنوں میں تعلیم نسواں کے متعلق جو آزاد خیالات پھیلانے کی کوشش کی تھی اس میں وہی کامیابی ہوری ہے جس کی وہ کوشش مستحق تھی۔ اس شہر میں پارسی لڑکیوں کے لیے چار مدارس قایم ہیں جن میں تقریباً چھے سو پچاس طالبات زیر تعلیم ہیں[4]۔ اس میں

۱۔ مہاراجا ہولکر والی اندور نے پچاس ہزار روپیہ کی رقم عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے تاکہ ان ہندستانیوں کے لیے جو یورپ اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانا چاھتے ہیں، لندن میں ایک اقامت گاہ قایم کی جاسکے۔ (علی گڑھ اخبار ۱۶ مئی سنہ ۱۸۷۳ ع)۔

۲ علی گڑھ اخبار ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۷۳ ع۔

۳ علی گڑھ اخبار ۱۱ اپریل سنہ ۱۸۷۳ ع۔

۴ انڈین میل ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۷۱ ع۔

کوئی کلام نہیں کہ بمبئی میں پارسیوں اور انگریزوں کے تعلقات بہت اچھے ہیں اور ان دونوں قوموں میں اکثر باہم شادیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ گزشتہ سال چھے انگریز لڑکیوں نے جن میں سے دو ایک جرنل کی بیٹیاں ہیں، پارسیوں سے شادیاں کیں[1]۔ پارسی بقدر اپنی اصلاح کر رہے ہیں۔ اکثر لوگ ان کی رسوم پر اور ژند زبان پر اعتراض کرتے ہیں کیونکہ وہ اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں سکتے لیکن اس دقت کو رفع کرنے کے لیے انھوں نے اپنی مذہبی کتابوں کے ایسے اڈیشن تیار کیے ہیں جن میں ان کی مادری زبان گجراتی[2] کے ترجمے بھی ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

یورپی تمدن باوجود مخالف تعصبات کے برابر ترقی کر رہا ہے، چنانچہ راج کوٹ کے لیڈر صاحب نے لڑکیوں کے ایک مدرسے کے جلسۂ تقسیم انعامات کی صدارت کی اور خود انعامات تقسیم کیے[3]۔

ایک ہندوستانی سیٹھ بابو گنگا پرشاد مسر نے بڑی مستقل مزاجی سے بریلی میں عورتوں کے لیے ایک طبی مدرسے کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس کا افتتاح روہیلکھنڈ کے کمشنر نے کیا اور اس موقع پر ہندوستانی میں تقریر کی جس کے بعد بابو صاحب نے خود بھی ہندوستانی میں تقریر کی۔ اس مدرسے میں فن جراحت کا پروفیسر ایک انگریز ڈاکٹر کورین (Dr. Corivn) ہے[4]۔

مسلمانوں نے حکومت کی پیش قدمی کا انتظار نہیں کیا اور لاہور میں قاضی شمس الدین[5] کی سعی و محنت سے مسلمان عورتوں کے لیے ایک مدرسہ جولائی سنہ ۱۸۷۲ء میں قائم کیا گیا ہے۔ اس مدرسے کی معلمات قابل اور تجربہ کار ہیں۔ ان کی سعی سے اس ادارے میں چھبیس لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں اور توقع کی جاتی ہے کہ ان کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جائے گا۔ تعلیم تین حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے درجے میں قرآن اور اس کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ پڑھایا جاتا ہے اور آداب و اصول شریعت

---

۱ علی گڑھ اخبار ۹ مئی سنہ ۱۸۷۳ء۔
۲ ایلنز انڈین میل ۲۷ مئی سنہ ۱۸۷۳ء۔
۳ علی گڑھ اخبار مئی سنہ ۱۸۷۳ء۔
۴ علی گڑھ اخبار ۲۴ جنوری سنہ ۱۸۷۳ء۔
۵ پنجابی ۱۱ جنوری سنہ ۱۸۷۳ء۔

کی تعلیم دی جاتی ہے اور اردو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ آداب گفتگو سکھائے جاتے ہیں اور حساب بھی سکھایا جاتا ہے۔ دوسرے درجے میں قرآن اور اردو کی تعلیم جاری رہتی ہے۔ تیسرے درجے میں صرف قرآن کی تدریس ہوتی ہے اور قواعد اردو سکھائے جاتے ہیں۔ دستکاری کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور ان طالبات کے لیے جو کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتیں کالج کی طرف سے کتابیں مہیا کردی جاتی ہیں۔

ہندستان میں لاتعداد عورتیں مغربی تعلیم کی روشنی سے محروم ہیں، لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کو کسی قسم کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ فطرت نے انھیں نہایت ملیح حسن اور ایسی سادہ طبیعت عطا کی ہے جو بہت سی خامیوں کی تلافی کرتی ہے۔ مدراس ایتھینم[1] (Madras Athenæum) نے ان کی جو تصویر کھینچی ہے ملاحظہ ہو۔ "وہ لوگ جو ہندستان کی منتخب خواتین سے واقف ہیں ضرور اس کا اقرار کریں گے کہ بہت سی باتوں میں ان کا جواب نہیں۔ وہ سمجھ دار ہوتی ہیں اور ہمدرد ہیں، خوبصورت ہیں اور ملیح۔ ان کی چال سبک اور لطیف ہوتی ہے۔ ان کے جسم کی حرکت ایک شاعرانہ کیفیت رکھتی ہے۔ ان کے دل نازک ہوتے ہیں اور ان کی زبان شیریں۔ اپنے شوہروں سے ان کی وفاداری ضرب المثل ہے۔ ان کی سیاہ آنکھوں سے ان کی نگاہیں اس طرح نکلتی ہیں جیسے ان میں آگ کی شعاعوں کی سی کیفیت ہو۔ اپنے بچوں سے بے انتہا محبت و شفقت ہوتی ہے اور وہ بارہا اس کے موثر ثبوت دے چکی ہیں۔ ہم اجنبی اگر ہندستانی عورتوں کی صحیح طور پر قدر نہیں کر سکتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم انھیں اچھی طرح نہیں جانتے۔ ان کے مشرقی آداب کسی طرح مغربی عورتوں سے کم باقرینہ، قدرتی اور با اخلاق نہیں ہیں تو پھر کیا ہمیں یہ خواہش کرنی چاہیے کہ وہ تصنع کے ساتھ مغربی آداب سیکھیں؟ کیا ہمیں اس کی توقع کرنی چاہیے کہ وہ اپنا خوشنما لباس بدل دیں، اپنی روحانی طبیعت کو تبدیل کردیں اور اپنی پیدائش اور اپنے ملک کو بھول جائیں؟"۔

---

۱ Allen's Indian Mail ۵ مئی سنہ ۱۸۷۳ء۔

۱۲ مارچ سنہ ۱۸۷۳ع کو وائسرائے گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ پہلی مرتبہ کلکتہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کی اور پہلی مرتبہ یونیورسٹی نے اس خوبصورت اور وسیع ہال کو استعمال کیا جو اس کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس ہال پر (۳۲۰۰۰) پونڈ خرچ ہوئے ہیں۔ ایک گھنٹے تک لارڈ نارتھ بروک نے بڑے دلچسپ طریقے پر سامعین کی سمع نوازی فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی کو محض ایک امتحانی محکمہ نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس کا کام تعلیم دینا بھی ہے۔ انھوں نے یہ امید ظاہر کی کہ بہت جلد تقابلی لسانیات اور طبیعی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ انھوں نے اس امر پر خاص طور سے زور دیا کہ قومی زبان میں ادب کو فروغ دینے کی بہت سخت ضرورت ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے بجا طور پر مسٹر مارش مین (Mr. Marshman) اور سر ولیم میور (Sir W. Muir) کی بہت تعریف کی۔

ایک اور موقع پر لارڈ نارتھ بروک نے ہندستانی معلمات کے ایک نارمل اسکول کے جلسۂ تقسیم انعامات کی صدارت کی۔ اس اسکول کا تعلق برھمو سماج سے ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کلکتہ کے "پریسیڈنسی کالج" کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد بھی رکھا۔ تیس ہزار پونڈ کے قریب اس عمارت پر خرچ ہوں گے اور حکومت اس کالج پر سالانہ بیس ہزار پونڈ خرچ کرے گی تاکہ یہاں تین سو طالب علم تعلیم پا سکیں۔

۵۔ سنہ ۱۸۷۳ع میں ادبی انجمنوں کی تعداد اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ خصوصیت سے میں پشاور اور جالندھر کی انجمنوں کا ذکر کروں گا۔ آخرالذکر علوم اخلاقی و سیاسی کے لیے ایک طرح کی اکادمی ہے جو اسی طرح کے دیگر اداروں کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ پریسیڈنٹ اور سکریٹری ہندو ہیں۔ وائس پریسیڈنٹ مسلمان ہے۔ اس انجمن میں جو بڑی کاوش سے قائم کی گئی بیس ممبر ایسے بھی ہیں جن کا شمار اس حصۂ ملک کے انتہائی معزز آدمیوں میں ہوتا ہے۔ مہینے میں

دو بار اس کے جلسے ہوتے ہیں اور « پنجابی[1] » میں اس کی خبریں شایع ہوتی ہیں۔

حیدرگڑھ میں ایک انجمن حال ہی میں قائم ہوئی ہے جس کے سب ارکان مسلمان ہیں۔

دہلی میں جہاں مسلمان بہت بڑی اکثریت میں ہیں، انھوں نے ایک « انجمن تہذیب » قائم کی ہے جس کا نام « سوشل کلب » بھی ہے۔ اس انجمن کے ضوابط وآئین « پنجابی[2] » نے شایع کیے ہیں۔ صدر انجمن سید نصرت‌علی صاحب قیصر ہیں جو ایک مطبع موسوم بہ « نُصرت المطابع » کے مہتمم بھی ہیں۔

بنارس میں ہندوؤں کی ایک اصلاحی انجمن « ہندو نیشنل امپروومنٹ سوسائٹی » قائم ہوئی ہے۔ اخبار علیگڑھ[3] نے اس کے متعلق تفصیلات شایع کی ہیں۔ اس انجمن کے مقاصد یہ ہیں کہ دیسی زبانوں کی تعلیم کو فروغ دیا جائے، علوم و فنون کی نظری و عملی تعلیم کی ترویج کی جائے، صنعتی مدرسے قائم کیے جائیں، انگریزی سے مفید اور اچھی کتابوں کے دیسی زبان میں ترجمے کیے جائیں۔ اس کے خاص ارکان میں بابو ہریش‌چندر مدیر « کبی بچن سدھا » اور پنڈت شیونرائن جلسۂ تہذیب لکھنؤ کے مشہور معتمد شامل ہیں۔

الہ‌آباد میں نوجوان، تعلیم یافتہ اور بےتعصب ہندوؤں نے ایک انجمن مباحثہ قائم کی ہے جس کا تعلق میور سنٹرل کالج سے ہے۔ اس میں فلسفیانہ مباحث پر بحثیں کی جائیں گی[4]۔ اسی شہر میں ۹ دسمبر سنہ ۱۸۷۳ع کو لارڈ نارتھ بروک نے ایک میوزیم اور ایک کالج کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔

اجمیر (راجپوتانے) میں منشی امین چند کی مساعی سے ایک انجمن مقاصد رفاہ عام کے لیے قایم کی گئی ہے جس کا انگریزی نام « سوشل ایسوسی‌ایشن » ہے۔ اس انجمن نے جو معزز ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے، اپنا پروگرام شایع کیا ہے جس کی نقل « اخبار انجمن پنجاب » میں چھپی ہے[5]۔

---

۱ اخبار انجمن پنجاب ۱۲ مئی سنۂ ۱۸۷۳ م۔
۲ شمارۂ ۲۴ مئی سنۂ ۱۸۷۳ م۔
۳ علیگڑہ اخبار ۳۱ اکتوبر سنۂ ۱۸۷۳ م۔
۴ شمارۂ ۱۸ دسمبر سنۂ ۱۸۷۲ م۔
۵ شمارۂ ۱۱ جولائی سنۂ ۱۸۷۳ م۔

بمبئی میں ایک نیا "جلسہ" بھی وقوع میں آیا جس کا مقصد ہندستانیوں کی بہتری[1] کی تدابیر اختیار کرنا اور ایسے جن خیالات کو مناسب سمجھتے ہوں ان کی خواہش کے مطابق ان کو ترویج دینا ہے۔ مسٹر جمشید جی جی بھائی اور رؤسائے بمبئی نے اس میں شرکت کی ہے۔

لکھنؤ، کلکتہ اور سیتاپور کی انجمن جو "جلسۂ تہذیب" کے نام سے مشہور ہیں، اپنے وقائع ایک رسالے کی شکل میں شائع کرتی رہتی ہیں۔

لاہور کی "ست سبھا"، "دھرم ست سبھا" جس کے خاص کارپرداز منشی بہاری لال ہیں، "پنجاب ریفارم ایسوسی ایشن" کی طرح ہندوؤں کی ان رسوم کی اصلاح میں کوشش کرتی ہے جو مذموم اور مخرب اخلاق ہیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے امرتسر میں خاص طور پر ایک کمیٹی قائم کی ہے[2]۔ اسی قسم کی ایک کمیٹی احمدآباد میں قائم ہوئی کہ ہندوؤں کی شادیوں کے وقت جو غیر مہذب گیت گائے جاتے ہیں بند کردیے جائیں[3]۔

انجمن پنجاب برابر ترقی کررہی ہے۔ سیکرٹری نے انجمن کے قیام کے وقت یعنی سنہ ۱۸۶۱ع سے چار سال کی (۲۷ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ع تک) جو رپورٹ دی ہے اس سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے[4]۔

انجمن اسلامیہ لاہور نے ۳۰ مئی سنہ ۱۸۷۳ع کو شاہی مسجد میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں شہر کے مسلمان رؤسا نے بہت مدد پہنچائی۔ انجمن ایک مدرسے کو چلارہی ہے جس میں علوم دینیات، حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ طے پایا ہے کہ مشہور عالم مولوی حافظ ولی‌اللہ جن کے ہزارہا شاگرد اس شہر اور نزدیک و دور کے مقامات میں موجود ہیں اس مدرسے کے اولین معلم نامزد کیے جائیں۔ انجمن چاہتی ہے کہ مدرسہ بھی انتخاب نور کرے اور شاہی مسجد جیسی

---

1 اس کا نام "Western Indian Association" ہے (اخبار انجمن پنجاب ۹ مئی سنہ ۱۸۷۳ع) "جلسہ" انجمن کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

2 انڈین میل یکم ستمبر سنہ ۱۸۷۳ع۔

3 علیگڑھ اخبار ۱۹ اگست سنہ ۱۸۷۳ع۔

4 اخبار انجمن پنجاب ۲ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ع۔

خوبصورت مسجد جو مسلمانوں کے لیے ان کے سلاطین سلف کی شان و شوکت کی یادگار ہے پھر ان کے لیے حقیقی روحانی فیض کا سرچشمہ بن جائے۔ حافظ صاحب بھی ہر طرح کی سعی کریں گے اور ان کے ماتحتوں کا فرض ہوگا کہ وہ ان تمام مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کریں جو انجمن کے پیش نظر ہیں اور مدرسے اور مسجد کو نمو دیں۔ نامور رؤسا، معزز مسلمان، بڑے بڑے تاجر سب اس اسلامی انجمن میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ترقی کرے گی اور اس‌قدر اہمیت حاصل کرے گی کہ پنجاب بھر کے مسلمانوں کو اس سے فیض پہنچےگا[1]۔

لاہور کے مسلمان اس سے بالخصوص مستفید ہوں گے جو فی‌الوقت مشہور و مخلص ڈاکٹر لائٹنر (Leitner) کی جدائی پر افسوس کررہے ہیں جن کا ہندستانی زبان و ادب پر بہت بڑا احسان ہے۔ خرابیٔ صحت کے باعث دو سال کی رخصت لے کر موصوف ۳ جنوری کو لاہور سے روانہ ہوگئے ہیں اور دہلی، الہ‌آباد اور بمبئی سے ہوتے ہوئے یورپ تشریف لائیں گے۔ بحیثیت صدر انجمن لاہور موصوف نے ایک انجمن کی جانب سے ایک ایڈریس پرنس آف ویلز کی خدمت میں پیش کیا تھا[2]۔ وی‌آنا کی نمایش میں پیش کرنے کے لیے وہ بہت سی چیزیں لے جارہے ہیں جو انھوں نے کشمیر میں حاصل کی ہیں۔

برہم سماج میں دن بدن نئے پیرو شامل ہوتے جاتے ہیں۔ اب تو وہ ایک مذہب بن‌گیا ہے۔ ہر ہفتے اتوار کے دن سماج کے وہ ممبر جو کلکتہ میں رہتے ہیں جن کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے اپنے مسلک کی پیروی کے لیے اپنے مندر میں جمع ہوتے ہیں[3]۔ ان کی عبادت‌گاہیں بنگال، بمبئی، پنجاب، اودھ اور سنا جاتا ہے کہ مدراس میں بھی بن رہی ہیں۔ ہزاروں مرہٹے اور گجراتی، مدراس کے سیکڑوں باشندے بکثرت پنجابی اور ہندستانی اس کے اصول کی پابندی کر رہے ہیں اور اس کی اشاعت کی کوشش کر رہے ہیں[4]۔

---

۱ یہ حصہ اخبار انجمن پنجاب ۴ اپریل سنہ ۱۸۷۳ ع سے ماخوذ ہے۔

۲ علیگڑہ اخبار ۷ فروری سنہ ۱۸۷۳ ع اور ایلنز انڈین میل بابت ۲۴ فروری سنہ ۱۸۷۳ ع۔

۳ اخبار انجمن پنجاب شمارۂ ۳ اگست سنہ ۱۸۷۳ ع۔ ۴ ایلنز انڈین میل شمارۂ ۹ جون سنہ ۱۸۷۳ ع۔

بابو کیشب چندر سین نے ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۷۲ء کو فصیح انگریزی میں الہ آباد میں ہندوستان پر انگریزوں کے اثر کے موضوع پر ایک دلچسپ تقریر کی جس کا خلاصہ میں پیش کرتا ہوں:

پہلے تو انھوں نے کھلے دل سے ان فوائد کا اعتراف کیا جو انگریزوں سے ہندستان کو پہنچے، مثلاً حفاظت جان و مال، ظلم سے نجات، مساوات و انصاف، ذرائع حمل و نقل کی آسانیاں، ریل، کارخانے، سڑکیں، تار برقی اور سب سے بڑھ کر تعلیم کا فائدہ جو بہر حال مغربی تمدن سے روشناس کراتا ہے۔ لیکن ایسی تعلیم بے فائدہ ہے جو ترقی کا دروازہ تو کھولتی ہے مگر جو نتائج اس سے حاصل ہو سکتے تھے نہیں ہو سکے۔ ہندستانی لوگ چند سال تک تو تعلیم حاصل کرتے رہتے ہیں کہ وہ اعزاز اور مرتبہ حاصل کریں جس کی ان کو خواہش ہے لیکن اس کے بعد وہ بالکل بیہودہ خصائل اختیار کرلیتے ہیں۔ خودغرضی اور کاہلی میں مبتلا ہوکے تعلیم کا صرف وہ حصہ ان میں باقی رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی ناقص تعلیم پر مغرور رہیں اور اپنے ہم‌وطنوں کو جن کو اس کا موقع نہیں ملا حقارت کی نظر سے دیکھیں۔ ان میں اگر فاتح قوم سے کوئی مشابہت پائی جاتی ہے تو صرف نقائص میں۔ اپنے فاتحین کی کوئی خوبی ان میں نہیں۔ مغربی تمدن محض کتابوں سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ وہ مشہور انگریزوں سے زیادہ ملیں اور ان کے ساتھ اسی اخلاقی فضا میں سانس لیں۔ ہندستانی اور انگریزی سوسائٹی کا باہم خلط ملط ہونا اس وجہ سے مشکل ہے کہ مقدم‌الذکر کا سلوک عورتوں کے ساتھ وہی رہے گا جو پہلے تھا۔ عورتوں کی تعلیم ہی اس صورت حال کو آہستہ آہستہ بدل سکتی ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا ہوگئی ہے۔ اس کے لیے استقلال کی ضرورت ہے جس کی بدولت خدا کے فضل سے جو تمام انسانی نسلوں کا خالق ہے، توقع کی جاسکتی ہے کہ نتیجہ امید افزا نکلے گا[1]۔

---

۱ علی گڑھ اخبار ۲۷ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ء۔

بابو کیشب‌چندرسین کے سفر الہ‌آباد کا نتیجہ شمالی ہند کے لیے ایک برہم سماج کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ الہ‌آباد کی شاخ اس نئی سماج میں ضم کردی جائیگی۔ صوبۂ شمال مغربی میں اس انجمن کو مقبول بنانے کے لیے پابندی اور محنت کے ساتھ کتابچے شایع کیے جارہے ہیں[1]۔

بابو کیشب‌چندرسین نے پہلے بنارس میں مندر بہری کا سنگ بنیاد رکھا تھا[2]۔ لکھنؤ میں بھی انھوں نے گزشتہ سال ۲ اکتوبر کو ایودھیا برہم سماج کے مندر کا سنگ بنیاد رکھا اس موقع پر کثیر ہندو اور انگریز خواتین اور حضرات موجود تھے۔ شام کو قیصر باغ میں انھوں نے برہما مت کے اصول اور خاص نکات پر انگریزی میں ایک تقریر کی[3]۔

سب کو معلوم ہے کہ کیشب‌چندر ہندوؤں میں ذات پات کی تفریق کے مخالف نہیں ہیں، لیکن اگر مجموعی طور پر اس کو باقی رہنے دیا جائے تب بھی ہر ذات کے اندر مزید بکثرت تقسیمیں بالکل مہمل ہیں۔ چنانچہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر سورت میں دو سو سات ذاتیں ہیں جن میں سے ہر ایک دوسری سے اپنی خصوصیات کی وجہ سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ اب ذات پات کا فرق محض تصوری ہوکر رہ گیا ہے کیونکہ حکومت انگریزی کے قیام کے بعد سے برہمن، چھتری، ویش اور شدر اپنے موروثی پیشوں کے پابند نہیں ہے بلکہ اب ایسے پیشوں کو اختیار کر چلے ہیں جو ان کے آباواجداد کے پیشوں سے بہت مختلف ہیں۔ اس لحاظ سے میں انھیں قابل الزام نہیں سمجھتا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ پکے مشرقی یورپ کی اچھی تجویزوں کو ہمیشہ اختیار نہیں کرتے۔ امیر کابل نے یورپ کی اکثر دول کی پیروی میں فوجی خدمت لازمی قرار دی تھی لیکن یہ حکم اس‌قدر غیر مقبول ثابت ہوا کہ مجبوراً اس کو اٹھا لینا پڑا[4] انگلستان میں

---

۱ اخبار انجمن پنجاب ۳ جنوری سنۂ ۱۸۷۳ ء - پنجابی ۴ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ء -
۲ اخبار انجمن پنجاب ۳ اکتوبر سنۂ ۱۸۷۳ ء - ۳ انڈین میل ۱۰ نومبر سنۂ ۱۸۷۳ ء -
۴ علی‌گڑھ اخبار ۱۰ جنوری سنۂ ۱۸۷۳ ء -

ابھی تک اس کا رواج ہے اور فرانس میں ایک عرصے تک رہ چکا ہے چنانچہ کوئی شخص فرانسیسی افواج کو ابتذال کی حد تک ملامت نہیں کرسکتا۔

بابو پرتاب چندر کی بمبئی میں موجودگی روشن خیال ہندوؤں کی نظر میں بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ وہ ان میں خدا پرستی کی تبلیغ کررہے ہیں۔ مذہب پر جو تقریریں وہ کررہے ہیں ان سے وہ قوت پھر بیدار ہورہی ہے جو برہما سماج کی اصلاح کے بعد سے خوابیدہ ہو چلی تھی اور بغیر ان کی کوشش کے رفتہ رفتہ مفقود ہوجاتی۔ خدا پرستی کی سماج کی دوبارہ تنظیم عمل میں آئی ہے اور دسمبر سنہ ۱۸۷۲ع میں اس کا ایک اجلاس اس کے اصول و آئین مرتب کرنے کے لیے ہوا۔ سماج میں آزادی سے بحث کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ بحث سماج کے بنیادی اعتقادات کے خلاف نہ ہو۔ اعتقادات یہ ہیں: خدا کے وجود اور روح کی بقا پر اعتقاد، عبادت کی ضرورت، نیکی اور بد میں امتیاز اور آنے والی زندگی میں جزا و سزا۔ شبدھ پترکا کے نام سے سماج کا ایک رسالہ مرہٹی میں شائع ہوتا ہے[۱]۔

کاشی نامی ہندو بت پرستی کے انسداد میں کوشاں ہیں۔ ان میں سے پنڈت دیانند سرسوتی کا شمار بہت پرجوش آدمیوں میں ہوتا ہے۔ بنارس میں ایک اصلاحی انجمن قائم کرکے وہ اپنے کام کے سلسلے میں کلکتہ گئے ہیں جہاں اب وہ مستقل طور پر مقیم ہیں اور اپنے خیالات کی تبلیغ نہ صرف ہندی اور بنگالی بلکہ انگریزی اور سنسکرت میں بھی کرتے ہیں[۲]۔

کلکتہ میں انھوں نے ایک بڑا جلسہ کیا تھا جس میں عیسائی، مسلمان، ہندو، برھمو سبھی شریک تھے۔ اس جلسے کا مقصد یہ تھا کہ گندی تحریرات کو روکا جائے[۳]۔

خواتین بھی ان معاشرتی تحریکات میں حصہ لے رہی ہیں جو انھیں ان زنجیروں سے نجات دلانے والی ہیں جن میں وہ اب جکڑی ہوئی ہیں۔ بعض خواتین نے اس نقطۂ نظر سے مضامین بھی لکھے ہیں اور ڈھاکہ کی ایک ہندو خاتون نے ایک نظم

---

۱ القیٔن مہل ۱۳ جنوری سنۂ ۱۸۷۱ع۔

۲ اخبار عالم میرٹھ ۱۹ جنوری سنۂ ۱۸۷۳ع۔

۳ پنجابی ۱۲ اپریل سنۂ ۱۸۷۳ع۔

۴ پنجابی ۲ فروری سنۂ ۱۸۷۳ع۔

"عورت اور چڑیا" کے نام سے لکھی ہے جس میں اپنی قید کو چڑیا کے قفس سے تشبیہ دی ہے ۔ اس نظم کا ریورنڈ ڈاکٹر مرے مچل (Rev. Dr. Murray Mitchell) نے نظم میں ترجمہ کیا جو گزشتہ فروری کو شایع ہوا[1] ۔

پکے ہندو ان تحریکات استدلال کے شاکی ہیں جن کو ہم سماج والے پھیلا رہے ہیں ۔ ان میں سے ایک اس وقت کے متعلق "ہریش چندر میگزین"[2] میں ایک مضمون میں لکھتا ہے :—

"ہمارا مذہب جو دنیا کے تمام مذاہب سے برتر ہے اور جس کا ہمسر کوئی اور مذہب نہیں ان لوگوں کے نزدیک محض وہم پرستی ہے ۔ انھوں نے مذہب کو جو معاشرت اور ان افراد کے درمیان جن پر وہ مبنی ہے، واحد کڑی ہے، بالکل بدل دیا ہے ۔ وہ نہ عیسائیت کے پیرو ہیں اور نہ اسلام کے پھر بھی وہ ہندومت سے متنفر ہیں اور چونکہ میرے خیال میں ہندومت اور تمام مذاہب کا جوہر کہلانے کا مستحق ہے، اس لیے وہ ان لوگوں کو جو ہندو نہیں ہیں بےدین نہیں قرار دیتا ۔ ہندو مذہب یہ سکھاتا ہے کہ ایک سچا ہندو حقیقی معنوں میں "عیسائی" ہے اگرچہ کہ وہ حضرت عیسیٰ کی ذات پر ایمان نہیں لاتا ۔ یہی ایک مذہب ہے جو بتاتا ہے کہ حقیقی مذہب متقدمین میں رائج تھا اور نسل انسانی کے وجود میں آنے کے ساتھ یہ سب پر روشن ہوا ۔ ہم مشنریوں سے یہ پوچھتے ہیں کہ وہی یہ بتائیں کہ حضرت عیسیٰ کے پیش نظر ہندو تھے یا نہیں تھے جبکہ انھوں نے یہ کہا کہ "بہت سے لوگ مشرق سے آئیں گے اور ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے ساتھ اپنی سلطنت میں داخل ہوں گے"[3] ۔

بابو کیشب چندر متر (جو کیشب چندر سین سے مختلف آدمی ہیں) نے غازی پور میں اس مسئلے پر تقریر کی کہ انگریز ہندستانیوں سے خلط ملط بڑھانے سے کیوں احتراز کرتے ہیں ۔ اس امر کو وہ اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ میل ملاپ یا اس کا

---

۱ یہ نظم پہلے Indian Anti Quary میں چھپا اس کے بعد علیحدہ شایع ہوا۔

۲ شمارۂ اول - صفحہ 15 -

۳ سینٹ میتھو (آٹھواں باب گیارھویں آیت)

فقدان ان کے نزدیک حاکم اور محکوم قوم کے مابین محبت یا نفرت کا باعث ہوسکتا ہے ۔ انھوں نے دونوں اقوام کے مابین اتحاد کی خواہش ظاہر کی اور توقع ظاہر کی کہ یہ خواہش پوری ہو کر رہےگی ۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان دو اقوام کے درمیان، جو اس قدر مختلف ہیں اور جن کے تمدن اس قدر مختلف ہیں ۔ ربط ضبط بڑھانے کے لیے باہمی دلچسپی اور باہمی ہمدردی کی بڑی ضرورت ہے اور یہ وہ چیزیں ہے جو فی‌الوقت مفقود ہیں کیونکہ دونوں اقوام کے خصائل، خیالات اور معاشرتی دلچسپیاں مذہبی اصول کی وجہ سے ایک دوسرے کے متضاد ہیں ۔ مثلاً یہ کہ ہندو مذہب، بدھ مذہب، اسلام اور عیسائیت باہم‌دگر متضاد ہیں ۔ بابو صاحب کے خیال میں فطری مذہب محض یہ ہے کہ خدا کی سرپرستی میں ایک سچی برادری سب کے لیے قائم کی جائے ۔ صرف یہی چیز ذات پات کو مٹاسکتی ہے اور امارت و مدارج کے فرق کو مفقود کرسکتی ہے ۔ بابو صاحب کے خیال میں وہ وقت دور نہیں جبکہ یہ فطری مذہب تمام تعلیم‌یافتہ انسانوں کا مذہب ہو جائےگا اور حقیقت میں دنیا کی حکومت انہیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے ۔ صفحۂ ہستی پر لوگ اس طرح رہیں‌گے جیسے ایک بڑا سا گھرانا اور ہر جگہ امن اور صلح کل کی حکومت رہےگی، لیکن اس لیے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کریں ضروری ہے کہ ہم خدا سے اپنے تعلق کو پہچانیں اور آنے والی زندگی اور اس کی نعمتوں کا تصور کریں جو ہمارے نیک اعمال کی وجہ سے حاصل ہوں‌گی ۔ ایک چیز جو استدلالیت، افادیت اور نیچریت کے خلاف کہی جاسکتی ہے کہ مذہب ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے روحانی برادری حاصل ہو سکتی ہے ۔ کیا ان جدید نظریات کے حامی ہمیں محسوس کرا سکتے ہیں کہ ہماری ارواح میں ایک ابدی زندگی ہے کہ ہمیں چاہیے کہ دوسروں میں بھی جو دل و جان سے ہمارے سچے بھائی ہوں ہم اپنے آپ ہی کی جھلک دیکھیں؟[1] ۔

---

۱ یہ ان مضامین کا بہت مختصر سا خلاصہ ہے جو علیگڑھ اخبار مورخۂ ۱۴ مارچ سنہ ۱۸۷۳ء اور ۱ اپریل سنہ ۱۸۷۳ء کو شایع ہوئے

سکھ بھی ایک مذہبی تحریک میں حصہ لے رہے ہیں جو ہندستان میں رونما ہو رہی ہے ۔ سندھ کے سکھوں نے ایک سبھا بنائی ہے جو گورونانک کی تعلیم کی اشاعت میں سعی کرے گی اور ان کے معجزوں پر جو انھوں نے اپنے ثبوت میں دکھلائے روشنی ڈالے گی[1]

اس انجمن کے ممبروں نے جس کا نام بڑی خصوصیت سے برھمو دھرم رکھا گیا ہے' اس سال بڑے جوش سے ایرانیوں کی طرح ایرانی عید نوروز پارسیوں کی طرح منائی ۔ اس تقریب میں جو جلوس کلکتہ میں نکلا گیا اس میں تین جھنڈیاں تھیں جن کو ایک ہندو' ایک مسلمان اور ایک عیسائی اٹھائے ہوئے تھا' اس جشن کے سلسلے میں پندرہ سو آدمیوں کے روبرو بابو کیشب‌چندر نے ایک تقریر کی[2]۔

جرنل آف دی نیشنل انڈین اسوسی‌ایشن[3] (Journal of the National Indian Association) جو ماہ بماہ شایع ہو رہا ہے' ایک دلچسپ تقریر کا ذکر کرتا ہے جو مسٹر التوڈس پری‌چارڈ (Mr. Iltudus Prichard) نے سوشل سائنس اسوسی‌ایشن (Social Science Association) کے ہال میں ۲۰ دسمبر سنہ ۱۸۷۲ع کو انجمن کے قیام (جو سنہ ۱۸۷۰ع میں قائم ہوئی) کی یادگار کے سالانہ جلسے میں ہندستان میں تعلیم کے موضوع پر کی ۔ اس مشہور و معروف شخص نے پہلے تو National Association کے ارتقا کا ایک خاکہ کھینچا' یہ انجمن ہندستان میں معاشرتی ترقی کے لیے قائم کی گئی ہے ۔ اس کے بعد مقرر نے سامعین سے اس مبحث کا ذکر کیا جس میں ایک فریق عام دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاھتا ہے اور دوسرا فریق انگریزی کا حامی ہے ۔ اس کا اپنا خیال یہ تھا کہ عوام‌الناس میں تعلیم کی ترویج کے لیے عام دیسی زبان زیادہ کارآمد ثابت ہوگی مگر اعلیٰ طبقوں میں تعلیم کے لیے انگریزی مناسب ہے ۔ اس کے بعد انھوں نے اردو کا ذکر کیا اس زبان کی آفرینش و ارتقا

---

۱ پنجابی ۲ جولائی سنہ ۱۸۷۳ ع ۔
۲ پنجابی ۲ فروری سنہ ۱۸۷۳ع ۔
۳ شمارۂ ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع ۔

کی تاریخ دہرائی اور بیان کیا کہ سائنس اور جدید فلسفے کی اشاعت و ترویج کی اس زبان میں خاص صلاحیت ہے کیونکہ بڑی سہولت سے یہ زبان سنسکرت اور عربی الفاظ کو جذب کرسکتی ہے جو فنی اصطلاحات کے کام آسکتے ہیں۔ اردو کی اس تعریف میں مشہور عالم ہندستانی میجر آٹلی (Major Ottley) نے ان کی ہمنوائی کی۔

مسٹر پری چرڈ نے ہندستانیوں کے لیے دیسی ادب کی فراہمی پر زور دیا، ایسا ادب جو ملک وقت صحیح الاثر ہو اور جو سستی قیمت پر خریدا جاسکے۔ انھوں نے بتایا کہ سنہ ۱۸۷۲ع میں تعلیم کی حد تک ہندستان میں کیا کیا خاص دقتیں پیش آئیں۔ بہت ہمدردی کے ساتھ انھوں نے اس تجویز کا ذکر کیا کہ مسلمانوں کے لیے ایک بڑا کالج قائم کیا جائے اور حکومت مدراس کے اس اقدام کی تعریف کی کہ انھوں نے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو وہ جگہیں دیں جن سے وہ محروم تھے کیونکہ اس پریسیڈنسی میں اس وقت صرف تین مسلمان عہدہ دار تھے اور چار سو سترہ ہندو۔ انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ لندن میں ایک ایسا کالج قائم کیا جائے جس کا تعلق ہندستانی جماعت سے ہو اور جہاں ہندستانی اپنی تعلیم مکمل کرسکیں اور سول سروس میں شریک ہوسکیں اور شرکت کے لیے انھیں دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

مسٹر پری چارڈ کی تقریر ... ایسوسی ایشن کے نظام العمل کی تشریح ہے جو ہندستانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں علی گڑھ اخبار مورخۂ ۱۲ جون سنہ ۱۸۷۲ع میں شایع ہوئی۔

٦ - قرون وسطیٰ میں جب کہ کلیسا اس قدر امیر تھا اور پادری اس قدر کثیر تعداد میں موجود تھے، کلیسا نے مشنری فرائض اپنے ذمے نہیں لیے۔ اس زمانے میں بجز ژاں دَ موں کاروان (Jean de Mont-Corvin) کے مشن کے جو چین گیا تھا کسی کا ذکر پڑھنے میں نہیں آتا۔ تین سو سال کے بعد لوگوں کی اس قابل قدر کام پر نظر پڑی اور چند سال کے عرصے میں اس نے غیر معمولی ترقی کی، نہ صرف

رومن کیتھولک کلیسا نے اس کی طرف توجہ کی بلکہ روسی کلیسا، انگلیکن کلیسا اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے انگریزی مشنری اس وقت تک نہیں بھیجے جاتے جب تک وہ اس ضلع کی زبان میں، جہاں انھیں کام کرنا ہے، ایک سخت امتحان میں کامیاب نہیں ہوتے۔ سنہ ۱۸۷۲ع میں چھ سو چھ مشنری تھے جو پانچ سو بائیس مقامات پر کام کر رہے تھے۔

ہندستان میں سنہ ۱۸۷۲ع میں ایک ملین رومن کیتھولک عیسائیوں کے علاوہ دوسرے عیسائی فرقوں میں تین ارب اٹھارہ ہزار تین سو ترسٹھ دیسی عیسائی تھے۔

میرے پیش نظر سنہ ۱۸۷۲ع کے متعلق Punjab Book and Tract Society اور Punjab Auxiliary Bible Society کی سالانہ رودادیں ہیں۔ یہ پانچویں روداد ہے اور دونوں روئدادیں حسب سابق ریورنڈ رابرٹ کلارک (Rev. Robert Clarke) نے مرتب کی ہیں۔ از راہ مہربانی انھوں نے مجھے ایک نسخہ بھیجا ہے اور اس کے ساتھ (Lahore Divinity School) سے متعلق (Rev. T. Vulpy French) کا "سالانہ مراسلہ" (Annual Letter) ان روئدادوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میرے کام کے حلقے میں شامل ہے کیونکہ ان کا بڑا حصہ دیسی عیسائی ادب کے متعلق ہے جو دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مشنری بھی جدید ادب کی ترقی میں خدمات انجام دے رہے ہیں اور مغربی خیالات سے اس کے اسلوب میں ترمیم کر رہے ہیں۔

ان دونوں انجمنوں کا مرکز لاہور ہے۔ یہیں مختلف انجمنوں کی شایع کردہ کتابوں اور رسالوں کا ذخیرہ ہے خصوصاً ان اردو اور ہندی کتابوں کا جو انجمن برائے رسالہ‌جات الہ‌آباد اور مشن پریس لدھیانہ نے شایع کیے ہیں۔

ریورنڈ مسٹر کلارک کی رپورٹ کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں مختلف مشنریوں اور تازہ عیسائی شدہ دیسیوں کی مراسلت ہے۔ موخرالذکر میں سب سے

---

۱ پولس کی مشن نے آٹھ ہزار عیسائی شدہ دیسیوں کا ذکر کیا ہے۔

زیادہ قابل ذکر مناظرانہ رسالے ہیں جو بہت سرگرمی سے اس پرجوش کوشش میں مصروف ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو حقیقت کا راستہ دکھائیں۔

پادری لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس قسم کے مذہبی رسالہ جات جو دیسیوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں ان سے کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے اور کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے لیکن مسلمان اور ہندو ان میں دلچسپی لے رہے ہیں اس کے معنی سے اس امر کے لیے کوئی دلیل نہیں کہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔

اردو کے یہ مسیحی رسالہ جات میں جن کی تعداد پچاس کے قریب ہے اور جن میں سے بعض کافی ضخیم بھی ہیں مثلاً تاریخ کلیسا، مرتبۂ سر ولیم میور اور چند نئی تصنیفوں کو مسیحیت سے قابل ذکر سمجھتا ہوں لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کتابیں اور رسالہ جات جو حال میں شائع ہوئے ہیں زیادہ تر ان کتابوں کے نئے اڈیشن ہیں جو پہلے مشن کے پریسوں سے چھپ کر جماعتوں سے شائع ہو چکی ہیں۔

امدادی انجمن برائے اشاعت کتب مدراس پنجاب کی پانچویں رپورٹ میں سوائے اس کے کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں کہ عہد نامۂ جدید اور انجیل کے مختلف حصوں کی طلب اور اشاعت بہت بڑھ گئی ہے اور انہیں اردو، ہندی اور پنجابی میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس رپورٹ کی بنیاد جس خاص مقولہ پر ہے وہ مجھے بہت پسند ہے:

"انسان کا گوشت گھاس کی طرح ہے اور اس کی خوبیاں ایسی جیسے کھیتوں کے پھول۔ گھاس سوکھ جاتی ہے، پھول مرجھا جاتے ہیں لیکن ہمارے خدا کا لفظ ہمیشہ باقی رہتا ہے"[2]۔

راجپوتانے کے مشن کی گزشتہ سال کی رپورٹ کے بعد اب اس کا علم ہوتا ہے کہ وہاں تیرہ مشنری ہیں جن میں سے تین طب کے ماہر ہیں۔ وہاں انہوں نے

---

۱ ان کی دلچسپ سوانح حیات، تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی، جلد دوم صفحہ ۱۴ سے ملاحظہ فرمائیے۔
۲ اسایا باب ۴۰ آیت ۶ و ۸۔

بہتر مدارس کھولے ہیں جن میں بارہ ہزار بیالیس لڑکے اور لڑکیاں پڑھ رہی ہیں اور اڑتیس آدمی اب تک عیسائی بن چکے ہیں[۱]۔

رومن کیتھولک فرقے کا ایک خوبصورت کلیسا آگرے میں جو اکبر اعظم کا پایۂ تخت رہ چکا ہے پہلے ہی سے موجود ہے، اب حال ہی میں ایک اور خوبصورت سا کلیسا جبل‌پور میں بنایا گیا ہے جس میں عورتوں کے لیے بھی ایک حصہ ہے۔ ایک اور عظیم‌الشان گرجا الہ آباد میں جو صوبۂ شمال مغربی کا پایہ تخت ہے، بنایا گیا ہے[۲]۔

ہمیں چاہیے کہ ان نیک مشنریوں کی ہمت بڑھائیں اور ان سے کہیں "اے معزز گروہ چلو وہاں جہاں خدا کی شوکت اور دنیا کی نجات تمھیں آنے کی دعوت دے رہی ہے" — "تمام مخلوق میں اعلان کردو کہ قوموں کے دیوتا خراب اصل کے ہیں"۔

خود کو اپنے فرایض پر آمادہ کرنے کے لیے مشنریوں کو چاہیے کہ اسقف ہیبر (Heber) کے مقدس بھجن کے یہ الفاظ اپنے آپ سے دہرا کر کہیں:—

"ہم وہ ہیں کہ ہماری روحیں، بلندی کی عقل و فراست سے روشن ہو چکی ہیں۔ بھلا کیا ہم تاریکی میں گرفتار آدمیوں کو زندگی کا چراغ دکھانے سے دریغ کریں"۔

مشنریوں کے ایک جلسے میں جو الہ‌آباد میں ۲۳ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع کو ہوا بمبئی کے ریورنڈ جے۔ ولسن (Rev. J. Wilson) نے ایک یادداشت ہندوؤں میں تبلیغ[۲] کے طریقے پر پڑھی۔ ریورنڈ آر۔ سی۔ ماتھر (Rev. R. C. Mather) اور جگدیش نے بھی اسی موضوع پر روشنی ڈالی۔ ریورنڈ عمادالدین نے مسلمانوں میں تبلیغ کے طریقوں پر ایک تقریر کی اور ریورنڈ ڈاکٹر مرے مچل (Rev. Dr. Murray Mitchel) نے بھی اسی مبحث پر گفتگو کی اور خصوصیت سے مسلمانان بنگال کے مسئلے پر[۳]۔

---

۱ اخبار انجمن پنجاب ۱۸ مارچ سنہ ۱۸۷۳ ع۔

۲ یہ 'On Preaching to the Hindus' کے عنوان سے شایع ہوتا ہے۔

۳ علیگڑھ اخبار ۳ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ع و ایلگز انڈین میل ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع۔

کرسچین ورنیکولر سوسائٹی آف انڈیا ("Christian Vernacular Society of India") قائم شدہ سنہ ۱۸۵۸ء کا پچیسواں جلسہ گزشتہ مہینے پُرجوش انگلیکن لارڈ شافٹس بری (Shaftesbury) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ریورنڈ جے۔ ایچ پٹمین (Rev. J. H. Pittman) نے اپنی رپورٹ میں ذکر کیا کہ سوسائٹی نے معلموں کی تین درسگاہیں قائم کی تھیں جن سے دو سو مدرس فارغ التحصیل ہوکر ایسے ہیں جو مختلف مدارس کے صدر ہوں گے جن میں سات ہزار بچے پڑھ رہے ہیں اور سوسائٹی کی کوششوں سے ہندوستانی اور ہند کی دوسری زبانوں میں انجیل کے چار لاکھ نسخے تقسیم کیے جاچکے ہیں۔

سابق اعظم یورپ اور لارڈ لارنس (Lord Lawrence) کی تقریروں کے بعد ڈاکٹر مرے میچل نے جو حال ہی میں ہندوستان سے وارد ہوئے ہیں چشمدید شہادت کے طور پر یہ بیان کیا کہ اس سوسائٹی سے ہندوستان کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور اس کے مدرسے انتہائی مفید طور پر کام کررہے ہیں لیکن انھوں نے یہ بھی کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے مقابلے میں سوسائٹی کی تمام تر خدمات ایسی ہیں جیسے پانی کے سمندر میں ایک قطرہ[۱]۔

بہت سی مشنری خواتین بھی ہیں جو ڈاکٹری تعلیم حاصل کررہی ہیں تاکہ اس طرح انھیں زنانوں میں جانے کا موقعہ ملے اور بوقت واحد ارواح و اجسام کا علاج کرسکیں۔ بمبئی میں اور خصوصیت سے شمالی ہند میں ان کی کامیابی مشاہدے میں آچکی ہے[۲]۔

اس سال (سنہ ۱۸۷۳ء) اسقف کلکتہ نے پنجاب کا سفر کیا۔ لاہور میں انھوں نے پینتیس ہندوستانیوں کو عیسائی کیا جن میں سے چار یوریشین تھے۔ اثنائے قیام میں سینٹ جیمس کے مذہبی کالج میں جس کے ناظم ریورنڈ ٹی۔ وی فرنچ (Rev. T. V. French) ہیں اور جہاں ہندوستانی اردو میں تعلیم دی جاتی ہے اسقف نے طالب علموں کے سامنے نہایت روانی سے اسی زبان میں تقریر کی۔ امرتسر میں بھی انھوں نے

۱ ایلنز انڈین میل ۱۹ فروری سنہ ۱۸۷۳ء۔
۲ انڈین میل ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۷۳ء۔
۳ Colonial Church Chronicle شمارۂ جون سنہ ۱۸۷۳ء۔

ہندستانی ہی میں تقریر کی اور پانچ دیسیوں کو پادریوں کے عہدے پر فایز کیا[1] ۔ رانچی میں کول مشن کے مرکزی گرجا میں انھوں نے رسوم تقدیس انجام دیں اور ہندی میں تقریر کی جو یہاں عام طور پر رایج ہے ۔ سات ہندستانیوں کو پادریوں کے درجے پر مامور کیا اور دو سو باون آدمیوں کو عیسائی بنایا' عشائے ربانی میں سات سو آدمی شریک تھے[2] ۔

عیسائیت کی سب سے زیادہ اشاعت چھوٹا ناگپور کے پہاڑی اضلاع اور علاقۂ سنتھال کے ان پرانے اصل باشندوں میں ہوئی ہے جو نہ مسلمان ہیں اور نہ ہندو اور جن کے مذہبی اعتقادات بہت بھونڈے ہیں ۔ حکومت کو مشنریوں کی حفاظت کرنی پڑی کیونکہ اس حصے کی آبادی نیم وحشی ہے ۔

اپنے علاقے میں اسقف مدراس نے اپنے گزشتہ سفر ٹراونکور میں اٹھارہ سو آدمیوں کو عیسائی بنایا ۔ کوٹا گام میں دو یورپین اور تین ہندستانیوں کو پادری مقرر کیا اور اس موقع پر دو سو چالیس آدمی ان کے ہاتھ پر عیسائی ہوئے ۔

علاقۂ مدراس میں پینتالیس انگلکن کلیسا ہیں ۔

اسقف بمبئی نے گزشتہ جنوری و فروری میں سندھ کا دورہ کیا ۔ کراچی میں انھوں نے ستانوے آدمیوں کو عیسائی بنایا' یہ سچ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر انگریز سپاہی ہیں ۔ بندیلکھنڈ میں انھوں نے ایک مشن قایم کی[3] ۔ نومبر میں وہ ناگپور میں کلکتہ اور مدراس کے اسقفوں سے ملنے والے ہیں تاکہ اپنے علاقوں کی از سر نو تقسیم کریں[4] ۔

کلیسائے سینٹ جون (مشرقی کلیسا) کی عشائے ربانی کے ملیالم ترجمے کو مرکزی اسقف Mar Athanasios نے تسلیم کرلیا ہے اور اب اس فرقے کے کلیساؤں میں

---

۱ Colonial Church Chronicle شمارۂ جولائی سنہ ۱۸۷۳ع ۔

۲ Colonial Church Chronicle شمارۂ نومبر سنہ ۱۸۷۳ع ۔

۳ Colonial Church Chronicle جون سنہ ۱۸۷۳ع ۔

۴ ایلنز انڈین میل ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۷۳ع ۔

بھی ایسی اصل کے جو شعر کی زبان میں ہیں اور جس کو یہاں لانے والے نہیں سمجھ سکتے، رائج کیا گیا ہے۔[1]

ہمیں معلوم ہے کہ اگرچہ ہمیں کم تعداد میں ہندو اپنا مذہب بدل کے مسلمان ہو جاتے ہیں لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس طرح وہ حقارت سے پرہیز کر لیتے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں کی عہد حکومت میں یہ تبدیلی مذہب بہت زیادہ رائج تھی لیکن اورنگ زیب جیسے بلند دل بادشاہ کے زمانے میں یہ تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی۔[2]

اخباروں سے اس قسم کی ایک نئی تبدیلی مذہب کی اطلاع ملتی ہے۔ راجگڑھ کے راجہ نے جو مسلمان ہونے کا اعلان کردیا ہے اور اپنا نام بدل کے نواب عبدالرحیم خاں رکھ لیا ہے اور حکومت ہند نے بھی اس تبدیلی کو منظور کرلیا ہے اور پنجابی میں ۱۸۵۸ء کی جماعت نے بھی دین محمدی کو تسلیم کرلیا ہے اور وہ دوست جو پہلے ہندو تھی اب مسلمان ہوگئی ہے۔[3]

ایک اور ہندو مسلمان ہوکر اپنا نام محی الدین رکھا ہے اور بہت سے نومسلموں کی طرح اس نے اپنے قدیم مذہب کی تردید میں لکھی ہے جس کا نام "ہدایت المہند" ہے۔

اگرچہ ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم مسلمان عیسائی مذہب اختیار کرتے ہیں پھر بھی اس سلسلے میں کئی نومسلموں کے نام مل سکتے ہیں۔ وہ مسلمان جو اپنے دین کی صداقت پر پورا ایمان رکھتے ہیں عیسائی مشنریوں کے حملوں کی تردید کرتے رہتے ہیں۔ دہلی میں الطاف حسین نے اردو میں دو سو صفحے کی ایک کتاب "جواب" کے نام سے چھاپی ہے جس میں عیسائیوں کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ اسلام پر کرتے ہیں۔ لاہور میں حافظ ولی اللہ نے امام الدین

---

۱ Colonial Church Chronicle جون سنہ ۱۸۷۲ء اور Missionary Enterprize in the East از ریورنڈ آر۔ کانفس۔

۲ دلچسپ تفصیلات کے لیے Sir Henry Elliot کی "Mohammedan historians of India" ملاحظہ ہو جس کو فاضل پروفیسر Dowson نے شایع کیا ہے۔

۳ اخبار عالم میرٹھ ۱۲ دسمبر سنہ ۱۸۷۲ء۔ پنجابی ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ء۔

کی کتاب " تحقیق الایمان " کے جواب میں ایک کتاب "صیانت الاسلام و وسوامات الشیطان " کے نام سے شایع کی ہے ۔ وہیں " پنجابی " کے اشاعت خانے سے ایک مذہبی مناظرہ کی ایک اور کتاب " بطلان اصول مذہب عیسوی " کے نام سے شایع ہوئی ہے جو مولانا محمد رکن الدین کے فیضان کا نتیجہ ہے ۔ مصنف کو اس کا دعویٰ ہے کہ عیسائی تصنیفات کے ذریعے ہی عیسائی مذہب کی تردید کی گئی ہے ۔

لاہور ہی سے مشہور کامل عام مناظرہ مولوی سید محمد ابوالمنصور نے اسلام کے خلاف ایک تصنیف کی تردید شایع کی ہے جس کو لکھنؤ کے دو مشنریوں نے لکھا تھا جن میں سے ایک مسلمان رہ چکا تھا ۔ " پنجابی " نے اس کتاب پر ۱۴ جون اور ۲۶ جون کی اشاعتوں میں دو مضامین لکھے ہیں جن کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں ۔

" انعام عام در جواب آئینۂ اسلام " مضمون نگار لکھتا ہے " سمیویل جولس اور رجب علی مشنریوں کی کتاب "آئینۂ اسلام" کی۔۔جو امریکن مشن پریس لکھنؤ سے شایع ہوئی ہے۔۔تردید ہے ۔ ان مشنریوں نے مسلمانوں میں دو سو پچاس فرقے کیے ہیں اور لکھا ہے کہ وہ شروع اسلام ہی سے یہ حال تھا اور ان کا دعویٰ ہے کہ عیسائی فرقوں کا یہ حال نہیں ۔ مصنف نے ان اعتراضات کا جامع اور فیصلہ کن جواب دیا ہے ۔ مشنریوں نے غلط طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان فرقوں میں سے آٹھ خدا کو نہیں مانتے ، چودہ رسول کو نہیں مانتے اور اسی طرح سینتیس حلقۂ اسلام سے بالکل خارج ہیں ۔ مولوی صاحب نے جواب میں اپنے دلائل میں یہ ثابت کیا ہے کہ عیسائیوں میں اٹھاسی فرقے موجود ہیں جن میں سے آٹھ روح القدس کو نہیں مانتے ، پچیس حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے قایل نہیں ، آٹھ (مسلمانوں کی طرح) حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے قایل نہیں ، سولہ عہد نامۂ قدیم و جدید کے آسمانی کتاب ہونے پر ایمان نہیں رکھتے اور باقی پینسٹھ فرقے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں ۔ مصنف نے ان کتابوں کے حوالے دیے ہیں جن کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں ۔ مصنف نے جو محنت برداشت کی ہے اس کی تحسین ہمارا فرض ہے کیوں کہ اس کتاب کے لیے انھوں نے مختلف زبانوں کی کتابوں سے حوالے جمع کیے ہیں ۔ برخلاف اس کے

«آئینۂ اسلام» میں جن کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں صفحات و سطور کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ رسالہ «الملفوظ» کی تصنیف میں صفحات، سطور اور جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی اشاعت کے سال اور مقام کی بھی تشریح کی ہے جس سے اس تصنیف کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مشنری پھر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرسکیں گے اور ہمیں توقع ہے کہ اس کے بعد وہ مشنریوں سے دست بردار ہو جائیں گے۔

لکھنؤ میں مسلمانوں کی ایک انجمن «انجمن اسلامیہ» خاص اس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہے کہ نہ صرف مسلمانوں کو عیسائیت کے پروپیگنڈے سے بچائے بلکہ عیسائیوں کو بھی مذہب اسلام کی حقیقت سے آگاہ کرے جس کی ان کے لیے بہت سخت ضرورت ہے۔ اس انجمن کا پہلا اجلاس ۲۲ مئی کو ہوا۔ ہندوستانی اخبار «قیصر الاخبار» کے ایڈیٹر صاحب کے ساتھ منشی محمد قاسم صاحب بانی انجمن کو معتمد مقرر کیا گیا اور اس کے صدر مشہور عالم مولوی عبدالحی صاحب قرار دیے گئے۔

ایک اور واعظ قاضی مولوی حاجی محمد سراج صاحب نے جو شہرت میں ان سے کسی طرح کم نہیں، بمبئی میں مذہب اسلام پر اس خوبی سے وعظ کیا کہ تین یورپین مسلمان ہو گئے اور انھوں نے اپنے نئے مذہب کے اعتبار سے اپنے نام بدل دیے[1]۔ ایک اور بڑے انگریز یعنی سرسہ ضلع بریلی کے ڈپٹی کمشنر کے مسلمان ہونے کی بھی اطلاع ملتی ہے مگر اس کی حد تک یہ صحیح ہے کہ اس تبدیلی مذہب یا زیادہ بہتر الفاظ میں اس ارتداد کی تہ میں ایک جگہ شادی کرنے کا مقصد کام کر رہا تھا[2]۔

۷۔ «مالک نے کہا میں تجھے سکون دوں گا۔ تو نے میرے کرم کو حاصل کر لیا۔ میں تجھے تیرے نام سے پہچانتا ہوں اور میں تجھے ہر چیز میں مسرت بخشوں گا»

---

۱ ''پنجابی'' ۵ جون سنہ ۱۸۷۳ع۔

۲ [illegible]

مجھے امید ہے کہ یہ سکون بخشنے والا وعدۂ خداوندی ان مرحوموں کے لیے پورا ہوگا جن کا میں ذکر کرنے والا ہوں۔

یکم جنوری سنہ ۱۸۷۲ع کو مشہور مستشرق کاونٹ یوسیب دٓ سال (Euseb de Salles) کا جو کہ جنرل کاونٹ د سال کے عزیز تھے چھہتّر سال کی عمر میں اپنے وطن مون پیلیے (Mont Pellier) میں انتقال ہوگیا۔ موصوف کئی سال سے بڑی منقت سے السنۂ جدید مشرقیہ کے اسکول میں میرے ہندستانی درسوں میں شریک رہتے تھے۔ سنہ ۱۸۲۸ع میں وہ اس مدرسے کے چند اول ترین طالبان علم میں سے تھے۔ ان کے ساتھ بیرن کارویل دٓسارمارتن دٓ توستیں دو مانوآر (Caruel de Saint-Martin de Toustain du Mancir) بھی شامل تھے۔ ہندستانی کے درسوں سے انھیں بہت زیادہ دلچسپی تھی کیونکہ انھوں نے ہندستانی نسل کی ایک بہت قابل خاتون جن کی مادری زبان ہندستانی تھی یعنی سارا کریتندن (Sarah Cretenden سے' جو کاونٹ ایوان دٓ لا تراں‌بلیے Even de la Tremblaye کی بیوہ تھیں' شادی کی تھی۔ یہ شریف خاتون چالیس سال یوسیب دِ سال کے نکاح میں رہیں اور وفاداری سے ان کی تمام سیاحتوں میں ان کا ساتھ دیا۔ ان کے شوہر کے انتقال کے کچھ عرصہ پہلے ان کا بھی انتقال ہوا اور اسی کا صدمہ ایک بڑی حد تک ان کے شوہر کی موت کا باعث ہوا۔

یوسیب دٓ سال نے میرے استاد سیلوستر دٓ ساسی (Sylvestre de Sacy) اور کاسین د پرسےوال (Caussin de Perceval) سے عربی سیکھی تھی چنانچہ وہ الجزائر کو فتح کرنے والی فوج کے پہلے مترجم مقرر ہوئے اور اس کے بعد مارسیلی (Marseille) میں داں گابریے تاوئی[1] (Don Gabriel Taouil) کی جگہ عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے جہاں تیس سال کے عرصے میں ان کے شاگردوں کی تعداد بہت کثیر تھی۔

---

[1] یہ مشہور مصری اور ان کے هم‌وطن داں داناثی موناکی (Don Rephael Monachis) سلوستر دٓ ساسی کے بعد سنہ ۱۸۱۴م میں میرے استاد رہے۔

مجمع الجزائر میں حسن خدمت کے صلے میں یہ جگہ انہیں دی گئی اور انہیں مشہور مصری مکینیر پر ترجیح دی گئی جنھوں نے دن گبرے کی جگہ کام کرنا شروع کردیا تھا۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص کوئی جگہ پانے والا ہوتا ہے اور وہ اسی کو نہیں ملتی۔

بوحن۔ دس سال ہر اس میں کامل تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں علوم مشرقیہ، فلسفے اور مذہب پر لکھیں اور ایسے ناول لکھے جن میں سے اکثر بہت کامیاب ہوئے۔ ان کے "مسمر شدہ ہائے مشرق" نہ صرف غایت درجہ دلچسپ بلکہ سبق آموز ہیں۔ اپنی "تاریخ عمومی نسل ہائے انسانی" (Histoire Generale des races Humaines) میں انھوں نے اپنے حصوں میں اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر انجیل مقدس کے اس بیان کی تائید کی ہے کہ نسل انسانی کی بنا ایک ہی ہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ چنانچہ ان کے دوست مسٹر بیرن گاستان دفلوت (Gasten de Flotte) نے جو ان کی خداداد قابلیت کے معترف ہیں اور خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کی مجموعۂ اضداد طبیعت سے محبت رکھتے تھے، گزت دو میدی (Gazette du Midi) میں ایک مضمون لکھا ہے جو خیالات اور تحریر کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔

ہنری کرٹز (Herrn Kurtz) جو مشہور مستشرق تھے ۲۵ فروری کو فوت ہوئے۔ یہ بھی میرے درسوں میں شریک رہ چکے ہیں مگر آخری زمانے میں یعنی سنہ ۱۸۵۴ء تا سنہ ۱۸۵۵ء۔ اس کے بعد ہی ہندستانی کی تحصیل سے انہیں دلچسپی رہی اور ان کے پیرس چھوڑنے کے کئی سال بعد تک مجھ سے ان سے خط و کتابت رہی۔ یورپ میں اپنے آزاد خیالات کی وجہ سے انہیں جن مصائب کا شکار ہونا پڑا اور سوئزرلینڈ میں وہاں کی نام نہاد کلیسائی جماعت سے ان کی جو مخالفت ہوئی ان سے یورپ کی پبلک ان کی تصنیفات اور بحیثیت پروفیسر ان کے کام کے مقابلے میں زیادہ واقف ہے۔ وہ ضلع آرگووی (Argovie) کے اسکول کے پروفیسر اور شہر آراؤ (Aaraw) کے کتب خانے کے مہتمم تھے اور اسی شہر میں ان کا انتقال ہوا۔

۱۴ اپریل کو بمقام پیرس کپتان هنری بلاس لینچ (Henri Blosse Lynch) کا انتقال هوا۔ تقریباً بیس سال سے وہ پیرس هی میں مقیم تھے اور یہیں ان کے قابل فرزند کا انتقال هوا۔ کپتان صاحب انگریزی بحری فوج میں کماندار تھے۔ هندستانی السنہ اور فارسی عربی میں اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ یہ سب زبانیں انھوں نے کلکتہ میں سیکھی تھیں اور ان میں بےتکلفی سے بات چیت کرسکتے تھے۔ ایشیا کے بیشتر شہروں کا دورہ کرنے کی وجہ سے انھیں یہ خصوصیت حاصل هوگئی تھی کہ بہت اهم امور میں وہ حکومت انگریزی کی طرف سے ترجمے اور تفہیم کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔ بہت سی اهم مہمات خلیج فارس، سندھ، شام، برما (جہاں وہ فتح رنگون سنہ ۱۸۵۱ع میں شریک تھے) اور پیرس میں ان کے سپرد کی گئی تھیں۔ پیرس میں ایرانی سفیر سے وہ صلح کی سلسلہ جنبانی کررهے تھے جس نے بالآخر ۴ مارچ سنہ ۱۸۵۷ع کے معاهدے کی شکل اختیار کی۔

وہ قابل تھے اور خودستائی سے پرهیز کرتے تھے۔ میرے هندستانی درسوں میں ان سے بہت مدد پہنچی۔ یہ شخص جو هر ایک کو اپنا ممنون بنا لیتا، اپنے تمام ملنے والوں کا ممدوح تھا، اس کا انتقال میرے ایک بہترین برطانوی دوست کے ضایع هوجانے کے مترادف ہے۔

پیرس هی میں اسّی سال کی غیرمعمولی عمر میں یکم مئی کو میرے بہت هی پرانے درس لینے والوں میں سے ایک آگستان کرسٹوف لامارپکو (Augustin-Christophe Lamare-Picquot) کا انتقال هوگیا جو بڑے انتھک سیاح اور مشہور ماهر حیوانیات و نباتات تھے۔ میرے ساتھ وہ اکثر ان هندستانیوں سے ملنے جاتے تھے جو پیرس سے گزرتے تھے تاکہ انھیں هندستانی بولنے کا موقع ملے۔ ان سے میرے مراسم دوستانہ اور محبت کے تھے۔

۱۸ اکتوبر کو لندن میں (بمقام الگزنڈرا هوٹل، هائڈ پارک کارنر) مسٹر ڈبلیو۔ فاکس (W. Fox) کا انتقال هوگیا جو نواب بنگال کے معتمد خاص تھے اور جن سے انھیں اس‌قدر محبت تھی کہ ان کے انتقال کے بعد وہ مع اپنے بیٹے اور اپنے

درباریوں کے ان کے جنازے کے ساتھ گئے اور ان کا رنج و الم دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا ... میں جس ... سے ملنے جاتا تھا تو مرحوم سے بھی ملاقات ہوتی تھی ... دیکھتا تھا کہ ... وہ ہندستانی میں گفتگو کر سکتے ہیں ... خلاف ... لوگ جو انہیں جانتے تھے ان کی وفات پر ... ہیں۔

ہم اس ... کو ایک انگریزی ... کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں جو ... کے ایک مشہور ... سے ماخوذ ہیں:

"(حقیقی) مسرت ان مرحوموں کو حاصل ہے جو اپنے خدا کی ہستی میں بڑے لطف سے ... ہو گئے ہیں ... وہ تمام ... مصیبتوں سے آزاد ہیں اور حفاظت سے خدا کی نگہبانی میں آرام کر رہے ہیں ... روح القدس ... خوش نصیب اور ہمیشہ کے لیے خوش نصیب قرار دیا ہے۔"[1]

---

1 Happy are the faithful dead,
In the Lord who sweetly die.
They from all their toils are freed,
In God's keeping safely lie.
There the spirit has declared
Blest, unalterably blest.

مولوی مظہر علی سندیلوی کی ڈائری

(۴)

(از نورالحسن صاحب ہاشمی ایم - اے، علیگ)

۲ فروری سنہ ۱۹۰۵ء آج کل برف بہت گر رہی ہے اور ہوا بہت تند چلتی ہے جس سے بےحد سردی ہے اور کثرت برف سے مٹر، چنا، ارہر اور آلو جاتا رہا اور جو ظروف پانی سے بھرے ہوئے صحن میں رکھے تھے ان میں بھی برف جم گیا اور کڑھا تالاب مخدوم پور کا ایک حصہ اس سے منجمد ہوگیا - آج کل نہایت شدت کی سردی ہے کہ میری کوٹھی کے اندر انگلیاں ٹھٹھری جاتی ہیں اور صبح و شام دونوں وقت اپنی کوٹھی میں انگیٹھی روشن کرایا کرتا ہوں جب چین پڑتی ہے -

۶ مارچ سنہ ۱۹۰۵ ع آج شب کو میر جدید پوتے میر انیس لکھنؤ نے چودھری محمد جان صاحب تعلقہ‌دار کے امام باڑہ میں مرثیہ مصنفہ خود پڑھا جن کا یومیہ ایک رات ٹھیرنے کا پچاس روپے قرار پایا تھا - باوصف طلب میں شریک مجلس نہیں ہوا کہ اب مجھے خوشی دنیاوی کا کوئی لطف باقی نہیں اور بحالت افسردگی ایّامِ زندگانی بسر کیے جارہا ہوں - برخورداران مصطفیٰ علی و مجتبیٰ علی شریک ہوئے تھے - سنا گیا کہ کچھ اچھا نہیں پڑھا -

۲۹ جنوری سنہ ۱۹۰۶ء	میلہ کنبھ الہ آباد میں جو بھی ختم ہوا ہے بیس لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ۲۳ جنوری سنہ ۱۹۰۶ع کو

کثرت ازدحام سے [illegible] آدمی ہلاک ہوئے اور بیشمار سخت مجروح ہوئے۔

۱۰ مارچ سنہ ۱۹۰۶ء	چونکہ [illegible] دختر برخوردار سعیدالدین کم عمری [illegible] میں بیوہ ہوگئی لہذا برخلاف

رسم قدیمہ [illegible] عقد ثانی [illegible] جوئے

۱۷ اپریل سنہ ۱۹۰۶ء	[illegible] کے چہلم کی خبر جو ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۰۶ع کو تھا [illegible] معلوم ہوئی کہ سنیوں اور ہندوؤں کے تعزیے

نہایت دھوم دھام سے [illegible] اور گشت [illegible] منشی احتشام علی ولد منشی امتیاز علی مرحوم کی [illegible] جو [illegible] پھول کٹورہ کے نام سے موسوم ہوئی ہے [illegible] قائم تھیں۔ مجمع ہمراہ تعزیوں کے اس قدر تھا [illegible] کٹورہ کی کربلا میں شاید کبھی نہ ہوا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ سے سوا لاکھ تک آدمیوں کا مجمع تھا [illegible] کربلا میں جان محمد نے ایک ہوٹل قائم کیا تھا جہاں ہر شخص کو مفت کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ گھوسیوں سے چھ سو من دودھ کا بندوبست کیا جو شربت میں ملایا گیا تھا۔ منشی احتشام علی نے کربلا پھول کٹورہ میں تقسیم طعام کا بندوبست کیا تھا جو ہرایک کو دیا جاتا تھا۔ گول دروازہ لکھنؤ سے پھول کٹورہ کربلا تک تین کوس کا فاصلہ ہے۔ اثنائے راہ میں بیس پچیس سبیلیں ہر قسم کی تھیں جن میں برف پڑا ہوا تھا۔ کربلا میں ہر قسم کے فرقہ و طبقہ کے لوگ از قسم تفریح کناں تھے۔ برخلاف اس کے تال کٹورہ شیعوں کی کربلا میں سناٹا تھا حتیٰ کہ غلام حسین عرف بُتّن صاحب کا تعزیہ جو بارہ بجے نہایت مجمع کے ساتھ اٹھتا تھا وہ چار بجے شام تک بوجہ نہ ملنے مزدوروں کے نہیں اٹھ سکا۔ لکھنؤ اہل تشیع سے یہ بڑی غلطی ہوئی جو انھوں نے قید لگائی تھی کہ سُنّی و ہندو جو اپنے تعزیے تال کٹورہ کی کربلا میں لے جائیں وہ ننگے سر برہنہ پیر ہوں۔

ایسی حماقت پر ان کو شکست فاش ملی کہ سُنّی و ہندو متفق ہوگئے اور انھوں نے بالاتفاق یہ کارروائی کی۔

۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ع آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۴ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ع وقت شب کو ہز آنر سر لاٹوش صاحب لفٹنٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ کی جانب سے بمقام نینی تال ان کی کوٹھی کے سامنے محفل میلاد شریف منعقد ہوئی اور اس جلسہ کا اہتمام صاحب بہادر کے حکم اور ان کے اہتمام سے ہوا تھا۔ محفل کی آراستگی و شیشہ آلات کی روشنی اور آدمیوں کا ہجوم قابل دید تھا۔ مولانا حاجی حافظ ولایت حسین صاحب جو الہ آباد سے بلوائے گئے تھے جب آپ جلسہ میں تشریف لائے تو لاٹ صاحب نے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور تخت پر بیٹھنے کی اجازت دی اور سب اہل مجلس کو تاکید فرمائی کہ کوئی ہماری تعظیم کو نہ اٹھے۔ مولوی صاحب نے تین گھنٹے کے قریب مولود پڑھا۔ لاٹ صاحب نے ایک گھنٹہ سے کچھ زاید بہت دلچسپی سے بیان سنا۔ اس کے بعد اٹھ کر مولوی صاحب سے ہاتھ ملایا اور یہ کلمات فرمائے کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس جلسہ میں شریک کیا۔

۲۱ نومبر سنہ ۱۹۰۷ع چونکہ زمانہ قحط سالی ہے جس سے ہرایک شے گراں و کمیاب ہے اور سب سے بڑی کمیابی گھاس کی ہے جو بالکل میسر نہیں آتی اور مویشی مرے جاتے ہیں لہذا ہندو مسلمان دونوں اپنے مویشی قصائیوں کے ہاتھ فروخت کررہے ہیں اور گوشت کا نرخ آج کل سستا یعنی دو پیسے فی سیر فروخت ہوتا ہے اور ان کا چرسہ معمول سے زیادہ قیمت پر بکتا ہے آج کل قصابوں کی اس قدر تعداد بڑھ گئی ہے کہ ہرایک ادنیٰ قسم کے مسلمان نے یہ پیشہ اختیار کرلیا ہے۔ آج کل مویشیوں کی وبا ہے۔

۲۶ دسمبر سنہ ۱۹۰۷ع آج نرخ غلہ بازار سندیلہ میں حسب ذیل ہے :-

گندم	آردگندم	نخود	دانہ نخود	ماش
۷ سیر	ساڑھے ۶ سیر	۸ سیر	ساڑھے ۸ سیر	۵ سیر

دال ماش | مونگ | دال مونگ | ارہر

ساڑھے ۴ سیر | ساڑھے ۷ سیر | ساڑھے ٦ سیر | ۹ سیر

دال ارہر | جو | بجرہ | آرد باجرہ | چاول

ساڑھے ٦ سیر | [illegible] سیر | ساڑھے ۸ سیر | ساڑھے ۷ سیر | ٦ سیر

چنا | [illegible] | [illegible] | دال | نمک | گھی

۹ سیر | [illegible] سیر | [illegible] سیر | ۱۱ سیر | ۱۹ سیر | ۱ سیر ۲ چھٹانک

روئی | قند [illegible] | سرسوں | روغن سیاہ

[illegible] | [illegible] | ساڑھے ۵ سیر | ۲ سیر ۲ چھٹانک

۱۳ [illegible] | [illegible] چونکہ لکھنؤ میں شیعہ و سنی میں [illegible] صورت جماعت لوگ حسب الحکم ڈپٹی [illegible] اور شیعہ لوگوں نے خلاف اجازت تبرا [illegible] اور شیعوں کے لڑائی شروع ہوگئی۔ [illegible] ایک آدمی مرگیا اور [illegible] اسی وقت فوراً موقع پر پہنچ گئی [illegible] زیر حراست پولس ہوئے۔ اب تحقیقات ہو رہی ہے [illegible]۔

۱۱ نومبر سنہ ۱۹۰۰ء | [illegible] صاحب نے مجھے ایک کتاب دیوان حافظ [illegible] تصویر [illegible] سابق دکھلائی جو ایک سو برس کی لکھی ہوئی ہے [illegible] کی ہے جس کو موصوف الیہ نے بقیمت ایک سو [illegible] روپیہ خرید کی ہے۔

۱۱ نومبر سنہ ۱۹۰۰ء | آج ساڑھے چھ بجے صبح کو مسماۃ محمودن اہلیہ [illegible] نے بعوارض چند عمر ۵۰ سال قضا کی۔ متوفیہ کے مزاج میں جھنک اور مالیخولیا پیدا تھی۔ ایک روز متوفیہ مجھ سے کہنے لگیں کہ دنیا میں [illegible] عقل ہے۔ ایک مجھ میں ہے اور نصف تم میں۔ لیکن

اس میں شک نہیں کہ وہ ذی ہوش عورت تھی اور معاملہ کی بہت صاف۔

۲۳ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع | آج لارڈ منٹو صاحب وائسرائے کشور ہند ایک نہایت عمدہ رام‌بھج ہاتھی بلرامپور پر سوار ہوکر لکھنؤ مچھی بھون کی راہ سے گزرے۔ ہاتھی مذکور کو ہرایک قسم کا طلائی و نقرئی زیور پہنایا گیا تھا حتٰی کہ اس کے پیروں میں چاندی کے پازیب تھے اور اس کے عقب میں ۱۶۰ تعلقدار ہاتھیوں پر سوار تھے۔ ہرایک ہاتھی خوب سجا ہوا تھا۔

۲۵ جنوری سنہ ۱۹۰۹ع | سر ہویٹ صاحب لفٹنٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ واودھ نے سر دگبجے سنگھ صاحب مہاراجا بلرامپور و پریسیڈنٹ انجمن تعلقداران کی شبیہ کا افتتاح فرمایا جو بارہ‌دری قیصر باغ میں رکھی گئی ہے۔ اس شبیہ کی تیاری میں چوبیس ہزار روپیہ خرچ ہوا جس کو مسٹر کاسکوب جان نے بنایا اور اس کی بیٹھک کی تیاری میں چار ہزار روپیہ صرف ہوئے جس کو بابو درگاپرشاد سنگ تراش لکھنؤ نے تیار کیا۔

۱۳ مارچ سنہ ۱۹۰۹ع | آج لکھنؤ میں تعزیہ چہلم تمثیل باغ سے اٹھا جس کے آگے مرثیہ چاریاری پڑھا جاتا تھا جس کی گورنمنٹ نے قبل آغاز مہینہ محرم ممانعت کردی تھی کہ تعزیہ کے سامنے چاریاری مرثیہ نہ پڑھا جاوے مگر برخلاف اس کے جب سنّی لوگ چاریاری مرثیہ پڑھتے ہوئے چوک لکھنؤ سے گزرے تو پولس کے لوگوں نے گول دروازے کے پاس سب کو گرفتار کرکے کوتوالی میں کردیا اور جس شخص نے دس روپے کی ضمانت پیش کی اسے چھوڑ دیا گیا۔ باقی لوگ حوالات بھیج دیے گئے۔ پولیس کے ساتھ سٹی مجسٹریٹ و ڈپٹی کمشنر لکھنؤ اور بابو سری‌رام آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کارروائی میں کسی بڑے شخص کی تحریک ہے۔ ورنہ ادنیٰ کم بضاعت لوگوں کو ایسی جرأت نہ ہوتی جو حکم گورنمنٹ کے خلاف کارروائی کرتے۔ مجمع کی تعداد سات آٹھ سو کے قریب سُنی جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ فعل سُنّیوں کا بالکل جاہلانہ ہے؛ ان کو خلاف‌ورزی و سرتابی گورنمنٹ کے حکم سے ہرگز نہ کرنا چاہیے۔

یکم اپریل سنہ ۱۹۰۹ء

جن سُنّیان لکھنؤ نے حکم گورنمنٹ کی خلاف‌ورزی کی اور چہلم کے روز تعزیہ کے ساتھ چاریاری مرثیہ پڑھتے ہوئے چوک سے گزرے ان کو مسٹر جالمنگ صاحب سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ نے تین تین مہینہ قید سخت کی سزا دی۔ ۲۹ مارچ سنہ‌الیہ کو ان لوگوں کے خلاف حکم سنایا گیا۔

۸ اپریل سنہ ۱۹۰۹ء

آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۵ اپریل سنہ ۱۹۰۹ء کو مسٹر وارٹن صاحب سیشن جج لکھنؤ نے اپیل سُنّیوں کا جنھوں نے چاریاری مرثیہ پڑھا تھا خارج کردیا اور تین ماہ کی سزا مجوّزہ سٹی مجسٹریٹ صاحب لکھنؤ بحال رکھی۔

۱۹ جولائی سنہ ۱۹۱۱ء

آج صحبت مشاعرہ مقبرہ منشی سید فضل‌رسول صاحب بر وقت گیارہ بجے دن منعقد ہوئی اور رات تک شعرا اپنا کلام پڑھتے رہے۔ لکھنؤ، سیتاپور، ہردوئی، شاہجہاں‌پور وغیرہ سے شاعر لوگ آئے ہوئے ہیں اور اپنا کلام آبدار سنا رہے ہیں۔ چونکہ بعض شاعروں نے سید التفات‌رسول تعلقہ‌دار کو اپنے ڈھنگ پر لگا لیا ہے اس وجہ سے یہ مشاعرہ ایام عرس میں بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے اور بعض شاعروں کو خرچ آمد و شد بھی دیا جاتا ہے ایک شاعر لکھنؤی مستقل طور پر ملازم تعلقہ جلال‌پور ہیں جو پندرہ روپیہ ماہوار علاوہ کھانے کے تنخواہ پاتے ہیں۔ وہ تعلقہ‌دار صاحب کی جانب سے غزلیں تصنیف کردیا کرتے ہیں اور وہ غزلیں مشاعرہ میں پڑھی جاتی ہیں۔

آج مجھے ایک نئی رسم دریافت ہوئی جو میرے اور دوسرے گھروں میں رائج ہوئی جو پہلے میری سماعت میں نہیں آئی تھی وہ یہ ہے: ۲۱ رجب کو بوقت شب میدہ، شکر، گھی اور دودھ ملاکر ٹکیاں پکائی جاتی ہیں اور اس پر حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا فاتحہ ہوتا ہے اور ۲۲ رجب کی صبح کو وہ عزیز اقارب کو بلاکر کھلائی جاتی ہیں۔ اس طرح سے ہرایک گھر میں لوگ بلاکر کھلائے جاتے ہیں۔ ٹکیاں باہر نکلنے نہیں پاتی ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہوا ہے اس کا

عام رواج ہرایک مقام پر ہوتا ہے۔ میری یاد میں کبھی اس کا تذکرہ بھی سماعت میں نہیں آیا اور یہ فاتحہ ہرایک گھر میں نہایت عقیدت‌مندی کے ساتھ ہوا کرتا ہے اور یہ رسم برابر بڑھتی جاتی ہے۔

۱۳ نومبر سنہ ۱۹۱۱ء حکیم عبدالولی لکھنوی اور حکیم محمد اجمل دہلوی یہ چاہتے ہیں کہ ویدک اور طب یونانی کی شرکت ہو اور حافظ عبدالرشید خلف حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کا یہ منشا ہے کہ دونوں کی شرکت نہ ہو۔ اسی وجہ سے یہ جلسے بارہ‌دری قیصر باغ لکھنؤ میں ہورہے ہیں۔ شرکت کے متعلق بہنوں کو اصرار ہے۔ اب دیکھنا چاہیے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

مقامی حالات ختم ہوئے، اب یہاں سے ذاتی حالات پیش کیے جاتے ہیں۔ حقیقت میں مولوی صاحب نے یہ ڈائری محض اپنے زمانہ کی ایک دل‌چسپ تاریخ نہیں بلکہ ایک ذاتی سوانح عمری بھی ہے۔ دلی کیفیات اتنے عریاں تو نہیں جتنے (Pepys) کے ہیں مگر مولوی صاحب نے کوئی بات چھوڑی نہیں ہے اور خفیف سا پردہ جو قایم رہا ہے وہ محض اس لیے کہ ان کو یقین تھا کہ میری ڈائری ہرکس و ناکس کے مطالعہ میں آنا چاہیے اور آئے گی۔ ذیل کے اقتباسات سے ان کی پوری زندگی کے حالات، حلیہ، کیریکٹر، عادات، خیالات و جذبات، سلوک، آپس کی رنجشیں خصوصاً خالہ‌زاد بھائی سے جو تعلقہ‌دار تھے، لڑکوں کے خطوط کا خلاصہ جو لندن سے آتے تھے، روزمرہ کے تجربے غرض کہ ہر بات بہت مفصل اور واضح ہے۔ آخر میں ان کی بیوی کی موت کا اثر ان پر تکلیف‌دہ حد تک نمایاں ہے اور اسی زمانے میں وہ چند آرزوؤں کی کشمکش میں مبتلا ہوگئے تھے جس کا بیان دل‌چسپی سے خالی نہیں اور ڈائری میں افسانویت پیدا کردیتا ہے یہاں تک کہ وہ جاں بحق ہوجاتے ہیں۔ میں نے ان کے خاندان کے موجودہ افراد سے ان آرزوؤں کا مطلب پوچھا مگر وہ لوگ بھی نہ بتاسکے۔ بعض کا خیال ہے کہ کہیں باہر جانا چاہتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ کسی عورت سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر چاہتے یہ تھے کہ تحریک دوسری طرف سے ہو۔ غرض کہ بڑی بےقراری اور بےچارگی رہی ہے اور خاتمہ افسوس ناک طریقہ پر ہوتا ہے جو فنی نقطۂ نظر سے دل‌چسپ ہے۔ مولوی صاحب پہلے خوابوں فالوں اور نجوم پر بڑا اعتقاد اور بھروسہ رکھتے تھے لیکن پتہ چلے گا کہ رفتہ رفتہ کیوں کر ان چیزوں سے ناامیدی اور مایوسی ہوتی گئی۔ مولوی صاحب موصوف اپنے خوابوں میں خصوصیت سے اعتقاد رکھتے تھے تمام ڈائری ان کے دل‌چسپ خوابوں سے بھری پڑی ہے جن کی تعداد سیکڑوں پر پہنچتی ہے اور جو ایک ماہر نفسیات کے لیے دل‌چسپ مراد کا کام دے سکتے ہیں۔ مولوی صاحب ہر سال کے اختتام پر

بھی زندگی و... کے حالات پر ریویو ضرور کرتے تھے جو خالی از دلچسپی نہیں ہیں۔ ذیل کے اقتباسات میں بھی ... (اکثر دلچسپ بھی) معروف عنوانات چھوڑ دی گئی ہیں۔

۱۹ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ء — آج میں نے ٹوپی گول مخملی اودی خدابخش خیاط سے بنوائی جو نہایت خوشنما اور قابل محفل ہے۔

۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ء — بھائی ... کو معلوم ہوا کہ کرامت حسین آج کل مجھ سے ناخوش ہیں۔ بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی، شاید الطاف ... نہ ہو۔

... سنہ ۱۸۶۸ء — مجھے آج کمال افسوس ہوا کہ باوصف اس قدر سن آنے کے میں نے اب تک کوئی لیاقت حاصل نہیں کی لہذا کمال عاجزی سے درگاہ خدا میں ملتمس ہوں کہ مجھے لیاقت عطا فرمائے تا کہ میں اپنے ہمچشموں سے شرمسار نہ ہوں۔

۲۷ فروری سنہ ۱۸۶۹ء — علاءُ علی ساکن موضع مخدوم‌پورہ نے بلا وجہ مجھ سے گستاخی کی۔ لہذا ایک طمانچہ اس کے مارا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اپنے اس فعل سے نادم ہوا کہ خلاف تہذیب میں نے ایسا کیا۔

۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۹ء — آج میں حسب تحریک منشی فضل‌رسول صاحب بوقت شام لکھنؤ پہنچا۔ وقت ملاقات کے منشی صاحب نے فرمایا کہ میں تم کو بمقابلہ عنایت حسین و کرامت حسین و فضل حسین و حامد حسن کے چند وجہوں سے اچھا جانتا ہوں۔ اول تم جھوٹ نہیں بولتے ہو؛ دوسرے، مزاج میں جہالت نہیں؛ تیسرے متفاوت‌الفیض نہیں ہو؛ چوتھے معاملہ فہم ہو۔ اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ اپنے علاقے کا جو کورٹ ہونے والا ہے تم کو سربراہ‌کار مقرر کراؤں اور ... میری خواہش کو ضرور حکام منظور کریں گے۔

۶ مئی سنہ ۱۸۷۰ء — آج کل محکمۂ ... میں کام کی کثرت ہے۔ اس وجہ سے ۸ بجے رات کو مجھے مہلت ملتی ہے۔ ۱۰ بجے سے رات تک کام کرنے کرتے طبیعت مضمحل ہوجاتی ہے۔

بکم جولائی سنہ ۱۸۷۰ع | تقریب ختنہ میں میں نے عمدہ ھندستانی کھانا پکوا کر دونوں وقت مارٹین صاحب کو بھیجا جس کو تناول فرماکر بہت خوش ہوئے۔ مجھ سے کہا کہ اس تقریب میں کتنا روپیہ صرف ہوا۔ میں نے ایک ہزار روپیہ ازروئے حساب بتلایا۔ بہت تاسف کیا کہ تم نے ایک سال کی تنخواہ ایک چھوٹی سی تقریب میں خرچ کر ڈالی ۔ یہ طریقہ ناپسندیدہ ھے۔

۳۰ ستمبر سنہ ۱۸۷۰ع | آج میں نے پنڈت گوردیال کو پانچ روپے دیے کہ جو قمر نحس زائچہ میں بیٹھا ھے اس کی نحوست کے انسداد کے لیے کچھ جپ کریں۔

۱۱ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ع | آدمی ہر دلعزیز اسی حالت میں ھوسکتا ھے جب خودغرضی اس کی ظاہر نہ ھو اور ھرایک کے ساتھ بخلق پیش آئے اور ان کے اغراض کے پورا ھونے میں مساعی رھے ۔

۱۱ جولائی سنہ ۱۸۷۲ع | خبر برخاستگی دفتر ریل دریافت کرکے مجھے کمال تشویش لاحق ھوئی۔ نہیں معلوم کہ اب آب و دانہ کہاں لے جائےگا اور اس حالت پریشانی میں خواجہ معین‌الدین چشتی قدس اللہ سرہ کے دیوان میں فال دیکھی ۔ اشعار ذیل برآمد ھوئے جس سے ھر آیندہ امید کامیابی کی پائی جاتی ھے:

گرچہ از جائے برون است و لیکن بخدا — کہ شب و روز درون دل ما جا دارد
عاقبت چہرۂ دلدار عیاں خواھد بود — ھر کہ آئینہ زنگار مصفا دارد
حسن آں ماہ چو خورشید پدید است معین — محرم آن است کہ او دیدۂ بینا دارد

۲۳ جون سنہ ۱۸۷۳ع | آج جان صاحب ٹھیکہ‌دار اینٹ کو شہر کانپور میں دو ہزار روپے دیے۔ بعد لینے روپے کے صاحب موصوف نے کمرہ کے کواڑ بند کرلیے جہاں سوائے میرے اور ان کے دوسرا شخص نہ تھا۔ مبلغ دس روپے بطورنذر کے پیش کیے اور اس کے قبول کرنے میں ازحد اصرار کیا ۔ میں نے کہا یہ امر میری عادت کے خلاف ھے اور میں ایسے نذرانہ کو کسی حالت

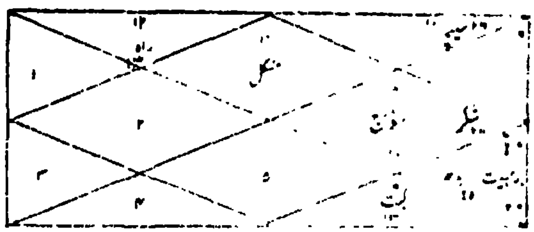
میں جائز نہیں لہذا ممکن اس سے نہ مانا جبریہ زر مذکور دے کر بہت شایستگی کے ساتھ رخصت کیا۔ میں نے سروہ سے خیال ہے کہ بحالت سخت انکار ناراض ہو کر کوئی شکایت حاکم سے کرتے تو اس کا کوئی ثبوت میرے پاس نہیں ہے چار و ناچار قبول کر کے ایک سو اس کا محتاجوں کو تقسیم کر دیا۔

۱۸ اگست سنہ ۱۸۷۵ع	منشی مظفر علی صاحب اسیر لکھنوی و آفتاب‌الدولہ

رئیس لکھنؤ نے محل‌سرا نوتعمیر کا ملاحظہ کیا اور ہر ایک چیز کو بغور دیکھ کر پسند فرمایا۔ یہ دونوں صاحب منشی فضل‌رسول صاحب کے ان دنوں مہمان ہیں۔

۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۷۵ع	آج والدہ مصطفیٰ علی حویلی نوتعمیر میں آئیں۔ زائچہ آنے مکان کا درج ذیل ہے:

۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۷۵ع ایک بج کر ۳۰ منٹ



مطابق ۲۵ شوال سنہ ۱۲۹۲ھ یوم پنج‌شنبہ

۱۶ اگست سنہ ۱۸۷۸ع	مولوی ظہور احمد نے خشت ہائے چبوترہ مزار حسن میاں صاحب واقعہ مسجد قدیم اپنے پاخانہ زنانہ میں صرف

کیں۔ میں نے منع کیا کہ یہ فعل ناجائز ہے۔ جواب میں ناخوش ہوئے کہ یہ فعل ناجائز نہیں ہے۔ میں نے سکوت کیا اور اس جملہ پر کفایت کی کہ خدا مبارک کرے۔

۱۴ ستمبر سنہ ۱۸۷۹ع	آج یہ نصیحت "سوچ سمجھ کر بات کرو کہ پشیمان نہ ہو" مصطفیٰ حسین سے لکھا کر شیشہ کے چوکھٹے میں

رکھ کر اپنے کمرہ نشست‌گاہ میں آویزاں کی تا کہ ہر وقت کے دیکھنے سے مجھے اور دوسروں کو نصیحت نیک حاصل ہو۔

۸ مارچ سنہ ۱۸۸۲ع — چونکہ میں تعلقہ جلال‌پور سے تنخواہ کے سوائے نذر تک نہیں لیتا ہوں اور کوئی چیز فصلی باغات و دیہات کی اپنے مکان پر آنے نہیں دیتا ہوں اس وجہ سے میری طبیعت کو کسی وقت کسی قسم کی پژمردگی و تردد لاحق نہیں رہتا اور نہایت بےخوفی اور مستقل مزاجی سے کام تعلقہ جلال‌پور انجام دیتا ہوں۔

۲۳ اپریل سنہ ۱۸۸۵ع — آج کل تین قسم کے میں کام انجام دیتا ہوں :۔ کار مجسٹریٹی متعلقہ سندیلہ، خاص انتظام علاقہ‌داری جلال‌پور، کارروائی میونسپلٹی سندیلہ۔ اس وجہ سے مجھے بہت کم فرصت رہتی ہے تاہم میں کام سے گھبراتا نہیں ہوں اور کمال مستقل مزاجی سے ان کو انجام دیتا ہوں۔

۵ اکتوبر سنہ ۱۸۸۵ع — آج کل خواب خوش میرے معائنے میں آتے ہیں۔ خدا ظہور نیک فرمائے کیونکہ یہ میرا تجربہ ہے کہ جب میں اچھے خواب دیکھتا ہوں تو اس کا ظہور اچھا ہوتا ہے اور جب برے دیکھتا ہوں تو برا۔

۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۸۷ع — محمد حسین عرف چھوٹن ساکن درگاہ بعمر ۷۰ سال فوت ہوئے اور کل جائداد منقولہ و غیرمنقولہ اپنی مع خانہ سکونت بیچ کھائی۔ افیون کا استعمال زیادہ تھا۔ ایک مرتبہ عطاری کی دکان کی تھی اور کل اشیا شیریں بجائے بیچنے کے خود ہی چکھ گئے۔

۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۸۷ع — ابتداءً میری جائداد آبائی و موروثی کچھ نہ تھی حتیٰ کہ مکان سکونت بھی مشترک تھا جس میں چند اعزہ کے گھروں سے کھڑکیاں تھیں؛ اس سے مکان غیر محفوظ اور موجب تکلیف کا متصور تھا۔ ابتداء میری ملازمت مدرسہ سندیلہ میں ہوئی اور اسی وقت سے مجھے شوق حصول ریاست کا پیدا ہوا اور میں نے معاملات رہن بیع کرنا شروع کیے۔ اولاً ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۶۷ع کو ایک قطعہ اراضی زرعی موسومہ کسہا تعدادی ۵ بیگہ واقع موضع مخدوم‌پور مملوکہ میر احمد بخش صاحب مرحوم مخدوم‌زادہ درگاہ مبلغ ۱۵ روپے پر رہن رکھا جس کا حاصلات مبلغ ۴ روپے سالانہ تھا۔ اس کے بعد جوں جوں

میری تنخواہ میں ترقی ہوتی گئی میں ریاست پیدا کرتا گیا اور اس کے حصول میں باعث کمی زر کے پہنچنے دیر بہت تکلیف گوارا کی لیکن شوق کو کسی طرح سے کم نہیں کیا اور اس بات کا ہمیشہ خیال ملحوظ خاطر رہا کہ اس قدر جائداد غیر منقولہ پیدا کر لینا چاہیے کہ وقت بے روزگاری میں اپنی مصارف روزینہ کی ہوسکے اور قیام سندیلہ حالت بے کاری مجبوراً ترک کرنا نہ پڑے۔ ہزار ہزار شکر پروردگار عالم کہ اس نے اپنے فضل سے میرے ان خیالات کو پورا کیا اور بقدر میرے صرف کے جائداد غیر منقولہ مجھے حاصل ہوئی جس سے اوقات بسری بآسانی بسر ہو رہے ہیں۔ میں نہایت مناسب سمجھتا ہوں کہ جس قدر جائداد غیر منقولہ علاوہ زر نقد اور زیور جو اس وقت میرے قبضہ میں ہے حوالہ قلم کروں اور جس قدر تمتع منافع زر تمسکی سے حاصل ہوتا ہے اس کو بھی لکھوں تاکہ میرے جانشیناں کو معلوم ہو کہ میں نے ملازمت کے انیس سال کی مدت میں کس قدر ترقی کی جس سے اکثر رؤسا قصبہ ہذا مغیرہ حالتی روزگار کو باعث حسد متصور ہے۔ دس پندرہ برس قبل جائداد غیر منقولہ کی اتنی قدر نہ تھی جیسی کہ اس وقت ہے اسی وجہ سے اس زمانہ میں بہت کم قیمت پر حاصل ہوئی۔ اگر وہ زمانہ حال میں بہ نرخ بازار فروخت کی جائے تو کوئی محل شک کا نہیں ہو سکتا کہ دو چند قیمت اس کی ملے۔

میزان جملہ جائداد منقولہ و غیر منقولہ

چوالیس ہزار پانچ سو سرسٹھ روپے سات آنے چار پائی

۲۵ جنوری سنہ ۱۸۸۸ع — میں نے جو خط مبارکباد حصول خطاب منشی نولکشور مالک مطبع اودھ اخبار محررہ ۱۲ جنوری سنہ ۱۸۸۸ع کو بھیجا تھا وہ اودھ اخبار ۲۴ جنوری سنہ الیہ نمبر ۱۳۹ میں طبع ہوا ہے۔

۱۲ فروری سنہ ۱۸۸۸ع — اخبار خیرخواہ عالم دہلی محررہ ۸ فروری سنہ ۱۸۸۸ع اور اخبار دبدبۂ سکندری رام پور محررہ ۶ فروری سنہ ۱۸۸۸ع میں میرے باغ و کنواں واقعہ موضع پرکاپور کی بہت تعریف لکھی ہے۔ میں نے یہ دونوں چیزیں محض واسطے رفاہ عام کے بنوائی ہیں۔

۱۷ فروری سنہ ۱۸۸۸ع | آج میں نے فال اپنی بہبودی کی کتاب سکندر نامہ میں دیکھی جس کا یہ جواب نکلا ـ شعر :

مبارک بوَد فال بر رُخ زدن نہ بر رُخ زدن بلکہ شہ رُخ زدن

۱۵ مارچ سنہ ۱۸۸۸ع | صبح کے وقت خواب دیکھا کہ نازنین اہل فرنگ ناکتخدا ایک کمرہ نفیس میں بالتفات مجھ سے پیش آئیں اور اپنے دونوں رخساروں پر بخوشی بوسے دیے ـ یہ خواب ایسا ہے کہ کبھی مجھے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن حصول کامرانی اور دولت اس کی تعبیر ہے ـ

۲۳ اگست سنہ ۱۸۸۸ع | تجربہ سے ظاہر ہوا کہ دھبہ ہائے ذیل اشیا مندرجہ تحت سے دھوئے جائیں تو معدوم ہو جاتی ہیں ـ اگر گھی کا دھبہ پڑ جائے تو سجّی سے جاتا رہتا ہے ' تیل کا دودھ سے ' روشنائی کا دہی سے ' پان کی پیک کا شکر سے ـ

۷ اکتوبر سنہ ۱۸۸۸ع | دو بجے رات میں سو رہا تھا ـ ایک کھنکھجورہ نے میری بائیں پنڈلی میں ایسا کاٹا کہ خواب مفقود اور سوزش سے پریشان ہوگیا ـ وہ موذی اس وقت مارا گیا جو رزائی میں لپٹا تھا ـ یہ پہلا مرتبہ ہے کہ مجھے اس سے ضرر پہنچا ـ سوزش اس کی مساوی نیش بھڑ کے ہوتی ہے ـ مقام ماؤف پر استعمال عرق پیاز سے افاقہ ہوا جو اس کا علاج مجرب ہے ـ

۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۸۸ع | آج کل منشی فضل حسین کسی کو نوکر رکھتے ہیں تو اولاً اس سے اقرار لیتے ہیں کہ مظہر علی (یعنی راقم) کے مکان پر نہ جانا اور نہ ان سے کوئی تعلق رکھنا یا ملاقات کرنا ـ ان کا یہ ظن غالب ہے کہ ان کے ملازمان موقوف شدہ علانیہ اور اکثر خفیہ مجھ سے رسم رکھتے ہیں اور میرے خیرخواہ ہیں اور عموماً کل باشندگان سندیلہ کی نسبت انہیں خیال میری ہمدردی کا ہے اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ مرتبہ باوصف تعلقہ دار

ہونے کے مجھے کیوں حاصل نہیں ہے۔ یہ خیالات منشی صاحب بجائے خود درست نہیں ہیں۔ یہ بات صرف نامقدار صاحب دولت ہونے سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ یہ رنگ ہی دوسرا ہے جب ہر شخص کو سرسری طور سے نصیب نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اپنے نفس پر اس قدر قادر نہ ہو کہ لوگوں سے بلحاظ ان کی منزلت و مرتبہ حال کے پیش آنا' ان کی مقاصد متوجہ ہوکر سننا اور نتیجہ مراد میں دریغ نہ کرنا' ان کے حق میں حسب موقع ... ہونا' بوقت استفسار ان کو صلاح نیک دینا' کسی حاجت مند کو ترش روئی کا جواب نہ دینا اور خاص خاص حالتوں میں ان کی دردمندی کرنا' اکثر مواقع پر صبر و تحمل کو روا رکھنا' دشمن کے ساتھ حتی‌الامکان دوستی کا برتاؤ کرنا اور جب عاجز و معذور ہو تو انتقام نہ لینا' بعض محل پر مصلحتاً اپنا نقصان جائز رکھنا' ہر ایک سے بلا کسی قید کے بااخلاق و محبت پیش آنا' نیک نیتی و خوش چلنی اختیار کرنا' ایفائے وعدہ میں کوشش کرنا' غلط بیانی سے احتراز کرنا' امور معاملات میں امانت کو راہ نہ دینا' سوچ سمجھ کر بات کہنا' بلاوجہ کسی کی غیبت و ہجو نہ کرنا' دشمنوں کے گھٹانے میں توجہ بلیغ رکھنا' اپنے اختیار و اقتدار پر مغرور نہ ہونا' مسلک صلح کل اختیار کرنا۔ جب یہ باتیں اختیار کی جائیں تو اس وقت مرتبہ ہردلعزیزی حاصل ہوسکتا ہے۔ اگرچہ ان سب پر میں ہنوز قادر نہیں ہوں لیکن کوشش کرتا ہوں کہ اپنے نفس کو اس جانب راغب کروں۔

۳۰ جنوری سنہ ۱۸۸۹ع | آج کئی روز سے بشب خوابہائے خوش نظر آئے ہیں۔ دو روز سے تو اپنے کو بمقام بلند اور گھوڑے پر سوار دیکھا اور آج صبح کو بھی عماری دار پر سوار اور ہمراہی میں بہت سا مجمع اور جلوس نظر آیا دیکھیے کہ اس کا ظہور کب ہوتا ہے۔ میں اپنی عقیدت سے لکھتا ہوں کہ میرے خوابوں کا ظہور کبھی دیر کبھی جلد ضرور ہوتا ہے جس کے امتحانات اور تجربے متواتر ہوچکے اور ہوتے جاتے ہیں لیکن ابھی تک یہ امر امتحان طلب ہے کہ کس موسم و تاریخ و دن کا خواب سریع‌الظہور اور بطی‌الظہور ہوتا ہے۔

۱۸ مارچ سنہ ۱۸۸۹ع

.........یہ عجب کارروائی ہوئی کہ بندہ خدا کی عرضی اور معزولی محمد یحییٰ! میں جہاں تک خیال کرتا ہوں تو یہ نتیجہ محمد یحییٰ کے اس ظلم کا ہے جو انھوں نے حافظ باسط علی واجب الرحم کو بلاوجہ ۱۰ مارچ سنہ الیہ کو صدمہ پہنچایا اور اس ظلم و ستم رسیدہ نے آہ سرد کھینچ کر اور سنگ شکیبائی اپنے سینۂ بےکینہ پر رکھ کر خواہان دادرسی اپنے منتقم حقیقی سے ہؤا جو استدعا فوراً مستجاب ہوئی جس کی تصدیق اس شعر سے ہوتی ہے:—

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

۵ مئی سنہ ۱۸۹۰ع

آج صبح کو حاجی وارث علی شاہ صاحب رئیس دیوان نے بطیب خاطر خود مجھے یاد کیا۔ میں فوراً مکان عبدالعلی موسی‌پور میں جا کر قدم بوس ہوا۔ شاہ صاحب نے خلاف عادت خود سر و قد میری تعظیم کی اور نہایت تپاک سے اپنے قریب بٹھلایا اور بعد دریافت خیریت و امور معمولی کے رخصت کیا۔ وجہ طلب میری سمجھ میں نہیں آئی۔ شاہ صاحب نہایت مکرم و محترم بزرگ ہیں۔ ہزارہا مرد و زن دیہ بدیہ شہر بشہر آپ کے مرید ہیں۔ آپ سوائے مریدوں کے اور کسی سے کم ملاقات کرتے ہیں۔ یہ محض آپ کی توجہ و عنایت خاص ہے جو اس صورت سے راقم کو اعزاز بخشا۔

۱۸ جولائی سنہ ۱۸۹۱ع

امور تقدیری میں انسان کی کوشش فضول ہے لیکن تاہم قناعت پر انحصار نہیں ہوسکتا........

۷ اگست سنہ ۱۸۹۱ع

تجربات پیہم سے مرتبہ یقین حاصل ہے کہ ہر شے نیک و بد کا معاوضہ اس دنیا میں فوری ملتا ہے مگر انسان کو اس کی ادراک کے لیے چشم بصیرت کی احتیاج ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کی بابت کسی کو تنبیہ نہیں اور کوئی شخص اپنے اعمال پر غور نہیں کرتا۔

۵ جولائی سنہ ۱۸۹۱ء

انسان کا دنیا سے بہ نیکنامی گزر جانا اس زندگی سے بہتر ہے جو بہ بدنامی زندہ رہے۔ جب کسی شخص کی عمر قریب بعمر طبعی پہونچے تو اس کو اپنے خدائے لم یزل سے یہ ہی دعا کرنا چاہیے کہ انجام بخیر ہو اور کوئی بدنامی اپنے ساتھ قبر میں نہ لےجاوے۔ میں اس وقت جو اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو تعالیٰ شانہ نے اپنے فضل و کرم سے بہت قسم کی نعمت‌ہائے دنیاوی مجھے عطا فرمائی ہیں اور کوئی تمنّا ایسی باقی نہیں رہی کہ جس کا میں آرزومند ہوں اور یوں انسان جب تک زندہ ہے اس کی تمنّاؤں کا تکملہ ہی نہیں ہوسکتا۔ اب میری خواہش دلی یہ ہے کہ قبل پیش آنے کسی بدنامی یا حزن و ملال، رنج و غم فکر و تردد کے اگر سفر آخرت مجھے پیش آوے تو اس سے بڑھ کر کوئی آرزو مجھ کو پیش نہاد نہیں۔ بحالت موجودہ کل سامان آسایش دنیاوی اس کی عنایت سے حسب ذیل مجھے حاصل ہیں: مکان نہایت آراستہ و پیراستہ بہمہ وجوہ مرتب، دیہات متعدد، ریاست قصبہ بقدر ضرورت، حکومت، قبضہ، حوصلہ افزائی، رؤسا درجہ اعلیٰ، وقار روبروے حکام وقت، محبت‌ہائے دلی من جانب اہالی قصبہ، وقعت روبروے ہمچشمان خود...

۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۹۱ء

میری طویل علالت سے جس کو ایک سال کا زمانہ ہوا اعزہ و احباب عیادت کرتے کرتے اکتا گئے اور تیمارداری سرانجام دہی خدمات سے گھبرا گئے ہیں۔ خود اول علالت دوسرے طوالت سے پریشان ہوں کہ ایسی چیز کی زیادتی جو باعث تکلیف دہی ہو داخل بےقدری ہے۔

۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۹۱ء

انسان اس وقت اپنے مراتب و مناصب میں ترقی کرسکتا ہے جب کہ جھگڑا فساد بلاسود سے اپنے کو محفوظ رکھے اور حتی الامکان مشرب صلح کل اختیار کرے اور اپنے سے بلند مرتبہ لوگوں سے ملے اور اظہار غرض میں احتیاط کرے اور جو بات زبان سے نکالے اس کو اولاً بخوبی سمجھ لیوے اور غلط بیانی کو علی‌الخصوص معاملت میں ہرگز راہ نہ دے۔

متانت، سنجیدگی و تہذیب کا شیوہ اختیار کرے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کو اپنے حصول مقاصد میں بالضرور کامیابی حاصل ہوگی اور نگاہ عوام میں ذی‌وقار متصور ہوگا۔

۳۱ جنوری سنہ ۱۸۹۲ع آج میں نے ایک روغن مجربہ برادرم سید حافظ علی ولد رحم‌رحمن خان صاحب اپنے درد شانہ میں ملا۔ اس سے اس قدر تخفیف ہوئی کہ میں اپنا دست چپ بلا تکلف سر تک بلند کر سکتا ہوں۔ نقل نسخہ واسطے استفادہ ناظرین کتاب ھذا درج ذیل کیا جاتا ہے :-

نسخہ روغن دافع درد ریاحی۔

لہسن	فرفیون	برگ سداب تازہ	عقر قرحا	پیپل	روغن کنجد یا زیتون
۱ تولہ	۳ ماشہ	ایک تولہ	۴ ماشہ	۳ ماشہ	پاؤبھر

کل چیزوں کو کوٹ چھان کر روغن تلی میں پکائے اور جب ایک ثلث رہ جائے اس کو چھان کر مقام ماؤف پر مالش کرے۔

۲۳ مارچ سنہ ۱۸۹۲ع مالیخولیا، خبط و بےخوابی وغیرہ کے کئی سبب ہیں اور ان میں خاص خاص وجہیں یہ ہیں:- طبیعت پر زیادہ زور دینا؛ دوسرے، ورزش نہ کرنا اور جسم سے کم کام لینا؛ تیسرے، مزاج میں استقلال اور عزم کا نہ ہونا؛ چوتھے، خطرناک طریقوں سے کام کرنا؛ پانچویں، دن رات خیال کرنے اور سوچنے کی بیہودہ عادت پر چلنا۔

۱۲ اپریل سنہ ۱۸۹۲ع بابو نوروز علی تحصیلدار سندیلہ کا بظاہر بےمروتی و خشن مزاجی سے کوئی دوست نظر نہیں آتا ...... میں نے اس قسم کا آدمی چھوٹے قد کا کبھی نہیں دیکھا کہ وہ اپنے راز کو علانیہ افشا کرے۔

۲۴ جون سنہ ۱۸۹۲ع تجربہ سے لکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص سونٹھ صاف چھنی ہوئی بقدر ایک ماشہ و نمک سیاہ ایک ماشہ باہم مخلوط کرکے بعد کھانے آم کے استعمال کرے تو ان کی تحلیل میں کوئی توقف نہ ہوگا کسی ضرر کے بغیر ھضم ہو جائیں گے۔

۹ نومبر سنہ ۱۸۹۲ء

تجربہ کار کا لفظ اسی شخص کی نسبت استعمال ہونا چاہیے جس نے اولاً ہر چیز کو بہ نظر غور دیکھا ہو اور بطور خود اس کی سمت پوری طور کی ہو دویم کتابوں کی سیر بہ نظر تعمق کرچکا ہو؛ سویم ہم عصر لوگوں کی تجربات کو جو کسی امر خاص کی بابت ہوں غور کیا ہو۔ تجربہ کاری کچھ اس بات سے متعلق نہیں ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہوگئی ہو اور وہ ان فضائل سے بے بہرہ ہو۔ اگر جوان آدمی میں ایسے خصائل حاصل ہوں تو وہ بھی تجربہ کار کے شمار میں آسکتا ہے۔ جو شخص بلا واقفکاری بلا صلاح و مشورت کے کوئی کام کریگا وہ ہمیشہ غلطی میں پڑےگا۔

۱۷ نومبر سنہ ۱۸۹۲ء

میں نے بوقت پانچ بجے خواب دیکھا کہ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوں جو مشابہ مکان زنانہ منشی سید فضل حسین تعلقہ دار کی ہے اور غرب رویہ سہ درے کے جنوبی در میں بیٹھا ہوں۔ ایک عورت نوجوان حسین و جمیل سے میرا عقد ہوا ہے جو سرخ رنگ کی عمدہ پوشاک پہنے ہوئے اور عطر وغیرہ لگائے ہوئے مجھ سے تعشق پیدا کرنے کی غرض سے شمالی رویہ سہ درے سے نکل کر صحن تک آتی ہے اور پھر سہ درے میں چلی جاتی ہے۔ اس کے عطربیز بال سرد پوشاک سے میرے دماغ کو تازگی اور خوشبو پہنچتی ہے۔ میں جانتا ہوں اس سے بوقت شب وصل نصیب ہوگا۔ اس وقت گویا شام ہو رہی ہے لیکن مجھے اس قدر افسوس ضرور ہے کہ وہ صاحب عقل و فہم نہیں ہے۔ اسی وقت میری آنکھ کھلی اور میں نے اٹھکر بعد وضو نماز صبح ادا کی۔

۱۲ مارچ سنہ ۱۸۹۳ء

میرے خاندان کا یہ موروثی خاصہ ہے کہ ابتداءً تعلیم و تعلم کا ضرور شغل رہتا ہے بعدہ چاہے وہ جیسا معزز عہدہ حاصل کرے چنانچہ میں اپنے چشم دید تین پشت کا ذکر کرتا ہوں کہ۔۔۔۔

۲۱ مارچ سنہ ۱۸۹۳ء

مجھے گولڈاسمتھ مشہور ادیب کا قول نہایت پسندیدہ معلوم ہوتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ وہ ضرور عام پسند

ہوگا ۔ [خوش‌اطوار لوگوں کو بھی بعض وقت افکار و آلام لاحق ہوتے ہیں مگر یہ صرف اس لیے کہ وہ اپنے اللہ کی نعمتوں کے لیے زیادہ تر اس کے مشکور ہوں یعنی نعمت کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب‌کہ کچھ تکلیف برداشت کرنے کے بعد اس کو حاصل ہو ۔] یہ نہایت سچا قول قابل عمل ہے ۔

۱۵ اپریل سنہ ۱۸۹۳ء جس شخص کو اپنے دانت مدت تک قائم رکھنا منظور ہو اسے لازم ہے کہ پان‌خوری کا استعمال کم اور خلال کی عادت نہ کرے ورنہ میرا تجربہ ہے کہ چونہ مسوڑوں کو کاٹ دیتا ہے اور خلال کرتے کرتے دانتوں کے درمیان فرق پیدا ہو جاتا ہے جس سے چند روز میں انھیں جنبش ہونے لگتی ہے اور بالاخر گر جاتے ہیں اور انسان روٹی و دیگر لذائذ دنیوی سے محروم ہو جاتا ہے ۔

۱۶ جون سنہ ۱۸۹۳ء جب میں کم‌سن تھا (مجھے خوب یاد ہے سنہ ۱۸۵۶ء سے) قسم کھانا جیسا اس کا آج کل ضرورت و بلاضرورت عام رواج ہے مطلقاً ترک کر دیا تھا اور کبھی سہواً اس کا اتفاق نہیں ہوتا ہے اور میں بہت برا جانتا ہوں کہ لوگ معمولی بات چیت میں بلاضرورت اس کے عادی ہیں جس سے ان کی بے‌اعتباری متصور ہے اور جب مجھے کبھی کسی عدالت میں اتفاق رائے شہادت کا ہوتا ہے تو وہاں بھی حتی‌الامکان انھیں الفاظ کا استعمال کرتا ہوں [کہ اپنے علم و یقین سے سچ کہوں‌گا جھوٹ نہ کہوں‌گا] لیکن قسم کا کھانا اللہ اور رسول کی بالکل میں نے چھوڑ دیا ہے ۔ خدا سے امید ہے کہ وہ ان باقی ایام زندگی میں بھی وہی عادت قائم رکھے‌گا ۔

۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۹۳ء انسان کو لازم ہے کہ ہمیشہ اپنے سے بڑے رتبہ والوں سے ملتا رہے تو اس کی ذات کو فائدہ اور موجب اس کے وقار کا ہوگا ۔ ورنہ دوسری حالت میں باعث ضرر ۔

۲۱ مئی سنہ ۱۸۹۴ء کس نیاموخت علم تیر از من — کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد
یہ قول حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا بہت صحیح و

درست ہے اور جہاں تک میں نے تجربہ کیا یہ مثل میرے حق میں بہت صادق آتی ہے۔ میں اپنے تجربہ سے لکھتا ہوں کہ جس شخص کے ساتھ میں نے سلوکات کیے اور اس کی بہبودی کا باعث ہوا بالآخر اس سے ضرور میری ذات و مال کو ضرر پہنچا جس کی چند مثالیں میں ذیل میں حوالہ قلم کرتا ہوں:—

۱۳ مئی سنہ ۱۸۹۳ع | آج مرزا یعقوب حسن صاحب تحصیلدار کے مکان پر منشی سدیوشن براؤن صاحب حاکم بندوبست تحصیل سندیلہ سے ملاقات ہوئی تحصیلدار صاحب نے میرا ڈپٹی صاحب سے تعارف کرایا کہ یہ صاحب رئیس سندیلہ نہایت لائق اور وقت کے فلاسفر ہیں۔ کوئی وقت ان کا فضول و رایگاں صرف نہیں ہوتا۔ سرکاری کاموں کی طرف بہت دلچسپی ہے۔ آنریری مجسٹریٹی کا کام مثل تنخواہدار مجسٹریٹ کے بہت مستعدی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

یکم جون سنہ ۱۸۹۳ع | انسان کو لازم ہے کہ ہمیشہ محنت کی عادت رکھے۔ یہ ایک ایسی نعمت ہے جس سے عزت و حرمت حاصل ہوتی ہے اور ہر ایک کی نگاہ میں باوقعت دیکھا جاتا ہے۔ کل کام چاہے جیسے مشکل ہوں بآسانی درست ہوجاتے ہیں اور ہمیشہ وہ اطمینان کے ساتھ بسر کرتا ہے اور اپنے وقت فرصت کو نہایت عزیز رکھتا ہے اور اس کی قدر کرتا ہے اور کاہلی اس کے برعکس ہے جو صاف تر علامت ادبار ہے اور اس کے کل کام ناقص و خراب ہوتے ہیں اور عزت حاصلہ گھٹ جاتی ہے اور کاہل کو بباعث کاہلی ہر وقت فرصت رہتی ہے اس وجہ سے وہ کسی کے وقت کی قدر نہیں کرتا۔ خوب غور کرنا چاہیے کہ ایسا شخص بہت کم ترقی کرے گا اور ہمیشہ نگاہ ذلت سے دیکھا جائے گا۔ اگر شخص کاہل امیر ہے تو چند روز میں وہ مفلس ہوجائے گا اور اگر مفلس ہے تو گداگری کرے گا۔

۹ ستمبر سنہ ۱۸۹۴ع | دنیا میں تین قسم کے دشمن ہوتے ہیں: اول وہ لوگ جو زبان کی بدولت ہوجاتے ہیں مثلاً زید اپنے مکان پر بیٹھ کر

بلاوجہ بکر کی غیبت کرے تو بکر ضرور زید کا دشمن ہوجائیگا۔ دوہم، معاملات و مقدمات کی دشمنی جو زن و زر و جائداد سے متعلق ہے۔ تیسرے، حاسد جو کسی کی ترقی دیکھ نہیں سکتا۔ قسم اول کے دشمن تو زبان روکنے سے گھٹ سکتے ہیں جس کا انسداد ضروری و لابدی ہے۔ دوسری قسم کے اس وقت دشمنی چھوڑدیں گے جب ان سے معاملہ سہولت و ملائمت کرلیا جاویگا۔ تیسری قسم کے براہ حسد جان و مال کے دشمن ہیں، ان کی دشمنی کبھی مٹ نہیں سکتی۔ ہاں سلوکات مناسب وقت سے شاید کچھ خفت ہوجائے اور علانیہ دشمنی نہ کریں۔ ان میں اول اہل خاندان علی الخصوص کم مایہ بھائی‌بند، دوسرے اہل محلہ، تیسرے بستی کے لوگ ہیں۔ یہ مرض لادوا ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا بجز اس کے کہ اپنے قادر مطلق سے یہ دعا مانگتا رہے۔ اللّٰہم اجعلنا محسوداً و لا تجعلنا حاسداً۔

۲۲ ستمبر سنہ ۱۸۹۴ء

......میں خود ہی اپنی ذات سے تمام اوقات مصروف رہتا ہوں حتیٰ کہ سوائے رات کے نصف تک چارپائی پر نہیں لیٹتا اور زیادتی محنت سے بےوقت شب دماغ تپکنے لگتا ہے لیکن باوصف ان سب باتوں کے میں تکملہ کام کا اپنے آرام پر مقدم تصور کرتا ہوں۔ خدا میری اولاد کو بھی یہی ہدایت کرے۔

۲۹ اپریل سنہ ۱۸۹۵ء

تجربہ کی باتیں:- چنار کے پتے جلانے سے دیمک دور ہوجاتی ہے۔ ہلدی یا ہینگ پانی میں گھس کر چیونٹیوں کے بل میں ڈال دو، فوراً بھاگ جاویں گی۔ گندھک و لہسن کی دھونی سے بھڑ بھاگ جاتی ہے۔ جس کو زنبور کاٹے بفور کاٹنے کے تین کف دست دھنیا کھلادو یا سرکہ سے برف میں تر کرکے کپڑا جائے گزیدہ پر لگادو فوراً تخفیف ہوگی۔

۱۹ مئی سنہ ۱۸۹۵ء

شب گزشتہ میں نے خواب دیکھا کہ ایک مشہور دولت‌مند آدمی کے محل‌سرا میں بیٹھا ہوں اور اس مکان کے محاذ میں ایک کمرہ ہے جس میں ایک معشوقہ حسین بیٹھی ہے جو نگاہ شوق سے میری جانب دیکھ رہی ہے۔ ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۹۴ء اسی قسم کی خوابیں بلاکسی

خیال کیے میں دیکھ رہا ہوں اور کوئی مہینہ ناغہ نہیں جاتا ہے کہ دو ایک مرتبہ نہ دیکھتا ہوں دیکھا چاہیے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے۔

۹ جولائی سنہ ۱۸۹۵ء

آبنوں کی فصل۔ اگر تم چاہو کہ تمہارے آنب کے درخت ہر سال بارآور ہوں تو ہر سال بور آنے کے پہلے کمزور شاخوں کی پنگیاں توڑ کر پھینک دو کہ بجائے بور آنے کے ان میں نئے نئے کلّے نکلیں۔ یہی شاخیں دوسرے برس پھولتی اور پھل لاتی ہیں۔

۲۷ جولائی سنہ ۱۸۹۵ء

دنیا میں وقت ایک نہایت عمدہ نعمت ہے۔ جو شخص اس کی قدر کرتا ہے وہ نعمت حاصل کرتا ہے اور جو نہیں کرتا وہ ہمیشہ خرابی میں مبتلا رہتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے ساتھیوں سے اس کی زیادہ قدر کی حتّٰی کہ موسم گرما میں دن کو بہت کم سویا اور وہ بھی وقت ہمیشہ کسی شغل میں صرف کیا جس کا یہ خوش نتیجہ پیدا ہوا کہ میرے کل امور متعلقہ نہایت آسانی سے طے ہوگئے جس کا بہت نیک پھل مجھے ملا اور یہی سبب ہے کہ میں ہر ایک کام غیر معلوم سے بہت جلد واقف ہوگیا اور عوام میں میری قابلیت مشہور ہوئی۔ لہذا وقت ضرور قابل قدر ہے۔

۱۴ اگست سنہ ۱۸۹۵ء

ایک ڈاکٹر حاذق نے بر وقت وفات نسبت حفظ صحت تین نصیحتیں پیش کیں جن کی پابندی سے انسان تندرست رہ سکتا ہے اور زیادہ عمر تک زندہ۔ (۱) صفائی طبیعت (۲) ورزش (۳) کم کھانا لیکن میرے خیال میں اس کے ساتھ نیک چلنی کی بھی ضرورت ہے ورنہ یہ سب ہیچ۔ میرے نزدیک نیک چلنی اول درجے کی علامت صحت ہے اور وہ تینوں باتیں اس کی فروعات میں داخل ہیں۔

۹ ستمبر سنہ ۱۸۹۵ء

آج کل ۵۹ انسان اور ۳ حیوان جملہ ۶۲ جانوں کی (علاوہ دیگر مصارف ضروریہ) پرورش و پرداخت میری ذات سے متعلق ہے اور بجز آمدنی مسلم موضع کھوکبرہ و چند ریزہ ملکیت کے اور کوئی دوسرا سلسلہ آمدنی کا نہیں ہے......پس یہ تردد میری روح کو ہر وقت صدمہ

پہنچا رہا ہے اور بعض وقت اس کی پریشانی مجھے از خود رفتہ کردیتی ہے لیکن پھر اس کی شان رزاقی پر بھروسہ کرکے اپنی طبیعت غیرمطمئن کو اس ہندی مثل سے: "جب دانت نہ تھے تب دودھ دیو جب دانت بھئے کا ان نہ دھے؟" تسکین دیتا ہوں۔

۳ اکتوبر سنہ ۱۸۹۵ع میں اپنے تجربہ سے لکھتا ہوں کہ جب خدا کسی شخص پر بلائے ادبار نازل کرتا ہے تو پہلے اس کی شے لطیف عقل کو زایل کردیتا ہے کہ وہ راست کو کج اور کج کو راست، حسن کو قبح اور قبح کو حسن علی ہذا کل باتوں کو الٹی سمجھنے لگتا ہے اور اس کی ذاتی صفائی اور خانہ‌داری وغیرہ کے امور میں اسی نہج کے فتورات اور دوستوں کی قلت دشمنوں کی کثرت ہونی جاتی ہے پس ایک بارگی وہ کشتی بحر فنا میں ایسی غرق ہوتی ہے کہ پھر اس کا ابھار نہیں ہوسکتا جیسا کہ واجدعلی شاہ بادشاہ اودھ گزر چکا ہے اور جیسا سندیلہ میں......

۴ نومبر سنہ ۱۸۹۵ع جس کے سر میں درد ہو اس کو پچھلے پیروں آہستہ آہستہ چلنا چاہیے، ۱۰ منٹ میں درد سر رفع ہو جائیگا۔

۶ نومبر سنہ ۱۸۹۵ع میں نہایت راستی سے لکھتا ہوں کہ میں نے جس کام کو شروع کیا اس کے تکملے میں نہایت کوشش کے ساتھ مصروف ہؤا اور اپنے خدا سے اس کے اتمام کی نسبت دعا کرتا رہا۔ بالآخر وہ کام ضرور خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام ہوا۔ ملک ہسپانیہ میں ایک مثل ہے خدا سے مانگو اور ھتوڑے کو بھی لوہے پر مارتے رہو ورنہ صرف دعا مانگنے سے لوہا کبھی نرم نہیں ہوسکتا۔

۸ فروری سنہ ۱۸۹۶ع انسان کو لازم ہے کہ وہ انحطاط عمر و قویٰ میں اپنی طبیعت کو کھانے و پینے و سونے جاگنے و رفع ضروریات میں بہت سنبھل کر بحالت اعتدال رکھے اور بہ پابندی اوقات ہر ایک کام انجام دیتا رہے ورنہ اس کی تندرستی کبھی قائم نہیں رہ سکتی اور بقیہ ایام زندگانی بلطف بسر نہیں لے جاسکتا۔

۳ مئی سنہ ۱۸۹۶ء ۴۲ سال کا زمانہ ہوا جب سے میں نے نماز کی پابندی کی۔ اسی وقت سے درود شریف ہر نماز کے بعد ایک صد بار و سبحان اللہ بحمدہ ۳۵ بار و سورۂ مزمل ایک بار برابر پڑھتا رہا ہوں........اور چھبیس سال سے ، مصور العجائب بالخیر بعد نماز عشا کے ۳۶۰ بار ورد میں ہے جس کے اول و آخر سات سات مرتبہ درود شریف پڑھتا ہوں اور ۳۰ سال گزشتہ سے چہل کاف بعد نماز صبح و مغرب ایک بار پڑھا کرتا ہوں۔ ان اوراد کی برکت ورد سے مجھے بہت بڑا نفع دنیاوی حاصل ہوا اور ہو رہا ہے۔

۲۳ اگست سنہ ۱۸۹۶ء ....اور آج صبح کو بوقت رخصت مجھ سے کہا کہ جو حاجت ہو بیان کرو کہ میں اس کے پورا ہونے میں کوشش کروں۔ بجواب اس کے میں نے کہا کہ دعائے خیر۔ کہا کچھ اور مانگو۔ میں نے کہا کہ جو کچھ مجھے مانگنا ہوتا ہے وہ میں اپنے رب العالمین سے مانگا کرتا ہوں اور میں اسی کی ذات پر پورا بھروسا رکھتا ہوں اور شاکر ہوں۔ شاہ صاحب میری اس گفتگو سے بہت متعجب ہوئے۔

۹ ستمبر سنہ ۱۸۹۶ء مرد لوگ اسرار محبت کے سمجھنے میں بہت کند ذہن ہیں اور اس بات میں حد سے زیادہ غلطیاں کرتے ہیں اور اسی باعث جنس ذکور کے اشخاص ہمیشہ یہ پوچھتے رہتے ہیں کہ مردوں کو کیونکر معلوم ہو کہ ایک عورت ان سے محبت کرتی ہے یا جس عورت کی محبت اس کو پیدا ہوئی ہے وہ اس کے بارے میں کیا خیال رکھتی ہے۔ واقعی یہ امر کچھ آسان نہیں ہے دو باتوں سے یہ امر اور بھی دشوار ہوجاتا ہے۔ اول تو سچی محبت میں ایک عجیب غریب بات یہ پائی جاتی ہے کہ جس مرد کو کسی عورت سے سچی محبت ہوجاتی ہے۔ تو وہ محبت اس کے مزاج کو منکسر بنادیتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ دوسری باتوں کے اعتبار سے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہو اور دوسرے اشخاص کی نسبت جو باتیں دیکھتا اور سنتا ہو ان کو بطور قاعدہ کلیہ نیچی نگاہ سے دیکھتا ہو لیکن جہاں اس کے دل میں کسی عورت کی محبت خالص پیدا ہوئی پھر وہ اپنے اوصاف

کو ہیچ سمجھنے لگتا ہے اور اس بات کے امتیاز کی صلاحیت اس میں باقی نہیں رہ جاتی کہ آیا وہ عورت بھی اس کی محبت کا خیال رکھتی ہے یا نہیں رکھتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کو سابقہ کسی ایسے جنس اناث کے آدمی سے پڑتا ہے جس کا خیال سب کے بیشتر یہ ہوتا ہے کہ محبت کے خیال کو جہاں تک ممکن ہو چھپائے رہے۔ جتنا ہی زیادہ کوئی عورت کسی مرد سے محبت کرتی ہوگی اس قدر وہ اس بات کو ثابت کرتی رہے گی کہ اس کو کچھ بھی محبت نہیں ہے اور اس بات کو صرف وہی مرد جو بہ‌نسبت اپنے دیگر ہم‌جنسوں کے زیادہ چالاک و ہوشیار ہوتے ہیں دریافت کرسکتے ہیں کہ اکثر وہ تمام نفرت کی علامتیں جن کو کوئی عورت کسی مرد کی نسبت ظاہر کرتی ہے عین محبت کی علامتیں ہوتی ہیں۔

۱۲ نومبر سنہ ۱۸۹۶ء | علی‌الصباح بوقت نماز میں نے خواب دیکھا کہ ایک دولت‌مند کی محل‌سرا میں داخل ہوا اور مالکہ مکان نے (جو اب زندہ نہیں) میرے داخلے محل‌سرا کو بنظر مسرت و عزت دیکھا اور ایک معشوقہ دل‌نواز کو جو مجھ سے پردہ کرتی ہے اجازت دی کہ بالاخانہ پر چلی جائے جس کی اوٹ اس نے خود کی لیکن بوجہ غیرکافی ہونے پردہ کے اس کا نصف جسم اسفل صاف نظر آتا تھا جو اطلس کا کلی‌دار پائجامہ جس کی ہر کلی میں گوٹہ و پائنچوں میں لچکہ ٹکا تھا پہنے تھی اور اس کے کڑوں اور چھڑوں نقرئی کی آواز میرے کانوں تک آتی تھی۔ بعدہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں حیرت میں ہوں کہ یہ کس قسم کی خوابیں ہیں جن کو میں چار سال سے برابر دیکھ رہا ہوں اور جس کا قبل از خواب کوئی وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا کیا ظہور ہوتا ہے۔

۹ جون سنہ ۱۸۹۷ء | آج مجھے دریافت سے معلوم ہوا کہ میرے یہاں ۱۱ لڑکیاں واسطے پرورش و خدمت کے اس قحط سالی میں حاصل کی گئیں........

۱۱ نومبر سنہ ۱۸۹۸ء | اگرچہ قبل اس کے میں چند مرتبہ لکھ چکا ہوں لیکن اب بھی اس کا حوالۂ قلم کرنا غیرمناسب نہیں جانتا کہ

علی الصبح مٹی ترنا انسان کی تندرستی کے واسطے بہت مفید ہے چنانچہ میں چند سال سے اس کا عادی ہو رہا ہوں۔

۲۳ دسمبر سنہ ۱۸۹۹ع | ۲۱ دسمبر سے سات ستارے برج دو جھکہ میں فراہم ہوگئے ہیں جو ۲۵ دسمبر تک اسی برج میں رہیں گے۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ نجومیوں کا مقولہ ہے کہ جب سابق اسی طور پر سات ستارے ایک برج میں جمع ہوئے تھے تو کوروکشیتر کے میدان میں کورو پانڈوں کے درمیان سخت لڑائی ہوئی تھی جس میں لاکھوں آدمیوں کا قتل عام ہوا تھا۔ جو ستارے اس برج جدی میں موجود ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں: آفتاب، مشتری، زحل، مریخ، عطارد، زہرہ، قمر۔ منجملہ ان کے تین ستارے تحت الشعاع آفتاب میں غرق ہیں یعنی ان کی قوت بالکل زائل ہوگئی۔ وہ یہ ہیں مشتری، مریخ، زحل۔

۱۳ مئی سنہ ۱۹۰۲ع | "موسم اچھا ہے تاجپوشی کا زمانہ قریب آگیا۔ مہمانوں کی آمد آمد ہو رہی ہے۔ ان کے ٹھہرنے کے لیے مکانات منتخب ہوچلے ہیں۔ یہ جلسہ دیدار دید ہوگا دیکھیے چاہیے کہ دیکھنے میں آتا ہے یا نہیں۔ ایک شخص معمولی مقدور سے اگر دیکھنا چاہے تو ایک گنی کم از کم پڑے گی مجمع سے دیکھنا نہایت مشکل اور سخت مشکل سے خالی نہیں۔ علی الصباح اگر جائے اور دن بھر بھوکا پیاسا کھڑا رہے تو شاید دیکھنے کو مل سکے"۔ از خط مصطفیٰ علی لندن

۲۲ جون سنہ ۱۹۰۲ع | "یہاں ایک بیرسٹر کی آمدنی فی گھنٹہ چھے سو روپیہ ہے۔ اس قدر روپیہ خدا جانے کس کام میں رکھتے ہوں گے۔ چاروں طرف تخت نشینی کی دھوم دھام ہے۔ لوگ سودائی ہورہے ہیں۔ ایسے تماشائی شاید کہیں ہوں"۔ از خط مصطفیٰ علی لندن

۲ جنوری سنہ ۱۹۰۳ع | کل کے دربار جشن تاجپوشی ہردوئی میں میری کرسی صف اول میں تھی اور آنریری مجسٹریٹوں کے سلسلے میں پہلی تھی اور میری کرسی کے پیچھے وکلا اور اہل کاروں وغیرہ کی کرسی تھی

جس کا ہر آئینہ مجھے فخر ہے کہ ایسا اعزاز اپنے ہم رتبہ اور ہم‌چشموں میں مجھے حاصل ہوا۔

۱۹ جنوری سنہ ۱۹۰۳ء

"سید علی بلگرامی کو انڈیا آفس میں ایک جگہ مل گئی ہے۔ مترجم کاغذات عربی و فارسی ہیں اور تین سو پونڈ تنخواہ سالانہ ہے"۔ از خط مصطفیٰ علی لندن۔

۲۳ اپریل سنہ ۱۹۰۲ء

میں اس مقام پر پھر حوالہ قلم کرتا ہوں کہ مشی واسطے قیام تندرستی کے نہایت عمدہ علاج ہے خصوصاً صبح شام کی مشی۔ نوجوانوں اور بڈھوں اور ہر عمر کے آدمیوں کو لازم ہے کہ اس کی مزاولت کریں اگر چاہتے ہیں کہ ان کی تندرستی قائم رہے۔ ہزاروں دواؤں سے یہ نسخہ عمدہ اور حکم اکسیر کا رکھتا ہے۔

۱۸ فروری سنہ ۱۹۰۰ء

"رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں کانپور کے کیچڑ کی بہت ہجو کی ہے اور سید اسمٰعیل حسین منیر نے اپنی کلیات میں الٰہ‌آباد کے کیچڑ کی۔ میرے خیال میں لندن کا کیچڑ بھی کچھ ان جگہوں سے کم نہیں۔ یہاں سے ایک میل پر ایک مقام ہے جس کا نام ڈلچ ہے۔ پختہ سڑک کا نشان تک نہیں تمام کچی سڑکیں ہیں۔ کیچڑ اس غضب کا ہوتا ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھا جائے تب بھی ٹخنے دھنس جاتے ہیں مگر ہندستان میں کسی انگریز کے منہ سے اس کی برائی نہ سنیے گا۔ ساری برائیاں و خرابیاں گویا ہندستان ہی میں ہیں"۔ از خط مصطفےٰ علی۔ لندن

۱۹ مارچ سنہ ۱۹۰۰ء

"جو میمیں بخدا ہمارے پیشاب کا برتن صاف کرتی ہیں وہی ہندستان میں پہنچ کر ہم کو کتّے سے بدتر سمجھنے لگتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ کیا انقلاب ہے۔ سوائے ہندستانیوں کی خوبی قسمت کے اور کیا کہا جائے۔ ہندستان آ کر یہ برتاؤ کیونکر برداشت ہوگا"۔ از خط مصطفےٰ علی۔ لندن

۲۶ مارچ سنہ ۱۹۰۰ء

"یہاں سال میں صرف دو موسم ہوتے ہیں' گرمی و جاڑا۔ رہی برسات وہ جاڑے کے ساتھ ہے۔ پانی برسنے کی کوئی تعداد و شمار نہیں۔ دن کو دس مرتبہ برسا اور رات کو بیس مرتبہ۔ جنوبی سمندر سے بادل اٹھے' برس پڑے۔ شمالی سمندر سے بخارات دو چار ہاتھ اونچے ہو کر پھٹ پڑے۔ مشرقی جنگل نے کچھ نمکی بھیج دی کبھی مغربی بحر ذخار نے بدلیوں کے مشکیزوں سے چھڑکاؤ کر دیا۔ دن یہیں ہوا کرتا ہے۔" از خط مصطفےٰ علی۔ لندن

۳ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء

لندن عجیب مقام ہے یہاں بندر بندریا کا بھی ناچ ہوتا ہے۔ یہ بڑا نقص ہے کہ عورتیں مردوں سے اسی بے تکلفانہ طور سے ملتی ہیں جیسے مرد سے مرد۔ لڑکے و لڑکیاں حد سے زیادہ آزاد ہیں۔ دن کو کوئی مرد گھر میں نہیں رہتا۔ چاہے کام پر جائے چاہے سیر تماشے کو۔ از خط مصطفےٰ علی۔ لندن

"کل اور پرسوں لڑائی کا سوانگ مثل چاچر کے بنایا گیا تھا۔ میں بھی دیکھنے گیا تھا اور اس قدر مجمع تھا کہ بیان سے باہر۔ یہاں بھی وہی بے تکاپن معلوم ہوتا ہے جیسا ہندستان میں ہے۔ اگر فرق ہے تو اسی قدر کہ یہاں کسی قدر صاف ستھرا ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ لکھنؤ سے زاید سیر و تماشے کے شایق ہیں۔ ذرا سی بات میں خلقت ٹوٹ پڑتی ہے" از خط مرتضےٰ علی۔ لندن

۸ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء

"جتنی آفات سماوی ہیں وہ لندن کے لیے بنی ہیں۔ کبھی کہرا پڑ رہا ہے' کبھی برف گر رہا ہے' کبھی پانی برس رہا ہے۔ اگر ان میں کچھ نہیں ہے تو ابر غلیظ ہی محیط آسماں ہے۔ کھانوں میں یہاں گائے کی زبان اور بیل کی دم بڑی نعمت خیال کی جاتی ہے"۔ از خط مرتضےٰ علی۔ لندن

(باقی آئندہ)

نواب صمصام الدولہ میر عبدالرزاق، شہنواز خاں (وزیر مملکت دکن)

از

(مولوی محمد حسین صاحب محوی، صدیقی اردو لیکچرار مدراس یونیورسٹی)

گزشتہ حکومت مغلیہ کا آخری دور اگرچہ بہت انتشار کا دور تھا پھر بھی اس میں بہت سے ایسے اہل کمال پیدا ہوئے جو اپنے کمالات اور کارناموں کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے۔ انھیں میں نواب صمصام‌الدولہ میر عبدالرزاق شہنواز خاں بھی ہیں جو اپنے علمی ذوق خاص کر تاریخ دانی اور سخن فہمی میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے، جنھوں نے وزارت جیسی سرکاری اہم ذمہ داریوں اور بےانتہا مصروفیتوں کے باوجود ذوق علمی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ زمانے کی ناموافقت اور آئے دن کے خوفناک ہنگاموں کے باوجود علمی خدمت کرتے ہی رہے۔

صمصام‌الدولہ نے فن سیر میں بڑی واقفیت و مہارت بہم پہنچائی تھی، خاص کر ہندستان کے سلاطین تیموری اور ان کے عہد کے امرا کے حالات گویا ازبر نوک زباں پر تھے۔ نسب دانی میں انھیں کچھ ایسی مہارت خداداد حاصل تھی کہ اس عہد کے اکثر لوگ اپنے بزرگوں کے نام اور حالات ان سے پوچھتے اور تحقیق کرتے تھے[1]۔

ان کو تاریخ سے غیرمعمولی دلچسپی تھی۔ خود اپنی نسبت لکھتے ہیں:

---

[1] صفحہ ۲ دیباچہ مآثرالامرا جلد اول از میر عبدالحی فرزند صمصام‌الدولہ۔

"سن رشد و تمیز کے آغاز ہی سے علوم درسیہ متداولہ میں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا تھا پھر بھی میں سیر و تاریخ کی تلاش اور مطالعہ کا بہت شوق رکھتا تھا، جب کبھی فرصت ہاتھ آجاتی حسب امکان اگلے سلاطین کے حالات پڑھ کر عبرت حاصل کیا کرتا اور بلند مرتبہ مشاہیر امرا کے سوانح سے ضرور کچھ نہ کچھ سبق لیتا تھا۔ کبھی موزوں سخن شعرا کے واقعات سے روحانی لطف بہم پہنچاتا تھا یہاں تک کہ اپنی عمر کے تیسرے عشرے میں (یہاں سے زندگی کے دور میں نیا انقلاب ہوتا ہے) زمانے نے پیشۂ ملازمت کی کشاکش میں ڈال دیا اور وقت کا بیشتر حصہ معاش کے حصول میں صرف ہونے لگا۔ اس نے بےفکری اور خوش حالی کے بعد دوسرے ہی مشاغل میں ڈال دیا، اوراق کے چھونے کا بھی موقع نہ رہا اور کتاب کی دوستی و آشنائی ختم ہوگئی۔ پھر بھی کبھی کبھی اپنے جمع کیے ہوئے ذخیرے کو صاف لکھ لینے کا خیال دل میں گزرتا اور کھٹکتا رہتا تھا[1]"۔

بہرحال جتنا بھی وقت ملا اور حالات نے جس قدر بھی ساتھ دیا صمصام الدولہ نے اپنا گرانبہا حصۂ عمر تالیف و تصنیف اور مطالعۂ کتب یا اسی قسم کے اور عمدہ کاموں میں گزارا اور اپنی دو تین علمی یادگاریں ایسی چھوڑ گئے جو آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان میں ایک تو "مآثرالامرا" ہے دوسری "بہارستان سخن" جس کو اب تک ناقدری زمانا کی بدولت طبع اور شائع ہونے کی عزت حاصل نہیں ہوئی۔ تیسری کتاب کا نام انھوں نے اپنی دوسری کتاب کے دیباچے میں "موائدالفوائد" بیان کیا ہے۔ پہلی تصنیف اپنے موضوع کے لحاظ سے معرکہ آرا اور نہایت درجہ قابل قدر ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی جانب سے عرصہ ہوا کہ تین موٹی موٹی جلدوں میں چھپ کر معدوم ہونے سے محفوظ ہوگئی ہے اگرچہ آج کل بھی کمیاب بلکہ عام طور پر نایاب ہے۔

یہ کتاب ان کے فرزند میرعبدالحی خاں صمصام الملک نے ان کی وفات کے بعد مرتب کی ہے۔ اس کے شروع میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (رح) نے مصنف کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ مولانا آزاد دور آخر کے بڑے نامور عالم، مصنف اور شاعر گزرے

[1] دیباچۂ مصنف مآثرالامرا جلد ۱ صفحہ نمبر ۲۔

ہیں اور مصنف کے نہایت گہرے دوست تھے۔ انھوں نے تحریر حالات میں کسی شاعرانہ مبالغہ یا دوستانہ مدح سرائی سے کام نہیں لیا بلکہ صداقت کے ساتھ حق دوستی ادا کیا اور صحیح حالات پیش کردیے ہیں۔

صمصام الدولہ کے اجداد اور اصل وطن

ان کا اصل سلسلہ مقام خواف کے بلند مرتبہ سادات سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے جد اعلیٰ میر کمال الدین اکبر بادشاہ کے عہد مبارک میں خواف سے روانہ ہوکر ہندستان پہنچے اور سلطنت کے اعلیٰ درجہ کے ملازمین کی سلک میں شامل ہوئے۔ ان کے بیٹے "میرک حسین" جہانگیر بادشاہ (رح) نے زمانۂ حکومت میں سلطانی نوکری سے سرفراز ہوئے۔ پھر ان کے فرزند دلبلند میرک معین الدین نے شاہ جہاں بادشاہ (رح) کے دور سلطنت میں امانت خاں کا خطاب اور ایک اعلیٰ منصب پاکر سربلندی حاصل کی۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے دور فرماں روائی میں انھیں لاہور، ملتان، کابل اور کشمیر کی دیوانی کا مرتبۂ بلند ملا اور جس وقت شاہزادۂ شاہ عالم ملتان کی صوبہ داری کے اعلیٰ منصب پر نامزد ہوئے، امانت خاں موصوف ان ممالک کی مذکورہ دیوانی کے ساتھ نیابت صوبہ داری کے بلند منصب پر بھی فایز کیے گئے۔ یہ بزرگ اپنے خطاب کے موافق نہایت امانت و دیانت کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ان کی دیانت کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ دیوانی کے دنوں میں ایک بار بادشاہ سلامت کا فرمان ان کے نام شرف صدور لایا کہ "فلاں شخص کو بارگاہ شاہی میں بھیج دیا جائے"۔ امانت خاں نے اس آدمی کو بلاکر حکم شاہی سنایا، اس نے کہا: "اگر حضور میری آبرو کے ذمہ دار ہوں تو میں جاتا ہوں"۔

امانت خاں نے فوراً جواب دیا "بھلا میں اس شخص پر کیسے بھروسا کرسکتا ہوں جس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ ایسا ویسا کیا ہو (یعنی عالمگیر بادشاہ) اور تمھارا کفیل کیونکر ہوسکتا ہوں"۔

یہ خبر سرکاری مخبروں نے بادشاہ سلامت تک پہنچادی کہ "حضور کی نسبت امانت خاں کا یہ خیال ہے"۔ بادشاہ سلامت سخت برہم ہوگئے؛ انھیں جاگیر، منصب اور

دیوانی خالصہ سے معزول کردیا۔ امانت خاں کچھ دنوں بیکار رہے۔ پھر بادشاہ کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ شخص خدا سے ڈرنے اور میرا ذرا بھی ملاحظہ نہ کیا، کیا خوب آدمی ہے۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ پھر ان کو نوازا اور امانت خاں کی اس مبارک صفت حقداررسی نے ان کو بحال کرادیا۔ منصب، جاگیر اور خالصہ کی دیوانی کو پھر رونق اعتبار بخشی اور ان کی بلند شخصیت بڑی حد تک بادشاہ کے ذہن نشین ہوگئی۔ جن دنوں بادشاہ سلامت ہندستان میں تھے اور دکن کے صوبہ دار خان جہاں خان بہادر کوکلتاش تھے، دکن کی وزارت دیوانی، بخشی گیری اور وقائع نگاری کی اہم خدمتیں امانت خاں کو مرحمت ہوئیں۔ ان کا یہ مرتبہ تھا کہ خود صوبہ دار خان جہاں خاں ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ اس کے بعد اورنگ آباد کی نظامت بھی انھیں کے سپرد ہوگئی۔

ان کے بیٹوں میں سے چار نے بلند مراتب پائے :—

۱۔ میر عبدالقادر دیانت خاں۔

۲۔ میر حسین امانت خاں[1]۔

پہلے صاحبزادے دیوانی اور دوسرے دیوانی خالصہ کے بلند منصب پر سرفراز ہوئے۔ پھر امانت خاں بندر سورت کے حاکم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد یہ خدمت دیانت خاں کو سپرد ہوئی۔ یہ پہلے بھی دکن کی دیوانی پر مامور ہوچکے تھے۔ حکومت سورت کے بعد پھر دوبارہ اس عہدے پر سرفراز ہوئے۔ تیسرے فرزند میر عبدالرحمن وزارت خاں تھے، گرامی تخلص تھا، انھوں نے مالوہ اور بیجاپور کی دیوانی کے منصب پر سربلندی حاصل کی۔ شعر برجستہ کہتے تھے صاحب دیوان ہوئے ہیں

---

۱ امانت خاں مذکور کی اولاد بہت ہوئی اور اتنی کثرت سے بڑھی کہ اس قبیلے کا ایک بہت بڑا محلہ اورنگ آباد میں آباد ہوگیا۔ دکن کی دیوانی اور ان ممالک کی اکثر اعلیٰ خدمات کا سلسلہ اسی خاندان کے ارکان سے وابستہ رہا اور ایک دنیا نے اس عالی و بزرگ خاندان کے فیض سے بہت کچھ حاصل کیا۔

صمصام الدولہ کے دادا

چوتھے بیٹے محمد کاظم خاں صمصام الدولہ کے حقیقی دادا تھے۔ امانت خاں کی وفات کے بعد بادشاہ خلد مکاں عالمگیر نے ان کے پس ماندوں اور متوسلوں میں سے ہرایک کو ان کی حالت اور حیثیت کے موافق منصب اور عطائے خدمات میں ترقی دی۔ یہ بزرگ بھی اضافۂ منصب کے ساتھ پہلے صوبۂ بیجاپور کے عہدۂ "بیوتاتی" پر، اس کے بعد جالناپور صوبۂ اورنگ آباد کی فوجداری پر فائز اور عزت یاب ہوئے۔ ساتھ ہی کچھ اور پرگنے بھی جالناپور کے ساتھ ملادیے گئے تھے۔ پھر دارالسلطنت لاہور کی دیوانی پر سرفرازی پائی۔ اس زمانے میں ان کے خاندان کی ترقی و عروج کا بازار رونق پر تھا۔ محمد کاظم خاں مئے نوشی کے عادی تھے اور وزیرخاں شاہجہانی کے ایک نواسے دارالسلطنت کے سوانح نگار تھے۔ انھوں نے رپورٹ میں یہ حال لکھ مارا، ملاحظہ کے بعد بادشاہ سلامت نے ارشدخاں سے پوچھا جو اس وقت دیوان خالصہ تھے اور فرمایا کہ "امانت خاں کی اولاد میں اس قسم کی باتیں قیاس سے دور اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں لیکن سوانح نگار بھی ہمارا خانہ زاد ہے وہ کیوں جھوٹ لکھنے لگا"۔ پھر ذرا سوچ کر اپنی انتہائی شریعت نوازی اور سخت احتساب کے باوجود ان کے والد مرحوم کے حالات سے حسن ظن اور ان کی بہترین خدمات کے حقوق کا پاس کرکے داروغہ کو ارشاد ہوا کہ جواب میں لکھ دو "دونوں خانہ زاد ہو ایسا نہیں چاہیے کہ تم ایک خانہ زاد دوسرے خانہ زاد کے بارے میں ایسی ناپسندیدہ اور بری باتیں ہمارے حضور میں پہنچائے"۔

محمد معظم بہادر شاہ کے سب سے بڑے فرزند شاہزادہ محمد معزالدین ایک بار صوبۂ ملتان کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ وہاں جاتے ہوئے لاہور میں ٹھہرے۔ خان موصوف شرفیاب بارگاہ ہوئے تو شاہزادے صاحب نہایت مہربانی و لطف اور کمال اکرام و قدردانی سے پیش آئے۔ دو تین روز کے اندر کچھ اس قدر دونوں میں موافقت اور خصوصی روابط ہوگئے کہ شاہزادے نے بہت اصرار اور منت کے ساتھ ان کو اپنے ہمراہ چلنے پر مجبور کیا اور اس کے لیے بادشاہ سلامت کے پاس درخواست بھیجی۔ شاہی رویکاری سے ملتان و ٹھٹھہ اور اسی کے ساتھ بھکر اور سیوستان وغیرہ ملاکر

اس وسیع علاقے کی دیوانی، ساتھ ہی فوج کی دیوانی خان موصوف کو عطا ہوئی۔ چونکہ دونوں بادہ خوار تھے خوب گاڑھی چھنتی تھی، بزم خاص کے محرم اور مصاحب تھے، غیر معمولی مراسم بڑھ گئے تھے۔ مگر اس پر بھی کاظم خاں کو اپنی شان سیادت اور شرافت کا پاس رہا۔ اس زمانے کے بڑے بڑے امرا اور اعیان دولت اپنی مستورات کا شاہی محل میں آنا جانا امارت کے لیے فخر سمجھتے تھے لیکن میر کاظم خاں نے اسے پسند نہ کیا۔ شاہزادہ موصوف ایک بار خان موصوف کی حویلی کے باغ میں اپنی پرستاران حرم کے ساتھ بطور سیر تشریف لائے اور ایک رات دن وہیں رہے، ان تعلقات کے باوجود خان موصوف نے اپنی مستورات کے لیے اس رواج کو جائز نہ رکھا۔

بلوچ کی مہم کا سر کرنا شاہزادے کا ایک نمایاں کام تھا جس پر حضرت خلد مکاں فخر کرتے تھے۔ وہاں کی وحشیں بالکل پامال اور اس جماعت کی جمعیت کا شیرازہ پاش پاش ہوجانے کے بعد شہزادے نے چاہا کہ اپنے کسی قابل اعتماد مقرب کی سرکردگی میں بلوچ کی نگرانی کے لیے اپنی فوج مقرر کردیں تاکہ پھر یہ لوگ سر نہ اٹھائیں۔ کئی افسروں سے شاہزادے نے فرمایا لیکن اکثر نے اس خدمت سے انکار کیا مگر خان موصوف اپنے ولی نعمت کے ارشاد پر فوراً تیار اور اسی وقت روانہ ہوگئے۔ بلوچ کی نیک اعتقاد جماعت محض ان کی سیادت کے ادب سے اپنا اسباب و سامان سب جہاں کا تہاں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور باوجود قوت و جرأت کے مقابلہ نہ کیا۔

شاہزادے نے بادشاہ کو تمام حال لکھ بھیجا، وہاں سے منصب کی ترقی اور خانی کے خطاب کا مزید اضافہ پاکر ناموری حاصل کی۔ عالمگیر کی وفات کے بعد بادشاہ کے دونوں بیٹوں میں بادشاہی کے لیے جھگڑا ہوا۔ محمد معظم پشاور سے اپنے بھائی سے نبرد آزمائی کے لیے بڑھے چلے آرہے تھے، ملتان سے ان کے بیٹے شاہزادہ معزالدین بھی اپنے باپ کے ہمراہ ہوگئے اور اپنی جگہ نیابت صوبےداری پر خان موصوف کو چھوڑا۔ جس زمانے میں بادشاہ خلدمنزل دکن میں تھے خان کاظم

معزول ہوکر لاہور چلے آئے تھے۔ دکن بےحد دور ہونے کی وجہ سے سفر نہیں کرسکتے تھے۔ کم و بیش دو تین سال بےکاری کے عالم میں یہیں گزارے۔ آمدنی کچھ نہ تھی اور خرچ بہت زیادہ تھا جو امارت کا لازمہ اور دولت‌مندوں کا وطیرہ ہے۔ آدمی نہایت دیانت‌دار اور امانت والے تھے، ناجائز آمدنی کچھ نہ تھی۔ تمام جاگیر و جائیداد کی آمدنی ارباب نشاط پر خرچ ہوتی تھی۔ ہر صنف کے ارباب نشاط باقاعدہ ملازم اور تنخواہ‌یاب تھے۔ جاگیر کی آمدنی کے علاوہ بیٹوں کی نقد آمدنی بھی سب صرف کرڈالتے تھے۔

مقام ساڈھورا میں جو سرھند کے مضافات میں ہے، بادشاہ اور شہزادے کے حضور میں باریاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ بادشاہ نے صوبہ پنجاب کی جاگیروں کی نگرانی اور دوسرے شاہزادے کی بخشی‌گیری کے عہدے پر تقرر فرمایا۔ ان شہزادے کا لقب جہاندارشاہ تھا۔ جب یہ بادشاہ ہوئے تو خان موصوف چارہزاری منصب پر فائز ہوئے لیکن اپنے فطری استغنا، بےپروا مزاجی اور زمانہ‌سازوں کے رنگ ڈھنگ، طور طریق سے بےلگاؤ ہونے اور نئے نئے امرا کے برسر اقتدار آجانے کی وجہ سے جو ان کے شناسا نہ تھے، خاص کر کوکلتاش خان کی کینہ‌وری کی وجہ سے جو ہمیشہ دوستی کے پردے میں ان کا کام بگاڑنے میں رہا کرتا تھا، ان کی بہبودی اور ترقی کی کوئی صورت نہ پیدا ہوئی جیسی یہ چاہتے تھے، بلکہ ناقدردانی زمانہ اور اپنی افسردہ دلی کے سبب دربار کا آنا جانا اور سلام و مجرا کا سلسلہ تک ختم ہوگیا۔ ایک روز بادشاہ کی سواری جارہی تھی، اتفاق سے آمنا سامنا ہوگیا۔ اگلے الطاف اور مہربانیوں کی بنا پر دریافت حال ہوئی۔ بیکاری اور پریشان حالی کا ذکر سن‌کر بادشاہ سلامت نے افسوس کیا اور کوکلتاش خان پر سرزنش ہوئی۔ پھر صوبۂ گجرات و لاہور کی صوبیداری تجویز فرمائی گئی لیکن رشوت کا بازار گرم تھا؛ مشکل سے قلعہ‌داری لاہور کی سند مل سکی۔

فرخ سیر کے آخری عہد میں صوبۂ کشمیر کی دیوانی عطا ہوئی۔ پھر وہاں سے معزول ہوکر دھلی آگئے۔ چند سال بیکاری و پریشانی میں گزارے۔ آخر سنہ ۱۱۳۵ھ میں ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر میں وفات پائی۔

صمصام الدولہ کے والد

انھیں کے ایک بیٹے میر حسن علی صمصام الدولہ کے والد بزرگوار تھے لیکن قدرت نے انھیں نشوونما پانے اور دنیا میں رہ کر عزت و سربلندی حاصل کرنے کی فرصت نہ دی۔ صرف انیس بیس سال کی عمر تھی کہ عین عنفوان جوانی میں بمقام لاہور سنہ ۱۱۱۱ ھ میں وفات پائی۔

نواب صمصام الدولہ

اپنے باپ کی وفات کے پندرہ روز بعد نواب صمصام الدولہ ۲۹ رمضان سنہ ۱۱۱۱ ھ کو دارالسلطنت لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام میر عبدالرزاق خان تھا۔ ان کے چچا وغیرہ لاہور میں ہی رہتے تھے لیکن خاندان کے زیادہ تر لوگ اورنگ آباد میں تھے۔ اس تعلق کی وجہ سے نوجوانی کے زمانے ہی میں لاہور سے اورنگ آباد آگئے اور بعد مسافت کی وجہ سے پھر نہ جاسکے۔ یہیں وہ بڑے تھے۔ ابتدا میں نواب آصف جاہ (طاب ثراہ) کی پیشگاہ سے سنہ ۱۱۳۵ ھ میں ایک معمولی منصب پر سرفراز ہوئے' مگر پھر تھوڑے ہی دنوں بعد صوبہ برار کی دیوانی بادشاہی پر مقرر کیے گئے اور مدتوں اس بلند عہدے پر مامور رہ کر نہایت عمدگی کے ساتھ خدمت انجام دیتے رہے اس شان کے ساتھ کہ ایک بار خود نواب آصف جاہ نے فرمایا کہ «ذر میر عبدالرزاق نمکے دارد»۔

سنہ ۱۱۵۰ ھ میں محمد شاہ بادشاہ دھلی نے نواب آصف جاہ کو حضور میں طلب کیا۔ نواب موصوف اپنے فرزند سعید نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کو اپنا نائب بناکر دکن سے دارالخلافہ کو روانہ ہوئے' انھوں نے صمصام الدولہ کو برار سے اورنگ آباد بلالیا۔ دونوں میں خوب گاڑھی چھننے لگی۔ رفیق خاص اور مصاحب و محرم بن گئے۔ نواب نظام الدولہ نے اپنی سرکار کی دیوانی اور شاہی دیوانی دونوں عہدوں پر سرفراز فرمایا۔ شہنوازخاں ان دونوں اعلی خدمتوں کو پورے استقلال سے سرانجام دیتے رہے' دیانت و امانت کا بدرجۂ کمال ثبوت دیا' رشوت ستانی کا یکقلم خاتمہ کردیا[1]۔

---

1 صفحہ ۲۳ جلد ۲ مآثرالامرا۔

نواب آصف جاہ جب ہندستان سے دکن واپس ہوئے تو بہکانے والوں نے نواب نظام الدولہ کو اپنے والد بزرگوار کی مخالفت پر آمادہ کیا مگر صمصام الدولہ اس کے بالکل خلاف تھے بلکہ برابر موافقت پر ابھارتے رہتے تھے۔ لیکن افسوس ان کی ایک نہ چلی۔ آخر ایک دن باپ اور بیٹے میں جنگ ہوکر رہی۔ صمصام الدولہ اپنے آقا نواب نظام الدولہ کے ہاتھی پر ان کے پیچھے بیٹھے تھے۔ ان کی فوج نے آصف جاہ اول کی فوج سے شکست کھائی۔ شہنوازخاں مدت تک نواب آصف جاہ کے معتوب رہے اور گوشہ نشینی اختیار کی، مگر وہ اس گوشۂ عزلت میں مآثرالامرا کی تصنیف میں مصروف رہے۔ پانچ سال کا زمانہ اسی عزلت میں گزارا۔ یہ محلہ قطب پورہ اورنگ آباد میں رہتے تھے[1]۔

آخر نواب آصف جاہ نے سنہ ۱۱۶۰ھ میں ان کا قصور معاف اور عتاب دور کیا۔ پھر حسب سابق برار کی دیوانی پر مامور فرمایا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد نواب آصف جاہ نے وفات پائی اور نواب نظام الدولہ باپ کی مسند پر بیٹھے۔ نواب صمصام الدولہ کو برار سے طلب کیا اور پہلے کی طرح پھر اپنی سرکار کی دیوانی پر سربلند فرمایا۔ وہ پورے استقلال کے ساتھ عہدۂ دیوانی کی ذمہ داری کو انجام دیتے تھے جو دکن کے چھے صوبوں کی وزارت کا نام تھا۔

نواب نظام الدولہ کو احمدشاہ فرماں روائے ہندستان نے شاہ جہاں آباد دھلی میں طلب کیا۔ وہ صمصام الدولہ کو اپنا نائب بناکر روانہ ہوئے۔ چلتے وقت اپنی انگوٹھی ان کو عنایت فرمائی اور ارشاد ہوا کہ یہ "مہر سلیمانی ہے"۔ نواب نظام الدولہ ابھی دریائے نربدا تک نہیں گئے تھے کہ انھیں واپسی کا حکم ہوا، حکم پاتے ہی دکن واپس چلے آئے۔

جس وقت نواب نظام الدولہ ملک ارکاٹ (مدراس) پہنچے اور اپنے باغی بھانجے مظفرجنگ پر فتح پائی تو نواب صمصام الدولہ نے بہت سمجھایا بجھایا کہ اس سرزمین میں حضور کا زیادہ ٹھیرنا مصلحت نہیں۔ انوارالدین خاں شہامت جنگ گوپاموی

---

[1] صفحہ ۲ جلد نمبر ۱ ۔

کے بیٹے محمد علی خاں کا انگریزوں کی معیت و رفاقت میں یہاں چھوڑدینا کافی ہے۔ یہ پھولچری کے فرانسیسی نصاری کی سرکوبی اور تنبیہ کے لیے بہت ہیں۔ لیکن افسوس نواب نظام‌الدولہ نے ان کی بات نہ سنی۔ بعض کوتاہ اندیشوں نے جو محض اپنے نفسانی اغراض کے لیے اس ملک میں ٹھیرنا چاہتے تھے اور جنھوں نے محض اپنے جزوی نفع کے لیے انتظام ملکی کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں، نواب نظام‌الدولہ کو یہاں ٹھیرنے پر راضی کرلیا۔ آخر وہیں شہادت پائی۔ مظفرجنگ فرمان‌روائے دکن قرار پائے لیکن وہ بھی چند روز بعد شہر کڑپہ کے قریب قتل کردیے گئے۔ اب نواب صلابت جنگ امیرالملک نواب آصف جاہ کے دوسرے بیٹے مسند ریاست پر زینت آرا ہوئے اور فتح و فیروزی کے ساتھ کڑپہ کے اطراف سے شہر کرنول کے حدود میں پہنچے۔ یہاں تک نواب صمصام‌الدولہ لشکر کے ہمراہ رہے۔ کرنول میں لشکر سے جدا ہوکر جلد سے جلد اورنگ‌آباد پہنچے۔ (میر غلام علی آزاد بلگرامی بھی انھیں کے ہمراہ تھے)۔ کچھ دنوں بالکل خانہ‌نشین رہے۔ ۹ رجب سنہ ۱۱۶۵ھ کو نواب امیرالملک کے پاس حیدرآباد جانے کا ارادہ کیا۔ حضور میں پہنچنے کے بعد حیدرآباد کی صوبہ‌داری پر شرف امتیاز پایا۔ تھوڑے دنوں بعد پھر معزول ہوکر اورنگ‌آباد چلے آئے اور کنج تنہائی اختیار کیا۔ جب خود نواب امیرالملک اورنگ‌آباد تشریف لائے تو ماہ صفر سنہ ۱۱۶۷ھ کی چوتھی تاریخ کو انھیں یاد فرمایا۔ خلعت اور وکیل مطلق کا اعلیٰ عہدہ عطا ہوا۔ اس کے علاوہ ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا بلند ترین منصب اور صمصام‌الدولہ کا خطاب بھی مرحمت فرمایا گیا۔ یہ سرفرازی حاصل کرکے نواب صمصام‌الدولہ چار سال تک نہایت قابلیت سے اپنی اہم ذمہ‌داری بجالاتے رہے۔ اپنی تدبیر و رائے کی خوبی سے مملکت کے تمام جزئی و کلی امور کو عجیب رونق بخشی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بے‌اسبابی کے باوجود ایک طلسم باندھ دیا اور معاملات کو ایسا چمکایا کہ عقلمندوں کی عقلوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا، کیونکہ جس وقت وکالت ان کے حوالے کی گئی تھی نواب امیرالملک کی سرکار ایک عجیب حالت میں تھی۔ یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ بےزری کی وجہ سے گھر کا سامان بیچنا پڑتا تھا۔ نواب صمصام‌الدولہ نے

کچھ ایسے حسن تدبر سے کام لیا کہ بگڑی بات بنادی۔ انتظام حکومت جو درہم برہم ہوچکا تھا پھر منظم و باقاعدہ ہوگیا، سر پھرے باغی حلقہ بگوش اطاعت اور کج طبع لوگ سیدھے ہوگئے، ملک میں عجب امن و امان رونما ہوگیا، تمام رعایا اور خدا کی مخلوق عدالت و انصاف کے سائے میں عجیب آرام و آسودگی سے رہنے لگی۔ اپنی وکالت کے چار سال میں ملک کا آمد و خرچ برابر کردیا اور فرماتے تھے کہ خدا نے چاہا تو اگلے سال آمدنی خرچ سے بڑھ جائےگی۔ وکالت مطلق کے عہدے پر نواب صمصام الدولہ کے مقرر ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد امیرالملک کے رایات فوجی حرکت میں آئے اور رگھو بھوسلہ کی تنبیہ کے ارادے سے برار کی جانب متوجہ ہوئے۔ رگھو کی گوشمالی کرکے پانچ لاکھ روپیہ اس سے بطور پیشکش کے وصول کیا گیا پھر برار سے نرمل کا رخ کیا۔ وہاں کا زمیندار سریا راؤ نواب آصف جاہ اول کے عہد سے سرکشی و بغاوت پر آمادہ تھا، کئی بار سرکاری فوج کو غارت کرچکا تھا، نواب صمصام الدولہ اپنی حکمت عملی سے اس کو مقید کرکے اس کے ملک کو سرکار عالی کے ضبط و تصرف میں لے آئے۔ اپنی وکالت کے پہلے سال میں انہوں نے یہ دو بہترین کام کیے اور کامیاب ہوئے۔ برسات کا موسم حیدرآباد میں گزارا۔ وکالت کے دوسرے سال سنہ ۱۱۶۸ ھ میں نواب امیرالملک کو میسور کی طرف لے گئے، وہاں کے راجا سے پچاس لاکھ روپیہ پیشکش کا حاصل کیا اور برسات کے آغاز موسم میں ہی حیدرآباد واپس آگئے۔ انہیں دنوں میں دہلی کے بادشاہ عالمگیر ثانی نے نواب صمصام الدولہ کے لیے ماہی و مراتب بھجوائے اور کسی صاحب نے یہ تاریخ کہی :—

۱۱۶۸ ھ

از شاہ ہند آمد ماہی و ہم مراتب

وکالت کے تیسرے سال سنہ ۱۱۶۹ ھ میں راؤ بالا جی کی کمک کی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ راؤ بالا جی نے شہر سانور کا محاصرہ کیا تھا۔ سانور کے پٹھانوں نے حصار شہر کو اس قدر مضبوط کردیا اور ایسی بہادری دکھائی کہ بارہا حصار سے باہر ایسی مورچال باندھی کہ راؤ بالا جی عاجز آگیا اور مجبور ہوکر نواب صمصام الدولہ سے

امداد طلب ہوا۔ سبحان اللہ! خدا کی شان ہے کہ وہی راؤ بالاجی جو دکن اور ہند میں شقشقے ممالک بنے فتح و نصرت میں لے آیا تھا، جس نے بادشاہ دہلی اور ارکان سلطنت میں زلزلہ ڈال دیا تھا، انھیں اپنی طاقت سے لرزا دیا تھا، آج وہ نواب صمصام الدولہ کی طرف رجوع ہوتا اور ان کے دامن امداد کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ یہ ہے حسن تدبیر۔ آخر نواب صمصام الدولہ نواب امیر الملک کو بالاجی کی کمک پر لے جاتے ہیں، لشکر کو ساونور پہنچاتے ہیں اور مورچال قائم کرکے توپ خانے سے ایسی آگ برساتے ہیں کہ افغانوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں، چہروں کے رنگ اڑجاتے ہیں اور وہ صلح کا دروازہ کھٹکھٹانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں: اس مہم کو سر کرنے اور ساونور کے پٹھانوں کا معاملہ طے ہونے کے بعد نواب صمصام الدولہ نے چاہا کہ نصاری کا خاتمہ کردیا جائے[1]۔ نواب امیر الملک نے نواب صمصام الدولہ کے ارشاد سے تمام نصاری کو نوکری سے برطرف کردیا۔ نصاری نوکری سے برطرف اور لشکر سے جدا ہوکر سیدھے حیدرآباد کو روانہ ہوئے اور حیدرآباد کو اپنے قبضہ و اختیار میں لاکر قلعہ بند ہوگئے۔ نواب امیر الملک نے ان کے پیچھے پہنچ کر محاصرہ کرلیا۔ قریب دو مہینے کے محاصرہ رہا۔ باہم لڑائیاں ہوئیں۔ آخر سر برآوردہ لوگوں کے نفاق کی بدولت صلح کرنا پڑی۔ عمدۃ الملک اور حیدر جنگ نے آکر ملاقات کی۔

محاصرہ کے زمانے میں نصاری کی جاگیروں کا انتظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ عمدۃ الملک اور حیدر جنگ نے رخصت لے کر اپنے معاملات جاگیر یعنی راج بندری اور سیکاکول کے لیے سامان سفر باندھا۔ نواب صمصام الدولہ نے برسات کا زمانہ حیدرآباد

---

۱ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ اپنے بھانجے مظفر جنگ کی سرکوبی کے لیے ملک ارکاٹ کو گئے تھے، مظفرجنگ نے پھولچری (پانڈیچری) کے فرانسیسیوں کی امداد سے ان کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ پر یہ کڑپہ اور کرنول کے پٹھانوں کی حوصلہ افزائی سے بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ نظام الدولہ شہید ہوئے۔ اس سے پہلے بدبخت اپنی مخصوص بندروں (ساحل‌کاهوں) میں رہتے تھے اور اپنی حد کے باہر پاؤں نہیں نکالتے تھے مگر نواب نظام کی شہادت کے بعد ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ ملک گیری کی لذت جو پائی تو ارکاٹ کے بعض حصوں پر قبضہ کرلیا۔ جلوس ہند کے بعض علاقوں کو نصاری (انگریز) دبا بیٹھے۔ یہ انگریز بنگالے پر بھی قابض ہوگئے تھے۔ قاسلا سورت کو بھی لے بیٹھے تھے اور یہی نصاری کے ہندستان پر تسلط کی ابتدا ہے۔

القصہ نواب نظام الدولہ کی شہادت کے بعد مظفر جنگ نے فرانسیسی نصاری کو نوکر رکھ لیا اور اپنا رفیق بنالیا۔

میں بسر کیا اور اپنی وکالت کے چوتھے سال (سنہ ۱۱۷۰ ھ) میں حیدرآباد سے نکلے۔ رام‌چند مرہٹہ نواب آصف جاہ کے عہد سے بھالکی وغیرہ محالات (جو صوبۂ بیدر کے علاقے میں واقع تھے) لاکھوں کا علاقہ اپنے تصرف میں رکھتا تھا۔ مگر اپنے بےسلیقہ‌پن اور بےحیثیتی کے سبب نوکری کے فرائض انجام دینے سے قاصر رہتا تھا۔ نواب صمصام‌الدولہ نے چاہا کہ اس کا علاقہ اس سے چھین لیں۔ رام‌چندر اسباب جنگ کی تیاری میں مشغول ہوگیا، آخر ایک حرکت مذبوحی کے بعد اسے حلقہ بگوش اطاعت ہونا پڑا۔ اس کا تمام علاقہ بھالکی کے سوا سرکار عالی کے ضبط و تصرف میں آیا۔ نواب صمصام‌الدولہ نواب امیرالملک کے ہمراہ برسات کے شروع موسم میں اورنگ‌آباد چلے آئے اور انہیں دنوں ایک فوج بھیج کر قلعۂ دولت‌آباد کا محاصرہ کیا اور قلعے کو سادات بخارا سے چھین کر اپنے قبضے میں لےلیا۔ یہ لوگ عالم‌گیر بادشاہ کے عہد سے موروثی قلعہ‌دار تھے۔ اس کے بعد فلک شعبدہ باز نے ورق الٹنا شروع کیا اور کینہ و حسد پر کمر

(بقیہ حاشیہ ۷۱۲)

ان کے قتل کے بعد یہ نصاریٰ نوکری کے طور پر نواب امیرالملک کے ہم رکاب ہوگئے۔ سیکا کول اور راج بندری کو اپنی جاگیر میں لے لیا اور عجیب اقتدار بہم پہنچالیا کہ گویا اب حکم انہیں کا تھا۔ نصاریٰ کا سردار موسیو بوسی سیف‌الدولہ عمدۃالملک کے خطاب سے سرفراز اور عمدۃالملک کی سرکار کا صاحب اختیار صدر جنگ ہوا۔

حیدرجنگ کا نام عبدالرحمن تھا اور اس کا باپ خواجہ قلندر بلخی بلخ سے ہندستان آکر نواب آصف جاہ کے عہد میں اچھا اقتدار و اعتبار پیدا کرچکا تھا۔ وہ مچھلی بندر کا فوج‌دار تھا اور مچھلی بندر میں چند نصاریٰ سے واقف ہوچکا تھا بلکہ ان سے دوستی پیدا کر لی تھی اور جب اس کے ذمہ سرکاری محاسبہ نکلا تو وہ اس دوستی کے تعلق کی وجہ سے بھاگ کر ان نصاریٰ کی پناہ میں چلا گیا۔ اس وقت حیدر جنگ کم عمر تھا فرانسیسیوں کا حاکم اسے عزیز رکھتا تھا۔

مظفر جنگ جب رئیس ہوا تو کورندور کپتان نے نصاریٰ کی ایک جمعیت موسیو بوسی کی سرداری میں مظفر جنگ کے ساتھ کردی اور عبدالرحمن کو بھی موسیو بوسی کے ہمراہ اس لیے کردیا کہ گویا وہ مسلمانوں اور نصاریٰ کا جامع ہے۔ یہ شخص جوہر قابل تھا۔ اس نے بہت زبردست ترقی کی۔ فرنگیوں کی سرکار کا انتظام (حل و عقد) اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسداللہ حیدر جنگ خطاب پایا۔

باندھ کر نواب صمصام‌الدولہ کی شکست پر آمادہ ہوگیا اور وہ تمام عقل و ہوش جو صمصام‌الدولہ رکھتے تھے ان سے چھین لی۔

بات یہ ھے کہ سرکارعالی کے ذمے فوج کی تنخواھوں کا روپیہ بہت زیادہ چڑھ گیا تھا۔ بدمعاشوں نے سپاہ کو ورغلا دیا۔ فوج نے تقاضے کا ھنگامہ برپا کردیا نواب صمصام‌الدولہ چاھتے تو آسانی سے دس لاکھ روپے کا انتظام کردیتے اور یہ فتنہ دب جاتا۔ مگر بات یہ ھے کہ زوال دولت کا وقت آ پہنچا تھا، آپ نے کچھ اس کی پروا نہ کی۔ آخر ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۱۷۰ھ کی چھٹی تاریخ کو فوج کے سپاھی نواب آصف جاہ کے فرزند نواب شجاع‌الملک صلابت جنگ کو ان کے گھر سے نکال کر نواب امیرالملک کے حضور میں لے آئے اور مجبور کیا کہ نواب صمصام‌الدولہ کو معزول کرکے وکالت مطلق کا خلعت انھیں عطا کیا جائے۔ عجیب عام بلوہ ہوگیا تھا۔ شہر کے بازاریوں اور بدمعاش لوگوں نے یہاں تک چاھا کہ نواب صمصام‌الدولہ کے گھر پر ٹوٹ پڑیں اور لوٹ ڈالیں۔ مگر کچھ ایسے اسباب ظہور میں آئے کہ ان کا یہ ناپاک ارادہ پورا نہ ھوا اور بلوہ شام تک موقوف رھا۔ رات کو یہ بلوائی متفق ھوگئے۔ نواب صمصام‌الدولہ نے سوچا کہ اگر کل انھوں نے یورش کی تو ان کے مقابلے میں آکر لڑنا ناممکن ھے، چپکے سے نکل جانا چاھیے۔ آدمی رات کو ھاتھیوں پر ضروری سامان و اسباب لادا اور گھر کے لاکھوں روپے کے قسم قسم کے نفائس اور بیش‌بہا نوادر کو وھیں چھوڑ دیا اور خود تمام گھر والوں مردوں، عورتوں کو لےکر قلعۂ دولت‌آباد روانہ ھوگئے۔ کوئی پانسو سوار اور پیادوں نے رفاقت کا حق ادا کیا، مشعلیں روشن تھیں، ھتھیاربند گھروں سے نکلے اور شہرپناہ کی دیوار کے ظفر دروازے کا رخ کیا۔ دروازے کے محافظ مقابلے کی تاب نہ دیکھ کر بھاگ کھڑے ھوئے۔ نواب صمصام‌الدولہ کے ساتھی دروازے کا قفل توڑکر شہرپناہ کے دروازے سے نکلے اور صبح کے قریب ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۱۷۰ھ کی آٹھویں تاریخ کو دولت‌آباد پہنچ گئے۔ گھر کا کچھ سامان غارت‌گروں کی لوٹ کھسوٹ میں اور زیادہ حصہ سرکار عالی کے ضبط و تصرف میں آیا۔ تھوڑے دنوں بعد ایک سرکاری فوج نے قلعۂ دولت‌آباد کا محاصرہ کیا اور لڑائیاں ھونے لگیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نواب صمصام الدولہ نہایت پسندیدہ صفات سے متصف اور عمدہ خصائل سے آراستہ تھے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالی اپنے پسندیدہ اور محبوب نظر لوگوں کو بھی مخلوق کی نظر سے گرا دیتا ہے اور آخرت کے مرتبے بلند کرنے کے لیے دنیا کی امتحان گاہ میں کسی نہ کسی بلا میں مبتلا کردیتا ہے۔ اسی کا پورا منظر نواب صاحب موصوف کے معاملے میں مشاہدہ ہوا کہ باوجود ان خوبیوں اور برگزیدگیوں کے جو صمصام الدولہ کی ذات میں جمع تھیں، ساری خدا کی مخلوق کیا امیر اور کیا فقیر، کیا درباری اور کیا بازاری، سب ان سے پھر گئے اور پکڑو مارو کے سوا کوئی لفظ زبان پر نہ لاتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے وفا کی راہ میں ثابت قدم رہ کر ان کی دوستی کو بحال رکھا مگر کس کی مجال تھی کہ دم مارے یا اس حالت کو ختم کرنے کا تہیّہ کرے۔ صرف ایک آزاد بلگرامی کی ذات گرامی تھی جس نے آشوب قیامت کی پروا نہ کی، تمام عالم کی مخالفت سے بےنیاز ہوکر نواب شجاع الملک سے کئی ملاقاتیں کیں اور باہمی صلح کی بنیاد ڈالی۔ بار بار قلعے میں جاکر صمصام الدولہ سے ملے، گفتگوئیں کیں اور بڑی سحرکاری و افسوں طرازی سے کام لےکر قلعے کے محاصرے کو اٹھوا دیا۔ ابھی مصالحت کی شرطیں تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں کہ نواب نظام الدولہ ثانی ناظم صوبۂ برار ایلچپور سے اورنگ آباد تشریف لائے۔ نواب امیرالملک نے ان کو اپنی ولی عہدی کے بلند ترین منصب پر ممتاز فرمایا اور نظام الملک آصف جاہ کا خطاب بھی عطا کیا۔ انھوں نے مولانا آزاد بلگرامی کو طلب فرماکر اس بات پر مامور کیا کہ صمصام الدولہ کو منا کر راضی کرلیں اور ان کے طومار مطالب پر ان کی استدعا کے موافق دستخط فرما کر مولانا کے حوالے کیا۔ مولانا اس کو لےکر قلعے میں پہنچے اور صمصام الدولہ کو حاضر حضور ہونے پر آمادہ کیا۔ نواب آصف جاہ نے اچھے اچھے سرداروں کو استقبال کے لیے بھیجا۔ نواب صمصام الدولہ ربیع الاول سنہ ۱۱۷۱ھ کی پہلی تاریخ کو قلعے سے برآمد ہوئے اور اس کے بیرونی حصے میں استقبالی سرداروں سے ملاقات کی۔ اسی روز نواب آصف جاہ ثانی اور نواب امیرالملک سے شرف ملاقات حاصل کیا اور بہت سے مراحم شاہانہ سے سرفراز ہوئے۔

ان ہی دنوں میں بالاجی راؤ مخالفت کے ارادے سے اورنگ آباد کے قریب پہنچا۔ اس لیے اپنے بیٹے بسواس راؤ کو مقدمۃ الجیش (ہراول) بناکر بھیجا۔ ادھر راجا رام چندر اپنے وطن سے نواب امیرالملک کے آستانے پر حاضری کے ارادے سے آرہا تھا وہ اورنگ آباد سے تین کوس کے فاصلے پر بمقام سندکھیڑہ پہنچا تھا کہ بالاجی راؤ مرہٹہ نے وہیں اس کو گھیر لیا اور اس کا قافیہ تنگ کردیا۔ نواب آصف جاہ ثانی یہ خبر سن کر اورنگ آباد سے سندکھیڑہ نہضت فرما ہوئے اور راجا رام چندر کو اس ہلاکت سے چھڑایا۔ اثنائے راہ میں بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں، مگر ہر معرکے اور ہر موقع پر آصف جاہ ثانی نے اپنی جگرداری اور بہادری کے جوہر دکھائے اور دشمنوں کی بڑی تعداد کو اپنی آتش بار تلوار سے جلا کر خاک سیاہ کردیا۔ نواب صمصام الدولہ ہمرکاب تھے، اسی دوران میں خبر ملی کہ عمدۃ الملک موسیو بوسی اور حیدر جنگ اپنی جاگیرات کے کام سے فارغ ہوکر نواب امیرالملک کے حضور میں حاضری کا قصد رکھتے ہیں اور حیدرآباد پہنچ چکے ہیں۔ حیدر جنگ نے نواب صمصام الدولہ کو متواتر خط لکھے اور اس قدر اخلاص ظاہر کیا کہ موصوف کو اس کے اخلاص پر پورا پورا بھروسا ہوگیا۔ اس کے مکر اور اندیشۂ فریب سے پوری غفلت عمل میں آرہی۔ فتح مند لشکر سندکھیڑے سے واپس ہوکر شاہ گڑھ کے اطراف میں پہنچا تھا کہ حیدر جنگ حضور میں پہنچا۔ دونوں مل کر پورا لشکر ہیئت مجموعی کے ساتھ اورنگ آباد میں آگیا۔ شہر کے شمالی حصے میں خیمے لگ گئے۔

نواب صمصام الدولہ نے اپنے تمام اختیارات کی باگ حیدر جنگ کے ہاتھ میں سونپ دی۔ وہ بڑی خوشامد درآمد اور چاپلوسیوں سے پیش آیا، مگر مکر و فریب کا جال بچھادیا۔ نواب صمصام الدولہ کے جو احباب اس کے دھوکے سے آگاہ ہوچکے تھے ہرچند انھوں نے صراحت و کنایت کے ساتھ نواب صاحب کو خبریں دیں، مگر انھیں یقین ہی نہ آیا۔ بلکہ دشمن کے منافقانہ اخلاص پر بھروسا کرکے دوستوں کی خیرخواہی کا کچھ اعتبار نہ کیا۔ رجب سنہ ۱۱۷۱ ھ کی چھبیسویں کو نواب امیرالممالک باغ بیگم واقع اورنگ آباد کی سیر کو تشریف لے گئے۔ وہاں حیدر جنگ نے اپنے مکر و فریب

کا سامان تیار کرلیا تھا، نواب صمصام‌الدولہ اور نواب یمین‌الدولہ کو بھی بلا بھیجا، حسب طلب وہ بھی گئے۔ حیدر جنگ نے دونوں کو وہیں نظربند کردیا اور اپنے لشکر میں لاکر الگ الگ خیموں میں رکھا۔ پھر صمصام‌الدولہ کے چاروں بیٹوں کو طلب کرکے انھیں بھی باپ کے ساتھ ایک ہی خیمے میں مقید کردیا جن کے نام یہ ہیں: میر عبدالحی‌خان، میر عبدالسلام‌خان، میر عبدالنبی‌خان، میرعبدالغنی‌خان۔ خیمے کے آس پاس نصاریٰ کو پاسبان بناکر بٹھا دیا۔ نواب صمصام‌الدولہ کا گھربار جوکچھ بھی دوبارہ جمع ہوا تھا لوٹ ڈالا۔ مستورات سادات کو گھر سے نکلوادیا۔ نواب صمصام‌الدولہ کے ان رشتہ‌داروں اور وابستگان دامن کو جو ذرا کچھ حیثیت رکھتے تھے، پکڑواکر سخت قید و بند میں ڈال دیا اور ان سے بہت کچھ روپیہ وصول کیا۔ بزرگ سادات پر ایسا ستم گزر گیا کہ واقعۂ کربلا تازہ ہوگیا تھا لیکن یہ حرکتیں حیدرجنگ کے لیے بھی کچھ مبارک ثابت نہ ہوئیں۔ نواب آصف‌جاہ ثانی اس فکر میں تھے کہ اس کا نقش حیات بھی صفحۂ روزگار سے جلد تر دھو ڈالیں اس لیے کہ حیدر جنگ نے نواب صمصام‌الدولہ سے بدعہدی اور غدّاری کی تھی۔ اس کی طرف سے اطمینان اٹھ گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ حیدر جنگ نے نواب صمصام‌الدولہ کو قید کرنے سے پہلے ہی نواب امیرالملک کو بےپروبال کردیا تھا۔ نواب آصف‌جاہ ثانی برار سے ایک زبردست فوج اپنے همرکاب لائے تھے اور انھوں نے تمام مالی و ملکی معاملات اور مہمات کا انتظام اپنے قبضہ و اختیار میں لے لیا تھا۔ حیدر جنگ نے دیکھا کہ نواب آصف‌جاہ کی بدولت میرے تسلط کا نقش ٹھیک بیٹھتا نظر نہیں آتا، اس خیال سے وہ نواب موصوف کی شکست کی فکر میں پڑگیا۔ طرح طرح کے حیلے سازی سے ساری فوج کو نواب سے جدا کردیا اور آٹھ لاکھ روپیہ سپاہ کی تنخواہ کا اپنے پاس سے ادا کرکے نواب کو تنہا کردیا۔ پھر نواب صمصام‌الدولہ کو قید کرکے دونوں طرف سے بالکل سکون و فراغ پالیا۔ وہ چاہتا یہ تھا کہ نواب آصف‌جاہ کو حیدرآباد کی صوبہ‌داری کے بہانے سے وہاں بھیج دے اور قلعۂ گولکنڈہ میں نظربند کر رکھے، پھر پورا میدان اپنی جولانی کے لیے صاف ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ تقدیر اس کی تدبیر پر ہنس رہی ہے۔ رمضان‌المبارک

سنہ ۱۱۷۱ھ کی تیسری کو حیدرجنگ نواب آصفجاہ کے خیمے میں آیا، نواب موصوف پہلے ہی اپنے خاص مشیروں سے اس کے قتل کا منصوبہ قرار دے چکے تھے۔ محفل خاص کے حاضرین نے وہیں حیدر جنگ کو پکڑ کر ذبح کرڈالا۔ نواب آصفجاہ تنہا ایک گھوڑے پر سوار ہوکر لشکر سے نکل آئے، فرنگیوں کا سارا توپخانہ محو حیرت اور بیکار رہا۔ نواب نے وہ جرأت دکھائی کہ رستم و افراسیاب کے کارنامے منسوخ کردیے۔ حیدر جنگ کے ذبح ہونے کی خبر پاتے ہی عمدۃالملک موسیٰ بوسی اور دوسرے اعیان لشکر کے ہوش اڑگئے۔ اس افراتفری میں بدمعاشوں نے صمصام‌الدولہ اور ان کے بیٹے میر عبدالغنی کو شربت شہادت پلادیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ حیدر جنگ جو دراصل ان سادات کا قاتل تھا، وہ ان شہید سادات سے چار گھڑی پہلے قتل ہوچکا تھا۔ نواب صمصام‌الدولہ نے اپنے کانوں سے اس کا قتل ہونا سنا اور فرمایا کہ اب ہماری سلامتی بھی نظر نہیں آتی۔ پورے استقلال کے ساتھ قبلہ‌رو ہو بیٹھے۔ اتنے میں ایک ہندو اچھمنا نامی ان صاحب کے رفقا میں سے آیا اور انہیں شہید کرڈالا۔ باپ بیٹے دونوں اپنے آبائی مقبرے میں دفن ہوئے جو شہر کے جنوب جانب شاہ نور قدس سرہ کی درگاہ کے پاس ہے۔ یمین‌الدولہ اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے جو شاہ نور کے گنبد کے پائینتی ہے۔ یہ بھی بڑے درجے کے امیر اور صمصام‌الدولہ کے رشتہ‌دار تھے۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے ان تینوں کی تاریخ شہادت اس آیت سے نکالی۔
"وجوہٌ یومئذ مسفرۃ" (۱۱۷۱)۔

صمصام‌الدولہ کی تاریخ شہادت اس قطعہ میں کہی ہے:—

رفت صمصام‌الدولہ ز جہاں　　سیوم ماہ شریف رمضان
سال ایں واقعہ آں سید خود　　گفت: ما کشتۂ عبدالرحمن

۱۱۷۱ھ

یہ مستزاد رباعی بھی تاریخ میں نظم فرمائی:—

... صمصام‌الدولہ آں امیر والا ... دانش آگاہ ...

ناحق شدہ کشتہ در کمین گاہ دغا   وا مظلوماہ
آزاد بعرض می رساند تاریخ   یاوران شنوید
کردند شہید ناکسان سید را   انا للّٰہ

۱۱۷۱ھ

لچھمنا زمیندار سیکاکول کی جنگ میں مارا گیا۔ محمد حسین جماعت دار فرقہ گاردیان جو اپنی جماعت کے ساتھ نواب صمصام الدولہ اور ان کے عزیزوں اور ان کے رفیقوں کی نگرانی پر مقرر تھا اور بہت بدسلوکیاں عمل میں لاتا تھا اپنی جماعت کے ساتھ مارا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں خون سادات رنگ لایا اور قدرت نے دشمنوں سے پورا انتقام لے لیا۔

عام اخلاق و عادات

نواب صمصام الدولہ جامع الکمالات تھے، تمام علوم مروجہ سے واقف اور ہر فن کے مسائل اپنے حافظے کے خزانے میں حاضر رکھتے تھے، شعر فہمی میں انہیں یکتائی کا دعویٰ بجا تھا۔ فارسی زبان کے مصطلحات خوب جانتے تھے۔

حق تو یہ ہے کہ اس بے نظیر امیر کی خوبیاں اس قدر ہیں کہ ان کا زبان قلم سے ادا ہونا دشوار ہے اور صفحات کاغذ کی وسعت اس کے احاطے سے قاصر ہے، خدا کی قسم زمانے کی آنکھوں نے ایسے جامع کمالات امیر نہ دیکھے ہوں گے اور اس بوڑھے خرانٹ آسمان کو ایسے اعلیٰ حیثیت صاحب دولت کو کبھی اپنی نگاہ کی میزان پر تولنے کا موقع نہ ملا ہوگا۔

نشو و نما کے آغاز ہی سے آثار سربلندی و ترقی ان کی پیشانی سے نمایاں تھے اور بلند اقبالی و خوش طالعی کے انوار ان کی جبین حال سے جلوہ گر تھے۔

صمصام الدولہ خود اپنی نسبت فرماتے تھے کہ "میں دو چیزوں کا دعویٰ رکھتا ہوں: ایک تو عدل و انصاف کہ معاملے کی باریکیوں اور تہوں تک جیسا کہ چاہیے پہنچ جاتا ہوں اور حق کو باطل سے الگ الگ کردیتا ہوں دوسرے شعر فہمی۔

مولانا آزاد نے ان کی شعر فہمی کا ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے کہ ایک روز صمصام الدولہ نے کہا کہ فیضی کا یہ مطلع مشہور ہے آپ نے سنا ہی ہوگا:

مرا براہ محبت دو مشکل افتاد است
کہ خون گرفتہ ام دیار قاتل افتاد است

ظاہری معنی کے لحاظ سے ایک مشکل تو عاشق کا خون گرفتہ ہونا ہے دوسری مشکل محبوب کا قاتل ہونا، بس نجات دشوار ہے۔ مگر میرے دل میں ایک اور مطلب آیا ہے وہ یہ کہ ایک مشکل یہ کہ عاشق خون گرفتہ تو ہے ہی لیکن ایسا نہ ہو کہ معشوق کے سوا کوئی اور اسے قتل کرڈالے۔

دوسری مشکل یہ کہ یار قتال واقع ہوا ہے لیکن یہ نہ ہو کہ عاشق کے سوا اور کسی کو قتل کرڈالے: یہ دونوں باتیں عاشق کو ناگوار ہیں اور یہی اس کی بےپناہ مشکل کا سبب ہیں۔

سبحان اللہ کیا سخن فہمی ہے، عجیب بات پیدا کی ہے۔ نثر میں منشی بےبدل اور زبردست انشاپرداز تھے، ان کی انشا خطوط نویسی میں ایک خاص انداز رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے منشآت (خطوط) جمع نہ ہوئے ورنہ دیکھنے والوں کو سرمہ جواہر کا کام دیتے۔

تاریخ دانی میں بھی یکتائے عصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ خاص کر امرا اور سلاطین تیموریۂ ہند کے بارے میں گویا وہ "نسّابۂ وقت" تھے۔ اس کا ثبوت ان کی کتاب مآثرالامرا ہے کہ اس کی قدر و قیمت کچھ صاحب فن ہی جان سکتا ہے۔

عربی اور فارسی کتابوں کا ایک زبردست کتب خانہ فراہم کیا تھا اور ان میں سے اکثر کتابوں کا مقابلہ اور تصحیح خود کی تھی، افسوس کہ اس ہنگامے میں ان کا کتب خانہ درہم و برہم ہوگیا۔

ان کے اوصاف حمیدہ اس قدر ہیں کہ زبان تقریر بیان سے ادا نہیں کرسکتی؛ مثلاً، علوّ مزاج اور متانت رائے میں ارسطو کو ان کا شاگرد کہہ سکتے ہیں۔ وقار، تمکین، درددلی اور غمخواریٔ خلائق، عدل و انصاف اور آنکھوں کی حیا، وفا و صفا،

صدق و دوستی ان سب خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ جھوٹ سے بہت ناخوش ہوتے تھے اور جھوٹ بولنے والے کا ذرا بھی اعتبار نہیں کرتے تھے۔ سخاوت کا یہ عالم کہ جو کچھ روپیہ انھیں ملتا اسی وقت اس میں سے دسواں حصہ حقداروں کے لیے نکال دیتے۔ "دہ یکے" کا خزانہ الگ تھا یہ روپیہ اسی مد سے حقداروں پر صرف ہوتا تھا، غرضکہ ایسے امیر تھے جن کو امارت زیب دیتی تھی۔ جس وقت مسند پر بیٹھتے بےتکلف ان کو شان امارت زیب دیتی تھی اور ریاست کا شکوہ ان کی پیشانی سے عجیب رونق اور جلوہ دکھاتا تھا۔

ہفتے میں دو دن عدالت کے لیے مقرر کر رکھے تھے۔ جمعہ اور منگل کو وہ مدعی اور مدعاعلیہ دونوں کو اپنے حضور میں طلب کرکے بہ‌نفس نفیس تنقیح کے لیے متوجہ ہوتے تھے۔

ملک کے نظم و نسق کے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ رات اور دن میں کبھی بھی ملکی مشورہ کے لیے کوئی خلوت نہ تھی، نہ کوئی مشیر تھا۔ زمانے کے بڑے بڑے عقلمند ان کی بلندنظری اور وفور عقل پر آئینۂ حیرت بن کر رہ جاتے تھے۔ صبح کی نماز سے فارغ ہوکر مہمات ملکی کی طرف متوجہ ہوجاتے، دوپہر کو قیلولہ (آرام) کرتے، ظہر کی نماز پڑھ کر پھر حکومت کے کاروبار میں لگ جاتے اور آدھی رات تک بلکہ اس سے بھی زیادہ مالی و ملکی کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ طرح طرح کے صاحب حاجت لوگ اپنے معاملات کے بارے میں خود روبرو حاضر ہوکر اپنے معاملات کا سوال جواب کرتے، کسی واسطے کا دخل نہ تھا۔ دیوان میں بڑی شان جبروتی سے بیٹھتے اور خلوت میں بالکل سادہ دلی اور پورے انبساط و بےتکلفی سے میل جول رکھتے تھے۔

نواب سالار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ نواب صمصام الدولہ نے قلعۂ دولت‌آباد سے واپس آنے کے بعد مجھ سے کہا کہ ایسا معلوم ہوچکا ہے کہ یہ جو کچھ اسباب ظاہری میرے پاس جمع ہوگیا ہے کچھ نہ رہےگا۔

میں نے کہا: یہ کیونکر معلوم ہوا۔

کہا: مجھے یہی معلوم کرایا گیا ہے۔

نواب مذکور یہ بھی کہتے تھے کہ جس روز وکالت کا منصب ان سے لیا گیا تھا، عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ میں اور ایک بڑا گروہ رات کو نواب صمصام الدولہ کے گھر میں سویا۔ ہم لوگوں کو خوف کی وجہ سے کسی طرح نیند نہ آتی تھی۔ میں نواب صمصام الدولہ سے بہت سویرے ملا، انھوں نے کہا کہ آج رات خوب اطمینان سے سونا نصیب ہوا۔

انھیں کی ایک اور روایت ہے کہ نواب صمصام الدولہ نے مجھ سے کہا کہ قلعے جانے سے پہلے میں نے اپنے فراش خانے کی موجودات کا جائزہ لیا تو دو سو سے زائد قالین اور دہ ماں برآمد ہوئیں اور جس روز میں قلعۂ دولت آباد میں گیا ہوں تو کوئی ایک فرش بھی پاس نہ تھا۔ مگر اس حالت میں بھی میرے دل میں ذرہ برابر کوئی تغیّر نہ آیا۔

مولانا آزاد بلگرامی ان کی نیک دلی اور باضابطگی کا ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ جس وقت نواب صمصام الدولہ ملک آرکاٹ میں تشریف لے گئے اور مظفر جنگ پر فتح پائی، اس ملک کے عمال حضور میں طلب ہوئے اور عہدۂ دیوانی کے تعلق کی وجہ سے نواب صمصام الدولہ کے خیمہ کے دروازے پر خیمہ نصب کرکے ان کو جگہ دی گئی تھی۔ ایک روز میں نواب صمصام الدولہ کے خیمے سے نکلا تو ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا: حاجی عبدالشکور تحصیل دار (عامل) معزول کہتا ہے کہ "میں اس وقت پہرہ داروں کی نگرانی اور قبضے میں ہوں۔ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ آپ ذرا یہاں تک تکلیف فرمائیے۔ عامل مذکور سے میری جان پہچان نہ تھی۔ لیکن نہ جانا بھی شیوۂ مروت کے خلاف معلوم ہوا۔ میں گیا تو اس نے پہرہ والوں کی سختی اور قید کی شدت کی شکایت کی۔ اسی وقت میں پلٹ کر نواب صمصام الدولہ کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ حاجی عبدالشکور نامی ایک عامل تحصیل داروں کے زمرے میں دروازے پر حاضر ہے ذرا اس کو آپ اپنے حضور میں بلوائیے۔ نواب صاحب نے فرمایا: یہ ضابطہ نہیں ہے کہ جس تحصیل دار کے ذمے مطالبہ ہو وہ سامنے بلایا جائے۔

میں نے کہا: میں یہ نہیں کہتا کہ مطالبہ معاف کردیا جائے۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ایک بار وہ پیش ہوجائے۔

نواب صاحب انکار کرتے رہے اور میں اصرار کرتا رہا۔ آخر نواب نے اسے بلایا اور اس کی حالت کا مشاہدہ کیا۔ دیکھتے ہی انھیں اس پر بہت ترس آ گیا۔ فرمایا کہ کل نواب نظام‌الدولہ کے دروازے پر حاضر ہو اور اپنے چوبدار کو تاکید کردی کہ جس وقت یہ شخص حاضر ہو مجھے فوراً خبر کی جائے۔ دوسرے دن حاجی محمد عبدالشکور آستانے پر حاضر ہوا، چوبدار نے خبر پہنچائی۔ نواب صمصام‌الدولہ نے نواب نظام‌الدولہ سے عرض کی کہ یہ حاجی عبدالشکور نامی ان تحصیل‌داروں کے زمرے میں ہے جن کے ذمے سرکاری مطالبہ باقی ہے، وہ حضور میں حاضر ہوا ہے۔ میر غلام‌علی (آزاد بلگرامی) نے مجھ سے کہا کہ ایک بار اس کو اپنے روبرو طلب کرلیجیے میں نے کہا کہ وہ محاسبہ‌دار عامل روبرو نہیں بلایا جاسکتا، خلاف ضابطہ ہے۔ میں نے بہت کچھ انکار کیا مگر میر صاحب نے مجھے نہ چھوڑا، مجبوراً میں نے اس کو اپنے روبرو بلایا۔ اب میں بھی حضرت سے صرف اتنی ہی عرض رکھتا ہوں کہ صرف ایک بار وہ شخص حضرت کے روبرو آجائے۔ نواب نظام‌الدولہ نے حکم فرمایا کہ حاضر ہو۔ جیسے ہی دروازے کے اندر وہ داخل ہوا اور نواب نظام‌الدولہ کی نظر اس کی ہیئت پر پڑی، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نوّے سال کا بڈھا بالکل جھکا ہوا دبلا پتلا ایک کرتا پہنے، سر پر سبز پگڑی، لاٹھی اور تسبیح ہاتھ میں لیے صورت بالکل ولیوں جیسی اور نہایت قابل رحم حاضر ہے۔ نواب نظام‌الدولہ نے اسے اپنے پاس طلب فرماکر پاس بٹھالیا۔ بہت سی باتیں پوچھیں اور اس کے فرد مطالبہ پر معافی لکھکر دستخط کردیے اور یومیہ وظیفہ مقرر کردیا۔ اپنی سرکار سے اسے سواری عنایت فرمائی اور رخصت کیا۔

یہ جو کچھ محاسن نواب صمصام‌الدولہ کے زیب بیان ہوئے ہیں یہ سمجھیے کہ مینہ کی ایک بوند اور سورج کی ایک جھلک ہے۔ اللہ تعالے ان مرحوم کو اپنی خاص رحمت سے نوازے اور ان کو بہشت بریں کی صدر جگہ مزین فرمائے۔

اولاد صمصام‌الدولہ کے چار بیٹوں کا پتہ چلتا ہے جن کے نام یہ ہیں: میر عبدالحی‌خاں۔ میر عبدالسلام‌خاں۔ میر عبدالنبی‌خاں۔ میر عبدالغنی‌خاں۔

آخری دونوں بیٹے باپ کی شہادت کے ہنگامے میں شہید ہوئے۔ پہلے دونوں محفوظ رہے اس وجہ سے کہ میر عبدالحی خاں کسی وجہ سے ایک روز پہلے باپ سے الگ کردیے گئے تھے، عبدالسلام کو بیمار ہونے کی وجہ سے خیمے سے نکال کر عمارت میں بھیج دیا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی زندگی تھی، اس لیے خدا نے دشمنوں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ باپ سے انھیں الگ کردیا جائے۔ مولانا بلگرامی کو ان دونوں کے محفوظ رہنے پر ایک عجیب دل‌چسپ نکتہ سوجھا گویا ان کے دل میں القا ہوا کہ "الاسماء تتنزل من السماء" کے مصداق اسم حی و سلام نے کام کیا اور ہرایک نے اپنے مسمّیٰ کو لیا۔ حی نے عبدالحی کو زندہ اور سلام نے عبدالسلام کو سلامت رکھا۔

ان چاروں فرزندوں میں سے میر عبدالحی کے حالات ملتے ہیں جو بہت دنوں زندہ رہے۔ انھوں نے سن تمیز کو پہنچ کر مدارس سرکاری میں علوم درسیہ کی تحصیل کی۔ فنون ادبیہ اور علوم عربیہ، حکمت عملی و حکمت نظری سب حاصل کیے۔ سنہ ۱۱۶۳ ھ میں منصب اور خانی کے خطاب سے سربلند ہوکر نواب ناصر جنگ ثانی کی طرف سے صوبۂ برار کی دیوانی اور محالات جاگیر کی متصدی‌گری پر مامور ہوئے۔ سلابت جنگ کے عہد میں اورنگ‌آباد کے ناظم رہے۔ نواب صمصام‌الدولہ کی شہادت کے بعد جب لشکر سرکار حیدرآباد گیا تو میر عبدالحی خاں کو بھی ہمراہ لے گئے اور عرصے تک قلعۂ گول‌کنڈہ میں نظر بند کرکے رکھا۔ میر عبدالسلام اپنی بیماری کی وجہ سے اورنگ‌آباد ہی میں رہے۔ انھیں قلعۂ دولت‌آباد میں بھیج دیا گیا۔ بہت دنوں تک یہ بےچارے بےکار اور بےیار و مددگار رہے۔

نواب امیرالممالک ملکی نظم و نسق کے لیے مچھلی بندر تشریف لے گئے تھے، ان کی واپسی پر حیدرآباد کے قریب یہ دونوں مصیبت‌زدہ بھائی ان سے ملے مگر کچھ کامیاب نہ ہوئے۔ آخر جب نواب آصف‌جاہ حسب سابق ولی‌عہدی کی مسند پر بیٹھے اور

ملکی و مالی معاملات کی باگ اپنے اختیار و اقتدار میں لی تو ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۱۷۲ھ کی پندرھویں کو میر عبدالحی خاں قلعۂ گولکنڈہ سے نکلوائے گئے ۔ گویا انھیں از سرنو زندگی بخشی ۔ میر عبدالحی خاں کا خطاب پہلے شمس الدولہ دلاورجنگ تھا ۔ قلعے سے نکلنے کے بعد صمصام‌الملک کا خطاب اور چھے ہزاری پانچ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا ۔ بےحد مورد الطاف و عنایات ہوئے ۔ صوبجات دکن کی دیوانی بھی عطا فرمائی اور رزم و بزم میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔ وہ شعر بھی کہتے تھے ۔ صارم تخلص تھا ۔ میر عبدالسلام خاں بھی حسب الحکم دولت‌آباد کے قلعے سے نکالے گئے اور اپنے گھروالوں کے ساتھ رہنے سہنے لگے ۔

انھیں میر عبدالحی خاں صمصام‌الملک نے اپنے باپ کی کتاب مآثرالامرا کی ترتیب اور تکمیل کی ہے ۔ « مقدمہ در فہرست کتاب » کے شروع میں لکھتے ہیں :-

« جاننا چاہیے کہ اس نسخے کے بانی کی قلم کے لکھے ہوئے چند ترجمے مسودات میں افراط و تفریط واقع ہو جانے کی وجہ سے ناقص تھے حتی‌المقدور ان کی تکمیل اور اصلاح کی کوشش کی گئی اور اس کے ختم ہونے پر ان لوگوں کے ناموں کی فہرست شامل کی گئی جن کے حالات اس کتاب میں مذکور ہیں اور جن ناموں کا اضافہ کیا گیا ہے ان کے نام کے بعد قاف (علامت الحاق) سرخ روشنائی و شنجرف سے لکھ دیا گیا ہے تا کہ تمیز ہوجائے کہ یہ حالات مرتب کے شامل کیے ہوئے ہیں ۔ نیز ان بزرگ کے اور مجھ‌ہیچ مداں کے بیان اور تحریر میں فرق و امتیاز معلوم ہوسکے[۱] ۔ یہ کام سنہ ۱۱۸۲ھ میں شروع کیا گیا تھا اور سنہ ۱۱۹۴ھ میں ختم ہوا اور اس کی تاریخ یہ ہے :-

زہے ادیب مصاحب مآثرالامرا

۱۱۹۴

پورا قطعہ دیباچۂ مآثرالامرا صفحہ ۵ جلد نمبر ۱ میں موجود ہے ۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے اس لیے اس پر طویل تبصرے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔

---

۱ صفحہ ۴۲ مآثرالامرا جلد اول ۔

بہارستان سخن نواب صمصام الدولہ شہنواز خاں کی دوسری تصنیف ہے جو ان کے علوم ادبیہ اور فنون شعریہ سے واقف اور ماہر ہونے کے زبردست دلیل اور فن شعر و ادب کے متعلق معرکہ آرا کتاب ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کس قابلیت کا انسان تھا۔ فارسی زبان میں فنون ادبیہ پر غالباً اس سے زیادہ جامع اور بسیط کتاب اور نہ ہوگی خاص کر اس کا نصف اول بہت وسیع معلومات کا حامل ہے۔ اس کتاب میں ۱۴ فصلیں ہیں۔ آخری فصل صرف نامور اور زبردست شاعروں کے حالات میں ہے اور یہ تقریباً نصف کتاب پر حاوی ہے۔ اس میں تقریباً ایک سو چالیس شاعروں کا تذکرہ ہے۔ فردوسی سے لے کر اب کے زمانے تک جو ممتاز شاعر گزرے ہیں، صرف انہیں کو لیا ہے۔ حالات حتی الامکان بسیط اور مفصل لکھے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انتخاب بہت اچھا دیا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ انہیں خود اپنی سخن فہمی کا دعویٰ تھا اور بجا تھا۔ خاص کر بیدل سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ متاخرین کے حالات قابل قدر ہیں کیوں کہ یہ ہندستان کی آخری تاریخ عہد مغلیہ کے بڑے مورخ تھے۔

نصف اول میں ۱۳ فصلیں ہیں۔ یہ فنون ادبیہ میں سے نظم و نثر وغیرہ کے متعلق ہیں؛ مثلاً، ۱ ابتدا ایجاد شعر۔ بیان کلام منظوم۔ ۲ فصل عروض۔ ۳ قافیہ۔ ۴ اقسام شعر۔ اداب انشا۔ ۵ صنائع بدائع۔ ۶ بلاغت و فصاحت۔ ۷ معما و لغز۔ ۸ علم انشا۔ ۹ آداب کتابت۔ ۱۰ خط و خطاطی۔ ۱۱ حروف، اعراب و نقاط، الفاظ۔ املا کا بیان اور اس کی تقسیم۔ ۱۲ قواعد لغت فارسی کے بیان میں۔ ان سب کا تعلق اگرچہ فارسی زبان سے ہے۔ لیکن اردو کے شعرا، ادیبوں اور خوشنویسوں کے لیے بھی بہت مفید و کارآمد باتیں ہیں جن کا جاننا ہر ادیب و شاعر اور انشاپرداز کے لیے ضروری ہے۔ غالباً اردو زبان میں بھی ہنوز کوئی جامع کتاب ان فنون پر نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ یہ نادر اور ضروری کتاب اب تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی اور پردۂ گمنامی میں رہی۔ اس کا ایک نسخہ حیدرآباد کے کتب خانۂ آصفیہ میں بھی ہے لیکن وہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

اس کی تصنیف کا مصنف کو کیوں خیال پیدا ہوا، اس کو دیباچے میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جس زمانے میں مجموعہ موائد الفوائد لکھ رہا تھا، (اس مجموعہ میں مسائل دینیہ، مسائل شرعیہ اور آداب و اخلاق کو مختصر طور پر بڑی بڑی کتابوں سے انتخاب کیا ہے تاکہ بڑی کتابوں کی ورق گردانی سے لوگوں کو نجات ہو) اس مجموعے میں ایک فصل جواز شعر پر میری قلم سے نکلی تھی اور چونکہ یہ قاعدہ ہے کہ بات سے بات نکل آتی ہے، اسی سلسلے میں مجھے اس فن کے بعض متعلقہ علوم؛ مثلاً، عروض، قافیہ، صنائع شعری اور کچھ اس کے متعلقات انشا و املا وغیرہ کے متعلق اور اسی کے ساتھ کچھ شعرا کے حالات لکھنا وقت کے لحاظ سے ناگزیر ہوگیا۔ یہ فصل اپنی متعلقہ فصلوں کے ساتھ ایک جداگانہ نسخے کے برابر ہوگئی۔ بعض سخن سنج عزیز دوستوں نے اس خیال سے کہ فارسی زبان کے جاننے والے جو شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں اس سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے، مشورہ دیا کہ اس سے پہلے کہ مجموعۂ موائد الفوائد تکمیل کو پہنچے، بہتر ہوگا کہ اس رسالے کو مرتب اور مکمل کردیجیے اس لیے کہ یہ رسالہ چمن شعر کا ایک انمول پھول اور اس چشمۂ فن کا ایک شیریں گھونٹ ہے۔ آخر ایسا ہی ہوا، اس کا نام بہارستان سخن رکھا گیا"۔ اس رسالے کا کوئی تذکرہ نہ مآثرالامرا میں خود مصنف نے کہیں کیا اور نہ ان کے فرزند میر عبدالحی صارم نے اپنے دیباچے میں، نہ مولانا آزاد نے اپنی تمہید اور مصنف کے سوانح میں کچھ حوالہ دیا، غرض کہ کہیں پتہ نہیں چلتا حالانکہ اس کتاب (بہارستان) میں نواب آصف جاہ کے حالات سنہ ۱۲ جلوس کے آغاز تک کے لکھے ہیں اور یہ ان کی دیوانی کے زمانے یا اس سے پہلے کے ہیں۔

موائد الفوائد | جس کا اوپر ذکر دیباچہ میں کیا ہے۔ یہ کتاب معدوم ہے۔ اس کے بارے میں اب تک کوئی بات ہمارے علم میں نہیں ہے۔

حالات نے اجازت دی تو آیندہ بہارستان سخن پر ایک مفصل مضمون رسالۂ اردو میں پیش کیا جائے گا۔

غالب کے متعلق سنہ ۱۸۶۸ع کا ایک انگریزی خط

(از ڈاکٹر سید سجاد صاحب - ایم - اے، پی ایچ - ڈی - استاد جامعہ عثمانیہ)

یہ خط جو ذیل میں بجنسہٖ طبع کیا جاتا ہے ہمیں دس بارہ سال پہلے دھلی کے ایک قدیم کتب‌خانے میں ملا تھا - دھلی میں شاید غدر سے پہلے سے اور اس کے بعد ایک انگریزی اخبار نکلتا تھا جس کا نام «مفصلائٹ» Mofussilite تھا - نہیں معلوم کہ اس کا ایڈیٹر کوئی انگریز تھا یا ہندستانی - ہمارے پاس اس کے دو بڑے بڑے اوراق کا ایک تاؤ ہے جس میں دیگر اخباری مواد کے سوا «کارس‌پانڈنس» کی سرخی کے تحت میں زیر بحث خط بھی چھپا ہے - اس کے لکھنے والے نے اپنے نام کو پردے میں رکھا ہے اور اصل نام کی بجائے لفظ Ixion لکھا ہے - خط کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ راقم‌الخط کوئی ہندستانی وکیل یا بیرسٹر تھا جو ذی‌علم اور فارسی‌داں بھی تھا - اس کے مضمون کا تعلق اس مقدمہ سے ہے جو ازالۂ حیثیت عرفی کے لیے مرزا غالب نے اپنے ایک مخالف کے خلاف دھلی کی عدالت میں دائر کیا تھا - «اکسیون» نے خط میں بعض اشارے ایسے کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خود یہ صاحب مرزا صاحب کی جانب سے مقدمہ میں بہ‌حیثیت گواہ پیش ہوئے تھے اور باوجود اس کے کہ وہ شہر کے معززین میں تھے ان کو کچھری کے حاکم کے روبرو معمولی آدمی کی طرح کھڑے ہوکر اپنا بیان دینا پڑا تھا - اس بات کی انھوں نے خط میں شکایت

بھی کی ہے بلکہ اس خط کو لکھ کر جو انہوں نے اخبار میں چھپوایا تو اس کی اصل محرک یہی شکایت ہے۔

اردوئے معلی کے حاشیہ میں کسی صاحب نے جو مقدمہ کے حالات سے بخوبی واقف معلوم ہوتے ہیں پنسل سے یہ الفاظ لکھے ہیں۔ "بمقدمۂ مرزا نوشہ و مولوی امین الدین" مگر مطبوعہ خط کے متن میں مولوی امین الدین کا نام درج نہیں ہے۔ مرزا غالب کو مستغیث لکھا ہے فریق ثانی کا نام ندارد ہے۔ تاہم اس خط کے آخری الفاظ "قاطع القاطع" اور اس کے قبل کے جملے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ استغاثہ "قاطع القاطع" کے مؤلف کے خلاف پیش کیا گیا تھا اور یہ مؤلف دراصل مولوی امین الدین تھے۔ قاطع القاطع کا ایک نسخہ ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ کتاب اس خط سے دو سال قبل سنہ ۱۸۶۶ء میں مطبع مجتبائی دہلی میں طبع ہوئی تھی۔ اس پر مصنف کا نام امین الدین امین لکھا ہوا ہے۔ شروع میں تین صفحے کا دیباچہ آتا ہے جس میں برہان قاطع اور اس کے مصنف کے متعلق کلمات ذیل مرقوم ہیں:—

"در تحقیق لغت فارسی و عربی و غیر آنہا محیط اعظم است
بے پایاں و سر دفتر فرہنگ است۔ نزدیک لغت آشنایاں
و جامع آں محمدحسین تبریزیست"

مولانا حالی مرحوم نے اصل لغت برہان قطع اور مرزا غالب کی قاطع برہان اور درفش کاویانی کی جامع بحث اپنی کتاب یادگار غالب میں بڑی خوبی اور بے لاگ طریق سے لکھی ہے اور اسی سلسلہ میں ان کتابوں اور رسائل کا ذکر کیا ہے جو مرزا صاحب کے رد میں لکھے گئے تھے لیکن یادگار کے صفحہ ۳۹ پر جب امین الدین اور ان کی کتاب کا نام آتا ہے تو اس مقدمہ کا جو خط ہذا کا موضوع ہے کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ مرحوم لکھتے ہیں:—

"مولوی امین الدین کی کتاب "قاطع القاطع" کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا کیونکہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا حضرت! آپ نے اس کا جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے کہا "اگر کوئی

گدھا تمہارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے؟"۔
لیکن اس مقام سے ڈیڑھ دو صفحہ آگے چل کر مولانا مرحوم نے اس قضیے کے سلسلے میں ایک مقدمے کا ذکر کیا ہے جس کی روئداد وہ اس طرح بیان فرماتے ہیں:—

"مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مؤلف پر جو قاطع برہان کے جواب میں لکھا گیا تھا اور جو فحش دشنام سے بھرا ہوا تھا ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخرکار انھوں نے راضی نامہ داخل کردیا۔ اثنائے تحقیقات میں دلّی کے بعض اہل قلم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لیے بلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوی کے ثبوت میں پیش کیے ہیں آیا فی الواقع ان سے فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں؟ انھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان فقروں کے ایسے معنی بیان کیے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔ ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا حضرت! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا:—

ہرچہ درنگری جز بجنس مائل نیست عیار بیکسئی من شرافت نسبی است

یہ مقدمہ داخل دفتر ہوگیا"۔

مولوی حالی کا لکھا ہوا یہ حال انگریزی خط کے ابتدائی اور آخری حصہ کے مطابق ہے، اس میں صرف امین الدین کے نام کی کسر ہے۔
بظاہر مولوی صاحب کو یہ خیال نہ رہا کہ گو مرزا غالب نے قاطع القاطع کا جواب نہیں لکھا لیکن اس کے مؤلف پر توہین کا مقدمہ چلایا تھا۔

یہ امر دلچسپ ہے کہ مولوی حالی نے اپنے اوپر کے بیان میں جن "اہل قلم" کی طرف اشارہ کیا ہے جو قاطع القاطع کے ہتک آمیز الفاظ اور اقتباس پر شہادت کے لیے عدالت میں طلب کیے گئے تھے ان میں سے چھ مشہور اشخاص ہمارے اس خط میں نام بنام بیان کردیے گئے ہیں۔ ان میں یہ چار غالب کے طرفدار تھے:—

(۱) لالہ پیارے لال، ہیڈ ماسٹر دھلی نارمل اسکول اور سکریٹری دھلی لٹریری سوسائٹی (یہ ہمارے صوبوں کے بزرگ گزرے ہیں۔ سنہ ۱۸۶۳ء میں دھلی سے لاھور جانے لگے تو غالب نے لکھا تھا "بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں ہے" ماسٹر صاحب کا نام ابھی دھلی کے تعلیم یافتہ طبقہ میں اب تک مشہور ہے)

(۲) حافظ احمد حسن، فرسٹ اورینٹل ماسٹر دھلی کالجیٹ اسکول[2]۔

(۳) مولوی نصیرالدین، فرسٹ اورینٹل اینڈ متھمیٹکل ماسٹر دھلی نارمل اسکول۔

(۴) حکم چند، دھلی کے مشہور مضمون نگار اور فارسی کے عالم۔

اور دو صاحب غالب کے مخالف تھے۔ یعنی:-

(۵) مولوی ضیاءالدین (ان مرحوم کو سر ولیم میور کی تحریک پر غالباً ڈبلن یونیورسٹی سے ڈاکٹر کا اعزازی خطاب ملا تھا) اسسٹنٹ پروفیسر عربی دھلی کالج۔

(۶) مولوی سدیدالدین، سابق پروفیسر عربی، دھلی کالج۔

انگریزی عبارت کی دوسری سطر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار مفصلائٹ میں اس خط سے قبل غالب کے مقدمے کی کوئی اور چیز بھی چھپی تھی۔ اسی طرح اواخر خط میں مسٹر اکیسون نے بعد تصفیہ مقدمہ پوری مسل شایع کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اگر دھلی میں یا دھلی سے باہر کسی صاحب کے پاس اس اخبار کے کچھ پرچے ہوں تو ان میں اس مقدمے کی مزید کیفیت تلاش فرمائیں۔

انگریزی اخبار کا اصل مضمون حسب ذیل ہے:-

---

۱ ماسٹر پیارے لال اور ڈاکٹر ضیاءالدین کے ضروری حالات کے لیے "مرحوم دھلی کالج" مصنفۂ مولوی عبدالحق صاحب ملاحظہ کی جائے۔

۲ کالجیٹ اسکول - ھائی کالج اور دھلی کالج کے ناموں سے پایا جاتا ھے کہ اس زمانے میں دلی میں تین تین کالج تھے۔

CORRESPONDENCE.

Our columns are open to all but we do not hold ourselves responsible for anything that appears in our correspondence.-Ed. Mof.

TO THE EDITOR OF THE MOFUSSILITE.

Dear Sir,

You have, I observe, in your issue of the 30th instant taken notice of the libel case now under inquiry before the Assistant Commissioner, Delhi, in which Mirza Asudullah Khan alias Mirza Nausha Ghalib, the most celebrated Persian scholar and the poet Laureate of India, is plaintiff.

The following are some further particulars relating to the same; they will, I hope, be interesting to your readers and expose at the same time the acts of injustice to which people in the Punjab are subject. The small army of Maulavis and Munshis, alluded to in your issue, consists of Lala Piyare Lall, Headmaster Delhi Normal School and Secretary Delhi Literary Society; Hakim Latif Husain first Oriental Master Delhi Collegiate School, and Maulavi Nasiruddin, first Oriental and Mathematical Master, Delhi Normal School; Hookum Chand, the famous Essayist and Persian scholar of Delhi. Maulavi Ziyauddin, Assistant Professor of Arabic, High College; and several others of less note. The first four gentlemen approved as witnesses on the part of the plaintiff, the rest on that of Defendant. The evidence for prosecution was taken on Monday the 20th intant: of the witnesses for the defence; only one, Maulavi Ziyauddin, was examined on Tuesday, when a curious instance of partiality was shown him by the court. Some interested party, said to be an awurda, of the presiding Magistrate, whispered in his ear that Maulavi Ziyauddin was the most respectable and learned of all the witnesses, and requested the Magistrate to give him a chair, *on the dais next to himself, while taking his evidence.* This was done, although a practice followed nowhere but in the court of the Assistant Commissioner, Delhi. As far as my knowledge of law and the practice of Indian Courts, is, no witness, ever so respectable, can be allowed to remain seated while giving his deposition, "Nek Hairanam vo sakht parishan." What rule does the Assistant Commissioner observe in that respect. The witness, to whom injustice and a gratuitous insult has been offered, by this concession to Maulavi Ziyauddin, holds a very respectable position in Society, was honoured with a seat at the Durbar of His Honour the Lieutenant Governor of the Punjab and took precedence of the gentleman to whom such marked favour has been shown; and although not a very good Persian scholar, he is in every other respect deserving of greater consideration.

I refrain at present giving you the evidence so far as it has been recorded, since the case will be resumed on Monday next. As soon as the evidence is concluded and judgement delivered, I will furnish you with the whole *missul* for publication.

In conclusion I would suggest that the opinion of Major Lees or any other European Orientalist be taken as to the proper interpretation of the defamatory passages printed and published in the work entitled the "Qateh-ul-Qateh." (Sic.)

Yours truly,
IXION.

March, 1868

تاج محل

[سکندر علی وجد بی اے (عثمانیہ) ایچ، سی، ایس]

اے سجدہ گاہ حسن ترا فیض عام ہے　دریوزۂ مہر و لطف رواں صبح و شام ہے
تو دستبرد وقت کی ہیبت سے بے پناہ ہے　فانی زمیں پہ نقش بقائے دوام ہے
جادو نگاہ عشق کا پتھر پہ چل گیا
الفت کا خون قالب مرمر میں ڈھل گیا

گو زیب باغ تو ہی دل خونناب سر ہے　اس باغ بے‌خزاں میں ہمیشہ بہار ہے
پیری پس عقب قلب صفت بیقرار ہے　جمنا ترے شباب کی آئینہ دار ہے
ہمت ہے تیری دلکشی بے پناہ کی
گنبد پہ کانپتی ہے کرن مہر و ماہ کی

یہ زرد و نرم دھوپ یہ پر کیف وقت شام　کندن بنے ہوئے در و دیوار و سقف و بام
خورشید کر رہا ہے تجھے آخری سلام　وہ قلب شرق چیر کے نکلا مہ تمام
جونہی رواں سفینۂ مہتاب ہو گیا
تو موج خیز قلزم سیماب ہو گیا

بہزاد عصر ہیں تری گلکاریوں پہ دنگ　ہے رو کش عروس چمن ہر جبین سنگ
کلیوں کا وہ نکھار، وہ کھلائے رنگ رنگ　فانوس شمع کشتہ سے لپٹے ہوئے پتنگ
رنگینیاں ہیں جوہر اہل کمال کی
چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی

تو نقش آرزو ہے مجسم زمین پر　آنکھوں نے تیرے حسن کی مے پی ہے اسقدر
اک سرخوشی ہے قلب میں سرشار ہے نظر　بیٹھا ہوں پائے وقت کی آہٹ سے بے خبر
لرزاں قدم قدم پہ سکون حیات ہے
تیری حریم ناز میں دن ہے نہ رات ہے!

تبصرے

تبصرے

ادب

آب حیات کے لطیفے

تذکرۂ آب حیات میں شعرا کے جو قصے اور لطیفے جا بہ جا آ گئے ہیں، حضرت مصنف مرحوم کے پوتے آغا محمد اشرف صاحب ایم اے، نے مندرجہ بالا عنوان سے ان کو یکجا کرکے چھاپ دیا ہے۔ قصوں کے پرلطف و رنگین بنانے میں آزاد مرحوم کو خاص ملکہ حاصل تھا اور ان کے حسن بیان کے یہ نمونے ہماری ادبیات عالیہ میں شامل ہیں لیکن ان کو جمع کرنے کے ساتھ محمد اشرف صاحب نے اپنے بھائی محمد باقر صاحب کا ایک مضمون بھی جو آزاد مرحوم کے حالات پر لکھا گیا اور اورینٹل کالج میگزین میں بطور ضمیمہ چھپا تھا، اس مجموعے میں شریک کردیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ لاہور میں جہاں ضروری اور غیر ضروری سبھی طرح کی چیزیں اس کثرت سے چھپتی رہتی ہیں، مولوی محمدحسین آزاد کی کوئی سوانح‌عمری جو ان کی شایان شان ہوتی، شائع نہیں ہوئی، لیکن اب جب خود مرحوم کے پوتے ادبی خدمت کا شوق اور پاکیزہ علمی ذوق رکھتے ہیں، امید رکھنی چاہیے کہ آزاد کی نظم و نثر کا مجموعہ اور ان کی مفصل سوانح کے چھپنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ زیر تبصرہ کتاب چھوٹی تقطیع کے پونے دو سو صفحات پر بہت اچھی مجلد شائع ہوئی ہے اور سوا روپیہ قیمت میں تقریباً سستی ہے۔

شیخ مبارک علی تاجر کتب، لوہاری دروازہ، لاہور سے طلب کی جائے۔ (ه)

سیرت اقبال

تصنیف مولوی محمد طاہر صاحب فاروقی، صدر شعبہ فارسی و اردو آگرہ کالج۔ شایع کردہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور۔ ع: «بگو کہ سیرت اقبال، دولت باقی» سے تاریخ تصنیف ۱۳۵۷ برآمد ہوتی ہے اور ممکن ہے اسی سے کتاب کا نام سیرت اقبال تجویز کیا گیا ہو۔ ضخامت ۴۳۸ صفحات کی اس مجلد میں اقبال کے ذاتی حالات صرف ۶۹ صفحات میں آگئے ہیں۔ ان میں بھی کوئی ایسی تفصیل یا خاص معلومات نہیں ہیں جو اخبارات و رسائل میں شایع نہ ہو چکی ہوں، لیکن تصنیف کا مقصد خود فاضل مصنف نے تعارف میں تحریر فرما دیا ہے کہ اب تک کوئی ایسی تصنیف شایع نہیں ہوئی جسے پڑھ کر علامہ کی تعلیمات کا خاکہ ذہن میں آجائے اور جو قارئین کو اقبال کی کتابوں کے مطالعے کی جانب رہنمائی کرسکے۔ میں نے اس مقصد کو سامنے رکھ کر سیرت اقبال لکھی ہے۔

مصنف نے یہ مقصد ایک عقیدت مند مدّاح بن کر پورا کیا ہے، اقبال کا مرتبہ ان کی نظر میں یہ ہے

«اقبال بے شبہ اس عصر کے واحد «مصلح اور مجدّد» تھے۔ وہ غزالی و رازی بھی تھے، عطار و سنائی بھی، سعدی و رومی بھی، حالی و اکبر بھی اور میر و غالب بھی۔ تصوف و حکمت، عشق و موعظت، اثر و رجائیت اور اصلاح و مجددیت کا یہ اجتماع دنیائے ادب کی اس خاتم الشعرا ہی کے لیے محفوظ رکھا گیا تھا» (صفحہ ۱۳۹)۔

تغزل کے عنوان کے نیچے لکھتے ہیں: (صفحہ ۴۱۵) «قدیم و جدید اساتذہ کے دواوین کو دیکھیے۔ ان کے دیوانوں کے ہزاروں ورق الٹ جائیے تب کہیں ان کے تیر و نشتر دستیاب ہوتے ہیں۔ ابتدا سے لے کر اب تک ایسے باکمال صاحبان ذوق غزل گو جن کے منتخبات میں بھرتی کے چند شعر بھی مشکل سے ملیں اور سارے کا سارا کلام انتخاب ہو صرف پانچ نظر آتے ہیں :- خواجہ میر درد، مرزا غالب، علامہ اقبال، حسرت موہانی اور فانی بدایونی»۔ لفظ «منتخبات» سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید

فاضل مصنف کو لکھتے لکھتے اپنے مبالغے پر خود تنبہ ہوا ہے۔ پھر بھی اقبال کو عطّار و رومی سے بھڑانا یا مجدّد وقت قرار دینا جو مسلمانوں میں ایک اصطلاحی معنی رکھتا ہے ''مریداں می پرانند'' کا مصداق معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے واقعی فضائل بھی کچھ کم نہیں ہیں کہ فرضی محاسن سے ان کی آرائش کی جائے۔ پوری کتاب اسی قسم کے والہانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ مرحوم کی جملہ تصانیف کا ۲۰ صفحات میں تعارف کرانے کے بعد آخر میں کوئی ڈھائی سو صفحات کا ''تبصرہ'' کیا گیا ہے جس میں ان کی تعلیمات عالیہ کی مختلف عنوانات میں تقسیم اور ہر عنوان پر منتخب اشعار کا اقتباس دیا گیا ہے۔ بعض جگہ یہ اقتباسات فاضل مصنف کی شرح سے بھی زیادہ طولانی ہوگئے ہیں اور ان کے برمحل ہونے میں بھی گفتگو کی گنجائش نکل آئی ہے۔ بایں‌ہمہ ہمارے خیال میں یہ کتاب طلبہ کے لیے ضرور مفید ہوگی۔ اس کی کتابت و طباعت نیز جلد بندی اعلی درجے کی ہوئی ہے اور ان سب خوبیوں کے لحاظ سے تین روپے آٹھ آنے میں کچھ زیادہ گراں نہیں معلوم ہوتی۔ (ن)

قتیل اور غالب

مرزا غالب مرحوم سوائے امیر خسرو کے اور کسی ہندی‌نژاد کی فارسی‌دانی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اسی کے ساتھ اپنی فارسیت پر بھی ناز تھا حالانکہ خود تورانی نژاد اور ہندستان ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ہندستان کے فارسی ادیبوں میں جن سے مرزا صاحب سخت ناراض تھے، ایک قتیل مرحوم ہیں جو فریدآباد (قریب دھلی) کے ایک روشناس کھتری یا کایستھ خاندان کے فرد اور بعد میں مسلمان ہوکر لکھنؤ جا بسے تھے۔ ان کے شاگرد اور ماننے والے مشرقی ممالک میں بہت تھے اور مرزا کو کلکتے کے زمانۂ قیام میں ان لوگوں کے ساتھ جو مناقشے کرنے پڑے وہ کافی شہرت رکھتے ہیں، لیکن مرزا نے ایک فاضل شخص کی مرنے کے بعد جو کچھ توہین کی ہو، وہ اس کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی جو اب قتیل مرحوم کے ایک پرجوش

ہم‌وطن نے مرزا غالب کی مذمت کی ہے۔ مندرجہ عنوان رسالے کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ ان اعتراضات کا جواب دیا جائے جو غالب نے قتیل پر کیے تھے لیکن لائق مصنف (سید اسدعلی صاحب انوری فریدآبادی، بی‌ایس‌سی، علیگ) نے شروع میں غالب کے ذاتی اخلاق و حالات کی جو بحثیں چھیڑدی ہیں، آدھی کتاب ان ہی سے سیاہ ہے۔ انوری صاحب کا یہ خیال کہ لوگوں نے غالب کو بت بنا رکھا ہے اور ان کی ہر بات کو تقدس و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، لائق اصلاح ہے۔ مذہب غالب پرستی کے سب سے بڑے مقتدا بجنوری مرحوم نے بھی ان کی صرف شاعری کے معجزات بیان کیے ہیں ذاتی عصمت و بزرگی سے کچھ واسطہ نہیں رکھا۔ بےشبہ یادگار غالب میں مولوی حالی مرحوم نے شاگردانہ عقیدت‌مندی اور کچھ اس اخلاقی تعلیم کی بنا پر کہ اپنے مردوں کا ذکر بھلائی سے کرو، غالب کی زندگی کے صرف اچھے پہلو پیش کیے ہیں لیکن اس پر کسی کو اتنا بگڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ اب تصویر کے صرف برے خال و خط کو چن چن کے دکھائے۔

لائق مصنف کو مرزا غالب کے مقابلے پر صرف آٹھ اعتراضات مل سکے اور ان کی اس رسالے میں بہت خوبی اور قابلیت سے تردید کی گئی ہے بلکہ ایک اعتراض جس کی صحت کو انوری صاحب نے تسلیم کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ بھی مرزا غالب کی زبردستی ہے۔ قتیل کا شعر ہے:

یک وجب جائے بکوئے تو ز خوں پاک نبود
کشتہ بر کشتہ بسی بود دگر خاک نبود

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ یہ "خاک نبود" "خاک بھی نہ تھا" کا ترجمہ ہے اور فارسی محاورے کے خلاف اور غلط ہے لیکن جیساکہ انوری صاحب نے خود بھی ایک جگہ خیال ظاہر کیا ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ کوئے یار میں ذرا سی جگہ بھی خون سے پاک نہ تھی اور سوائے کشتوں کے وہاں کوئی چیز حتیٰ کہ خاک بھی نہ رہی تھی۔

بہرحال کتاب محنت و تلاش سے لکھی گئی ہے اور اہل ادب کے لیے دلچسپی

کا سرمایہ ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۳۰ صفحات اور اچھے کاغذ پر صاف ستھری چھپی ہے اور مکتبہ جامعہ، دہلی سے آٹھ آنہ قیمت پر ملتی ہے۔ (ہ)

ارمغان باز

یہ تراب علی خاں صاحب بازؔ حیدرآبادی کے منتخب کلام کا مختصر مجموعہ ہے۔ بازؔ صاحب حیدرآباد کے نوجوان اور اچھے کہنے والے شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ شاعری پرانے طرز کی ہے۔ نئے شعرا کی تقلید میں بھی دو ایک نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ زبان کہیں کہیں دکنی اور شمالی ہندستان کے محاورے کے خلاف لکھتے ہیں۔ مشق اور مطالعے کے علاوہ اگر بازؔ صاحب خود اپنے ادنیٰ اور اعلیٰ کلام میں امتیاز سے کام لیں تو ہمیں امید ہے کہ وہ شاعری میں نام پیدا کرسکیں گے۔ ہمارے خیال میں خود ان کا تخلص متین شعرا کے لیے کچھ بہت موزوں نہیں ہے۔ کتابچے کی قیمت چار آنے اور حضرت مصنف کا پتہ:

کاشانۂ باز، بازار گھانسی میاں، (حیدرآباد دکن) تحریر ہے۔ (ہ)

مضامین محمد علی

مولوی محمد سرور صاحب بی۔اے، استاد جامعہ ملیہ نے اس مجموعہ میں مولانا محمدعلی مرحوم کے تقریباً ستر مضمون جو مختلف ایام میں اخبار «ہمدرد» میں چھپے، خاصی ضخیم کتاب کی صورت میں مرتب کردیے ہیں۔ شروع میں ایک مختصر مقدمہ میں فاضل مرتب نے کتاب کا مقصد یہ بتایا ہے کہ پڑھنے والے اس آگ کی حقیقت سمجھیں جو قومی اور ملی زندگی کے اس نمائندے اور قائد کے سینے میں بھڑک رہی تھی۔ ان کو یقین ہے کہ «ملت کے خزاں دیدہ چمن کے اس دور میں «قافلۂ بہار» کے ہدی‌خواں محمدعلی کی صدائیں ہمارے لیے بانگ‌درا کا کام دے سکتی ہیں۔ مضامین مختلف عنوانات میں تقسیم ہیں۔ جیسے «آپ‌بیتی»، «مسائل ملی»،

"مسلمان اور کانگریس" وغیرہ۔ جامعہ ملیہ دھلی پر جو مضامین ھیں ان میں ایک جگہ اس ادارے کا مقصد یہ بتایا گیا ھے کہ اگر پھر کبھی میدان بدر کی فوج درکار ھو تو یہ مدرسہ ۳۱۳ جاں‌باز مجاھدین فراھم کردے۔ (صفحہ ۳۹۲)۔ لیکن اب جب کہ جامعہ کا مسلک "اھمسا" اور اس کے پیشوا مہاتما گاندھی تسلیم کرلیے گئے ھیں' اس قسم کی مضامین اور متروک مقاصد کی اشاعت جامعہ ملیہ کی طرف سے موزوں نہیں معلوم ھوتی۔ یوں بھی مولانا محمدعلی مرحوم ذھانت و قابلیت کے علاوہ جوش جذبات کا مزاج دریا تھے اور ان کی طغیانی میں بعض اوقات کسی محل و مصلحت کی پروا نہ کرتے تھے۔ مرتب کو زیادہ احتیاط سے انتخاب کا موقع حاصل تھا۔ بہر حال مرحوم کی اخباری انشاپردازی کی ایک اچھی یادگار تیار ھوگئی اور امید ھے کہ ان کے عقیدت‌مندوں میں مقبول ھوگی اور سیاسات ھند کے طلبہ اس سے بخوبی استفادہ کر سکیں گے۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۵۹۰ صفحات پر مجلد اور مولانا مرحوم کی تصویر کے ساتھ شایع ھوئی ھے اور ڈھائی روپیہ قیمت میں مکتبہ جامعہ' دھلی سے دستیاب ھو سکتی ھے (ا)

تاریخ و تذکرہ

شاہ نعمت‌اللہ ولی

یہ بزرگوار اپنے قصیدے یا قصیدوں کی وجہ سے جن میں قیامت تک کی پیشین‌گوئیاں بیان کی جاتی ھیں' ھندستان میں بھی خوب شہرت رکھتے ھیں۔ حلب میں پیدا ھوئے اور آخر زمانہ قصبہ ماھان (علاقہ کرمان) میں گزرا۔ سو سال سے کچھ زیادہ عمر پا کر سنہ ۸۳۴ھ میں رحلت کی اور وھیں مدفون ھوئے۔ بعض عقیدت‌مندوں نے شاید ان کی پیشین‌گوئیاں سن کر زندگی ھی میں مہدی موعود بھی سمجھ لیا تھا مگر حضرت شاہ نے خود اس کی تردید فرمادی۔ شاہ کے اصلی حالات

اور کلام پر خوش اعتقادی اور افسانہ پسندی نے بہت سے رنگین پردے ڈال دیے ہیں اور ان کے قصیدے میں تو خواہی نخواہی کچھ اسی اہتمام سے تعریفیں کی گئی ہیں جیسے توراۃ و انجیل میں۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ کتنی ہی بگاڑی جائے، شکر ہے کہ مٹائی نہیں جاسکتی۔ شاہ نعمت اللہ ولی کے حالات بھی خود ان کی تصانیف کے علاوہ ہم عصر تواریخ و تراجم سے جمع کیے جاسکتے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ محمد حفیظ صاحب نے اس خدمت کو محنت و شوق سے انجام دیا اور گو ان کی رسائی براش میوزیم کے بعض نادر مخطوطات تک نہیں ہوسکی تاہم جو کچھ مواد مل سکا اسے ناقدانہ نظر سے پرکھا اور شاہ کے حالات میں یہ اردو رسالہ مرتب کیا جس میں ان کی سیرت اور سوانح کے علاوہ پیشین گوئی والا قصیدہ اور فارسی کا اور کلام بھی شامل کردیا ہے اور قصیدے کی صحت پر دلچسپ و پرمغز بحث لکھی ہے۔ جن حضرات کو شاہ نعمت اللہ ولی کے حالات اور اس قصیدے سے دلچسپی ہو ان کے مطالعہ کرنے کے قابل ہے۔ کتاب کی ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت مع محصول ڈاک ۱۴ آنے پیشگی بنام راج نرائن سنگھ صاحب درگاہ شاہ ارزاں، ڈاک خانہ مہندرو، پٹنہ کے پتے سے بھیجنے پر دستیاب ہوسکتی ہے۔ (ہ)

افسانۂ پدمنی

سلطان علاءالدین اور پدمنی کے افسانے کو سب سے پہلے ملک محمد جائسی نے ایک مستقل نظم کی صورت میں لکھا اور اپنی ہندی مثنوی کا نام "پدماوت" رکھا جو ہندستان کے ادبیات عالیہ میں شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ اب اس کی پرانی ہندی کو سمجھنے والے صرف مدرسوں اور کتب خانوں میں مل سکتے ہیں، لیکن مصنف نے جو ایک عارف باللہ صوفی بھی مانے جاتے ہیں، اپنی کہانی کے آخر میں خود یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ قصہ محض تمثیل ہے اور اس میں چتوڑگڑھ سے مراد خود انسان کا جسم اور وہاں کا راجا رتن سین، نفس ناطقہ یا جان ہے، سنگل دیپ سے تلمیحاً دل اور

پدمنی رانی سے عقل سلیم مراد ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہایں‌ہمہ فرشتہ نے جس کا ادبی ذوق کبھی کبھی تاریخی دراست پر غالب آجاتا ہے اس قصے کو تاریخ میں جگہ دی اور چونکہ اس میں ایک مسلمان بادشاہ کے اخلاق پر حرف آتا ہے، لہذا کرنل ٹاڈ نے بڑے شوق سے اور مصنوعی کاغذوں کے حوالے سے اسے اپنی کتاب "وقائع راجستان" کی زینت بنایا۔ مصنف "قصص ہند" کو ایسا مسالا کہاں ملے، انھوں نے اسے اردو میں نمک مرچ لگا کر پیش کر دیا۔ مگر افسوس ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب جنھوں نے امیر خسرو کی خزائن الفتوح کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اس افسانے کو تاریخی اور عقلی اعتبار سے غلط محض سمجھنے کے باوجود ایک جگہ یہ بھی لکھ گئے کہ شاید چتوڑگڑھ کے قلعہ میں واقعی کوئی پدمنی موجود تھی! یہ ہمارے اس قومی انحطاط کی ایک نظیر ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ محض غیر مسلموں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اپنے گزشتہ اکابر کی تعریض و تنقیص کرنے میں کسی دیانت و معقولیت کی بھی پروا نہیں کرتے۔ شاید زیادہ تر اسی جماعت کی اصلاح خیالات کے لیے، خوشی کی بات ہے کہ ہمارے فاضل دوست مولوی محمد احتشام‌الدین صاحب حقی دہلوی نے اس موضوع پر چند محققانہ مضامین لکھے اور اب ان میں مناسب ترمیم اور اضافے کرکے مستقل کتاب کی صورت میں شایع کردیا جس میں مثنوی پدماوت، فرشتہ کی تحریر اور ٹاڈ وغیرہ کے مفتریات کی تفصیل سے قلعی کھولی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ ساری داستان تاریخی اعتبار سے کوئی وقعت اور اصلیت نہیں رکھتی۔ لائق مصنف کا استدلال جس‌قدر مضبوط و محکم ہے، طرز بیان بھی ویسا ہی پرقوت اور منشیانہ ہے اور تاریخ ہند کے طلبہ سے بڑھ کر ادبی ذوق رکھنے والوں کے واسطے یہ رسالہ مطالعہ کے قابل ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۴۸ صفحات پر صاف ستھرا چھاپا گیا ہے اور ایک روپیہ قیمت میں جناب مصنف سے ترامھ بہرام خاں، دہلی کے پتے سے دستیاب ہوسکتا ہے۔ (ہ)

نئے رسالے

انجمن

انجمن اسلامیہ ھائی اسکول، جبلپور کے طلبہ نے انجمن کے نام سے ایک سہ ماھی رسالہ جاری کیا ھے جس میں زیادہ‌تر اس مدرسے کے طلبہ ھی مضمون لکھا کریں گے۔ یہ مقصد بہت مفید ھے اور پہلے پرچے میں جو مضامین چھاپے گئے ھیں وہ بھی دلچسپ اور طلبہ کے مناسب حال ھیں۔ ھمیں بڑی خوشی ھوئی کہ مضامین کی زبان عام طور پر اچھی اور شستہ ھے۔ امید ھے کہ لائق اساتذہ خصوصاً صدر انجمن محمد عبدالستار صاحب کی سرپرستی اور صدر مدرسہ مولوی عطاءالرحیم صاحب کی نگرانی میں جو جبل‌پور کی انجمن ترقی اردو کے بھی صدر ھیں یہ رسالہ اور زیادہ ترقی کرےگا۔ اس کی قیمت درج نہیں ھے لیکن ھمارے خیال میں جبلپور کے باھر بھی طلبہ اسے منگائیں تو پڑھ کر خوش ھوں‌گے۔ اس غرض سے صدر مدرس صاحب موصوف سے مراسلت کرنا مناسب ھوگا۔ (ہ)

رفیق نسواں

جریدہ زار لاھور سے عورتوں کا یہ نیا رسالہ حمیدہ خانم صاحبہ کی ادارت اور باجی رشیدہ لطیف صاحبہ کی سرپرستی میں نکلنا شروع ھوا ھے۔ مدیرہ کے والد طالب‌علی صاحب پابند قریشی، پہلے سے رسالہ تعلیم نکالتے ھیں۔ انھوں نے "عرض حال" سے نئے رسالے کا آغاز فرمایا ھے مگر یہ بات دوسرے نمبر کے دیکھنے سے معلوم ھوئی کہ "یہ رسالہ اخلاقی، اصلاحی اور علمی" ھوگا اور اس میں "کوئی نظم، افسانہ یا مضمون، عریاں جذبات یا محسوسات سے ملوث نہ ھوگی"۔ مقصد تو بہت خوب ھے مگر رسالے کو کامیاب بنانے کے لیے محنت اور قابلیت کی بہرحال ضرورت ھوگی۔ پہلے پرچے میں ایک نظم "جام صہبا" درج ھے اور اس میں محبت کی تعریف میں

دو چار عاشقانہ شعر بھی نکل آئے ہیں ۔ ان افسانوں یا مضمونوں کا تو مضائقہ نہیں جو "ماخوذ" ہیں لیکن خود فاضلہ مدیرہ کا افسانہ "موتیوں کا ہار" دیکھ کر ہمیں تعجب ہوا کہ بالکل اسی مضمون کا قصہ چند سال پہلے غالباً تہذیب نسواں میں چھپا تھا۔ رسالے میں زبان کی بھی غلطیاں نظر آئیں ۔ امید ہے کہ اس کی اصلاح پر توجہ فرمائی جائے گی ۔ حجم ۶۰ صفحہ ۔ لکھائی چھپائی متوسط ۔ قیمت سالانہ تین روپے ۔ پتہ: موہنی روڈ ۔ لاہور ۔ (ہ)

خاص نمبر

منزل

(افسانہ نمبر)

یہ رسالہ محلہ بلّی ماراں دہلی سے نکلتا ہے اور یہاں کے مشہور خاندانی اطبا کی مدح و ثنا، تصاویر، ادویہ کے اشتہارات (جن میں بعض فحش ہیں) دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے ان حضرات کی سرپرستی حاصل ہے ۔ اس خاص نمبر میں چند افسانے اور نظمیں شامل ہیں ۔ نوجوان اڈیٹر حبیب اشعر صاحب کی تصویر بھی زیب سرورق ہے ۔ رسالے کا "بدل اشتراک" یعنی قیمت سالانہ دو روپیہ اور فی پرچہ ساڑھے تین آنہ ہے ۔ (ہ)

ادب لطیف

(افسانہ نمبر)

اس خاص نمبر میں چند مضمون افسانہ نگاری پر دو منظوم قصے اور کوئی اٹھارہ چھوٹے بڑے افسانے جمع کیے گئے ہیں ۔ حکیم احمد شجاع صاحب اور ناکارہ حیدرآبادی کے ظرافت آمیز فسانے ہمیں پسند آئے ۔ بعض دوسرے افسانے بھی پر لطف ہیں مگر ان میں زیادہ تر یورپی تمدن و تہذیب کے نقشے نظر آتے ہیں ۔ افسوس ہے کہ اس مصنوعیت کا اثر زبان اور طرز تحریر پر بھی پڑے بغیر نہیں رہا حالانکہ لائق مدیر نے اہتمام

[illegible] جمع کیے جائیں ۔ مجموعی طور پر
پرچہ دلچسپ ہے ۔ لکھائی چھپائی اچھی اور قیمت [illegible] آنے ۔ ۱۰ سرکلر روڈ لاہور
کے پتے سے مل سکتا ہے ۔ (ب)

نیرنگ خیال

(حرب و ضرب نمبر)

چھوٹی تقطیع کے ۲۰۸ صفحات پر شایع ہوا ہے اور اس میں چالیس مضامین شامل ہیں ۔ جنگ، مختلف ممالک کی جنگی تیاریاں، بڑی طاقتوں کے ساز و سامان وغیرہ موضوعات پر بہت سی مفید معلومات جمع کی گئی ہے لیکن مضامین کا علمی معیار اخبارات کے مضامین سے کچھ بہت اونچا نہیں ہے ۔ رسالے کا کاغذ بھی ادنیٰ درجے کا ہے ۔ قیمت آٹھ آنے ۔ پتہ: بیڈن روڈ، لاہور ۔ (ہ)

معین

(عرس نمبر)

معین ہفتہ‌وار اخبار ہے جو اجمیر سے شایع ہوتا ہے اور خواجہ صاحب کے نام پر اخبار کا نام رکھا ہے ۔ عرس کے موقع پر اس کا ایک عرس نمبر شایع کیا گیا ہے جو خاصا ضخیم ہے ۔

اس نمبر میں مختلف صاحبوں نے حضرت خواجہ صاحب کے حالات زندگی، ان کی تصانیف، ان کے مشن اور تبلیغ، روحانی کمالات اور اقوال پر مضامین لکھے ہیں ۔ عقیدت‌مندوں کے لیے اچھا مجموعہ ہے ۔ (ا)

تنقیدات عبد[illegible]

یعنی

اردو کے محسن اعظم ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو (ہند) کے بعض دلچسپ و پرمغز تنقیدی کا مجموعہ۔ تنقید ادیب کی جان ہوتی ہے اور اس کا [illegible] بے راہ روی سے بچاتا اور خیال میں وسعت پیدا کرتا ہے لیکن جناب مولوی صاحب کی تنقید اپنی علمیت اور لطف بیان دونوں اعتبار سے خاص امتیاز رکھتی ہے۔ دوسرے اس مجموعے میں تنقیدیں بھی وہ انتخاب کی گئی ہیں جو بجائے خود علمی تحقیقات کے [illegible] ہیں اور جن سے بعض مدعیان فضیلت کے مبلغ علم و تحقیق کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے [illegible] ڈاکٹر گریہم بیلی صاحب (لندن یونیورسٹی) کی کتاب اردو لٹریچر پر مولوی احمدالدین صاحب کی کتاب سرگزشت الفاظ پر۔ پوری کتاب ارباب ذوق اردو ادب کے طلبہ کے پڑھنے کے لائق ہیں۔

تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم اسی صفحے، قیمت صرف آٹھ آنے۔

اِخوانُ الصفا

عربی زبان کی مشہور کتاب ہے جس میں حکایات و مقالات کے پیرائے میں [illegible] بڑے علمی مسائل اور معارف ادا کیے گئے ہیں۔ اسے فورٹ ولیم کالج میں مولوی اکرام علی صاحب مرحوم نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ متعدد بار شایع ہوئی [illegible] بعد کے نسخے بہت غلط چھپے ہیں اور ان میں بہت کچھ تحریف ہوگئی تھی۔ [illegible] قدیم اور جدید سب نسخے بڑی کوشش سے جمع کیے اور نہایت کاوش سے صحیح نسخہ مرتب کرکے شایع کیا ہے۔ اس کتاب کی زبان سوا سو سال پہلے کی [illegible] اسے بجنسہٖ قائم رکھا گیا ہے۔ یہ بہت دلچسپ کتاب ہے اور اس کی سب سے [illegible] خوبی یہ ہے کہ اسے عالم اور عامی دونوں پڑھ سکتے ہیں۔

قیمت مجلد بارہ آنے، غیر مجلد آٹھ آنے۔

حکایات رومیؒ (حصۂ اول)

مولانا رومیؒ کی مثنوی شریف میں حکایات، محاضرات و مطائبات کے پیرائے میں اخلاق و نفسیات کے باریک مسائل کو نہایت عمدگی سے سمجھایا گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے ان حکایات کا یہ انتخاب بڑے اہتمام سے اردو میں ترجمہ کرایا ہے۔ زبان نہایت سلیس اور شگفتہ رکھی گئی ہے تاکہ بچے اور معمولی خواندہ لوگ بھی ان حکایتوں کو شوق سے پڑھیں اور حضرت مولاناؒ کے روحانی فیوض سے مستفیض ہوں۔ یہ کتاب دو قسم کے کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ قیمت مجلد (معمولی کاغذ) [illegible] آنے، (عمدہ کاغذ) ایک روپیہ۔ غیر مجلد (معمولی کاغذ) [illegible]

انجمن ترقی اردو (ہند)، دریا گنج [illegible]

انجمن کی چند نئی مطبوعات

ندرون ہند — نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کی جدید تصنیف Inside India کا ترجمہ جو مولوی سید ہاشمی صاحب نے بہت فصیح اور سلیس زبان میں کیا ہے۔ انھوں نے مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر دیے اور انھیں اس ملک کے یکھنے اور یہاں کے نامور اصحاب سے ملنے کا موقع ملا۔ ان کے مشاہدات اور خیالات پڑھنے کے قابل ہیں۔ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ حجم ۴۳۶ صفحات، قیمت مجلد سوا تین روپے، غیر مجلد تین روپے۔

شکنتلا — یہ کالی داس کی مہا تصنیف ہے۔ اس کا ترجمہ دنیا کی تمام شایستہ زبانوں میں ہوچکا ہے۔ اردو میں بھی اس کا وجود ہے لیکن مسخ صورت میں۔ ب پہلی بار راست سنسکرت سے سید اخترحسین صاحب رائےپوری نے اردو میں رجمہ کیا ہے اور اس امر کا التزام کیا گیا ہے کہ کالی داس کی خوبیوں کو قایم کھا جائے۔ حجم ۱۴۶ صفحات، قیمت مجلد ۱ روپیہ ۴ آنے، غیر مجلد ۱ روپیہ۔

اریخ دستور حکومت ہند — مؤلفہ ڈاکٹر یوسف حسین صاحب، جامعہ عثمانیہ۔ اس میں ابتدائے تسلط برطانیہ سے اب تک کے دستور ، آئین حکومت پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر ایسی جامع کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ حجم ۲۵۴ صفحے، قیمت مجلد ۲ روپے ۴ آنے، یر مجلد ۲ روپے۔

انتخاب وحید — وحید، اکبر الہ آبادی کے استاد اور اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا کلام اب تک طبع نہیں ہوا تھا اور ان کے خاندان میں محفوظ ھا۔ یہ بہت پُر گو شاعر تھے اور ان کا کلام دو ضخیم جلدوں میں ہے۔ انجمن نے ڑی کوشش سے اسے دستیاب کیا اور اب اس کا انتخاب شایع کیا ہے۔ امید ہے کہ وحید کے کلام کے مشتاق اس کی ضرور قدر کریں گے۔ قیمت مجلد ۱ روپیہ ۴ آنے، غیر مجلد ۱ روپیہ۔

مثنوی قطب مشتری — یہ مثنوی وجہی مصنف سب رس کی تصنیف ہے۔ مرتبۂ مولانا عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو (ہند)۔ اس کے صرف و ہی نسخے موجود ہیں۔ معتمد انجمن کا نسخہ جو قدیم ہے، ناقص تھا۔ دوسرا سخہ برٹش میوزیم سے حاصل کیا گیا اور دونوں کے مقابلے سے مرتب کی گئی۔ یہ سنہ ۱۰۱۸ ہجری کی تصنیف ہے اور قدیم دکنی اردو کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ آخر یں ضمیمہ اور فرہنگ الفاظ بھی ہے۔ حجم ۱۸۶ صفحے، قیمت مجلد ۱ روپیہ ۱۲ آنے، یر مجلد ۱ روپیہ ۸ آنے۔

انجمن کی چند نئی مطبوعات

ہماری نفسیات — E. A. Mander کی کتاب Psychology of Every Man and Woman کا ترجمہ ہے ۔ اس میں نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر خوب دلچسپ بحث کی گئی ہے ۔ قیمت مجلد ۱ روپیہ ۴ آنے' غیر مجلد ۱ روپیہ ۔

اصطلاحات کیمیا — کیمسٹری کی اصطلاحات انگریزی اردو ۔

ان اصطلاحات میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ انگریزی الفاظ کا ترجمہ جہاں تک ممکن ہو' سہل الفاظ میں کیا جائے ۔ اگرچہ اصطلاحات کے بنانے میں کئی قسم کی مجبوریاں ہیں تاہم یہ التزام کیا گیا ہے کہ زیادہ ثقیل اور غریب الفاظ نہ آنے پائیں ۔ قیمت ۱ روپیہ ۔

معلومات سائنس — اردو میں سائنس کی معیاری کتابیں بہت کم ہیں اور دلچسپ اور عام فہم زبان میں لکھی ہوئی کتابیں تو گویا ہیں ہی نہیں ۔ انجمن نے اس کمی کو پورا کرنے کا ارادہ کیا ہے ۔ معلومات سائنس اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے ۔ اس کتاب میں سائنس کے نہایت اہم مسائل؛ مثلاً حیاتین' جراثیم' متعدی امراض' برقی ایجادات' ریڈیم' لاشعاعیں' گراموفون' لاسلکی' دوربین' فلم سازی' نظریۂ اضافیت وغیرہ کو نہایت سلیس اور سلجھی ہوئی زبان میں پیش کیا گیا ہے اور اکابرین سائنس؛ مثلاً گلیلیو' کوپرنیکس' نیوٹن' فیراڈے' ایڈیسن' پاسچر' جے۔سی۔بوس' میڈم کوری' مارکونی اور آئن شٹائن کی کہانی بڑے دلچسپ اور شگفتہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تصویریں حیدرآباد دکن کے مشہور مصور عبدالقیوم صاحب نے لیتھو میں ایک خاص طریقے سے تیار کی ہیں ۔ یہ تصویریں حسن کاری کا عمدہ نمونہ ہیں جن کی مثال دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ یہ اردو زبان میں اپنے انداز کی پہلی کتاب ہے ۔ حجم دو سو صفحوں سے زاید۔ قیمت مجلد مع دیدہ زیب سہ رنگہ جیکٹ ۱ روپیہ ۱۲ آنے' غیر مجلد ۱ روپیہ ۸ آنے ۔

انجمن ترقی اردو (ہند)' دریاگنج' دہلی ۔

سائنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

(جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے)

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو داںوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہورہی ہیں یا جو جدید انکشاف وقتاً فوقتاً ہوں گے، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی‌الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔

رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں۔

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک چھے روپے ہے۔ نمونے کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ طلبا کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب یا ہیڈ ماسٹر صاحب انھیں چار روپے آٹھ آنے سالانہ چندے میں دیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

Vol. 19. OCTOBER, 1939. No. 76.

The Urdu

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by

ABDUL HAQ

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India),

Delhi.